مجموعۂ مقالات

ڈاکٹر فقیر محمّد ہونزائی

مجموعۂ مقالات

از قلم

ڈاکٹر فقیر مُحمّد ہونزائی

فہرست مجموعۂ مقالاتِ
ڈاکٹر فقیر محمّد ہونزائی

نمبر شمار	مضامین	تاریخ	صفحہ
۱	دنیا کی عمر	۱۹، جون ۲۰۰۳	۱
۲	کتاب قائم شناسی پر ایک تعارف	۳، اکتوبر ۲۰۰۳	۲
۳	امیر المومنین علی ابن ابی طالب کے علم و کشف	۲۶، جنوری ۲۰۰۶	۱۶
۴	جنّت کے گھوڑوں کے بارے میں	۱۸، اپریل ۲۰۰۶	۱۸
۵	خدا در صورتِ رحمان و غلمان کنزِ مخفی ہے	۵، دسمبر ۲۰۰۶	۲۰
٦	رفعِ شریعت	۱٦، مارچ ۲۰۰۷	۲۴
۷	حضرتِ خدیجۃ الکبریٰ علیہا السّلام	٦، دسمبر ۲۰۰۷	۳۵
۸	ترجمۂ اقتباس از کتابِ سرائر (صص ۱۱۵- ۱۱٦)	۸، دسمبر ۲۰۰۷	۳۱
۹	ترجمۂ اقتباس از کتابِ سرائر (ص ۲۰۰)	۱۲، دسمبر ۲۰۰۷	۳۲
۱۰	ترجمۂ اقتباس از کتابِ سرائر (صص ۱۱٦ - ۱۱۷)	۱۷، دسمبر۲۰۰۷	۳۴
۱۱	ترجمۂ اقتباس از کتابِ سرائر (صص ۱۰۰ - ۱۰۳)	۱۴، جنوری ۲۰۰۸	۳۸
۱۲	بزرگانِ دین کی دستیاب کتب کی فہرست	۱۴، جنوری ۲۰۰۸	۵۳
۱۳	دربارۂ دہر (فارسی)	۴، فروری ۲۰۰۸	٦۰
۱۴	دہر کے بارے میں	۸، فروری ۲۰۰۸	٦۲
۱۵	پنساری اور طوطے کی تیل گرانی کی کہانی	۳، دسمبر ۲۰۰۸	٦۴
۱٦	جنّ کی شناخت	۳، نومبر ۲۰۰۹	٦۷

نمبر شمار	مضامین	تاریخ	صفحہ
۱۷	شہادت کے فضائل اور اس کا دائرہ	۲، اگست ۲۰۱۰	۷۴
۱۸	قیامت اور حضرتِ عیسیٰ کا نزول	۷، اگست ۲۰۱۰	۷۹
۱۹	اسماعیلی مذہب کی اشاعت میں میرانِ ہونزا	۲۸ ستمبر ۲۰۱۰	۹۲
۲۰	بلْعَم بن باعور	۶، اپریل ۲۰۱۱	۱۰۱
۲۱	اَلْاَسْمَآ الْحُسْنٰی	۶، جون ۲۰۱۱	۱۰۵
۲۲	چند بزرگانِ دین کی مشہور کتابیں	۲۶، جون ۲۰۱۱	۱۱۱
۲۳	سورۃ الکوثر	۲۸، جولائی ۲۰۱۱	۱۱۳
۲۴	آیات النّور و نفسِ واحدہ	۲۵، اگست ۲۰۱۱	۱۱۶
۲۶	سورۂ احقاف میں جِنّات کے وفد کی تفسیر	۱۷، اکتوبر ۲۰۱۱	۱۲۰
۲۷	اکثریت و اقلیت سے متعلق قرآنی آیات	۱۹، اکتوبر ۲۰۱۱	۱۲۶
۲۸	سورۂ کوثر کا شانِ نزول	۲۲، اکتوبر ۲۰۱۱	۱۲۸
۲۹	مولانا عبد المطّلب کا عظیم معجزہ	۷، نومبر ۲۰۱۱	۱۳۰
۳۰	اسمائے مبارک خاتم النَّبِیّیْن	۱۸، جنور ۲۰۱۲	۱۳۶
۳۱	خطبہ از نہج البلاغہ - طاؤس	۲، مارچ ۲۰۱۲	۱۴۲
۳۲	طاؤس	۲، مارچ ۲۰۱۲	۱۴۳
۳۳	شرح الاخبار	۲۰، جولائی ۲۰۱۲	۱۴۸
۳۴	قصّۂ موسیٰ میں ستّر رجال کے زلزلے کی گرفت....	۳، اکتوبر ۲۰۱۲	۱۵۰
۳۵	مولوئ معنوی حضرت جلال الدّین رومی	۱۸، اکتوبر ۲۰۱۲	۱۵۱
۳۶	موسیقی اور رقص – حضرت داؤد علیہ السلام	۲۸، نومبر ۲۰۱۲	۱۵۳
۳۷	حدودِ دین اور دورِ قیامت	۲۱، فروری ۲۰۱۳	۱۵۷

نمبر شمار	مضامین	تاریخ	صفحہ
۳۸	انسان کی انائے سفلی کا عروج و نزول	۵، مئی ۲۰۱۳	۱۶۳
۳۹	انائے سفلی کا صُعُودی اور نُزُولی سفر	۱۳ جون ۲۰۱۳	۱۶۸
۴۰	دعوتِ قیامت میں گریہ و زاری کی اساسی اہمیت	۳، جون ۲۰۱۳	۲۰۰
۴۱	سورۂ منافقون کا مرکزی موضوع	یکم جولائی ۲۰۱۳	۲۰۲
۴۲	حضرت سیّدۂ نسآء العالمین کی نورانی وراثت	۲۳، جولائی ۲۰۱۳	۲۰۷
۴۳	قرآنی کُلّیات کی روشنی میں انسانی وحدت کا تصوّر	------	۲۱۳
۴۴	نورانی تاویل یا کشفی تاویل	۵ اگست ۲۰۲۱	۲۱۸

دنیا کی عمر

حضرتِ اُم النّداء بنتِ کِسری (شہربانو) نے **حضرتِ امام علی زین العابدین صلواۃ اللہ علیہ** سے درخواست کی کہ آپ ان کو (یعنی شہربانو کو) دنیا کی عمر کے بارے میں بتا دے کہ کتنی گزری ہے اور کتنی باقی ہے، حضرتِ امامؑ نے فرمایا کہ جہاں تک عمرِ گزشتہ کا تعلق ہے ہم آپ کو بتاتے ہیں اور جہاں تک عمرِ آئندہ کا تعلق ہے یہ بتانا ممکن نہیں، جہاں تک عمرِ گزشتہ کا تعلق ہے اس میں چار سو ہزار (یعنی چار لاکھ) کُور گزرے ہیں اور ہر کُور میں چار سو ہزار (مطلب چار لاکھ) دور گزرے ہیں، پس یہ ایک ایسی چیز ہے اس کا شمار سوائے خدا کے کوئی نہیں کر سکتا ہے۔

نوٹ: ایک دَور تقریباً ایک ہزار سال کے برابر ہوتا ہے، اس لحاظ سے دنیا کی عمرِ گزشتہ سولہ پدم ہے (16×10^{13})۔

فقیرِ حقیر

مرکزِ علم و حکمت، لندن

۱۹، جون ۲۰۰۳ء

کتابِ قائم شناسی پر ایک تعارف

ڈاکٹر فقیر محمد ہونزائی

کتابِ قائم شناسی پر ایک تعارف

''قرآنِ حکیم اور عالمِ انسانیت'' جیسی انقلابی اور تاریخ ساز کتاب کی تصنیف کے بعد ''قائم شناسی'' حضرتِ علاّمہ بزرگوار نصیرالدّین نصیؔر ہونزائی صاحب، دامت فیوضاتہ العرفانیۃ، کی اپنی نوعیّت کی ایک اور منفرد کتاب ہے۔ اسلئے کہ اس میں قائم شناسی کے بارے میں وہ اسرار برملا بیان کئے گئے ہیں جن کو اس سے پہلے بزرگانِ دین نے وقت کا تقاضا نہ ہونے کی وجہ سے یا تو بیان ہی نہیں کیا ہے یا صرف اشاروں کنایوں میں بیان کیا ہے۔

جاننا چاہئے کہ حضرتِ قائم علینا سلامہ کا عقیدہ الگ الگ اصطلاحوں کی صورت میں تمام ادیانِ عالم میں پایا جاتا ہے، اسلئے کہ تمام انبیاء ومرسلین کی دعوت حضرتِ قائم اور ان کے دور کی طرف رہی ہے۔ مذاہبِ اسلام میں یہ اصطلاح بالعموم ''مہدیٔ موعود''[1] اور شیعہ مذہب میں بالخصوص ''قائمِ آلِ محمدؐ'' کے نام سے مشہور ہے، حضرتِ قائم علینا سلامہ سے ایک ایسی ہستی مراد ہیں کہ جن کے زمانے میں انبیاء علیہم السّلام کی شریعتوں میں پوشیدہ حقائق کا ظہور ہوگا، دنیا سے ظلم وستم کا نشان مٹ جائے گا، عدل وانصاف کا دور دورہ ہوگا اور ہر ایک کو اپنے اعمال کے مطابق جزا ملے گا، اور کسی پر کوئی ظلم نہیں ہوگا، جیسا کہ حضور صلعم نے فرمایا ہے: ''لَوْ لَمْ یَبْقَ مِنَ الدُّنیا اِلاّ یَوْمٌ' واحدٌ لَطَوَّل اللّٰهُ ذٰلکَ الْیَوْمَ حَتّٰی یَخْرُجَ مِنْ وُلْدِی مَنْ یَمْلَأُ هَا عَدْلاً کَمَا مُلِئَتْ جَوْراً = اگر دنیا (کی عمر) سے صرف ایک ہی دن رہ جائے تو خدا اس دن کو طول دے گا یہاں تک کہ میری اولاد سے وہ شخص نکلے گا جو اس کو عدل و انصاف سے بھر دے گا جس طرح یہ جور وستم سے بھرا ہوا ہے''۔[2]

حضرتِ قائم اور قیامت کے بارے میں قرآنِ حکیم اور احادیثِ شریفہ میں بہت سے تمثیلی ارشادات آئے ہیں اور تمثیلی بیان ہونے کی وجہ سے ہر مذہب والوں نے اپنے

اپنے اعتقاد کے مطابق بہت کچھ لکھا ہے، جس کی تفصیلات کی یہاں گنجائش نہیں۔ یہاں پر صرف اسماعیلی بزرگانِ دین (حجتوں اور داعیوں) نے حضرتِ قائم اور قیامت کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اس کا ایک مختصر جائزہ لینے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اسماعیلی بزرگانِ دین قائم اور قیامت کی اصطلاحات کی حد تک دوسرے مذاہب کے علماء کے ساتھ متفق ہیں، لیکن ان کی معنوی اور تاویلی تشریح میں ان کی ایک مخصوص روش ہے۔ قائم سے مراد ان کے نزدیک ایک ایسی ہستی ہے جو اچانک کہیں سے پیدا نہیں ہوگی، بلکہ آلِ پیغمبرؐ یعنی مولانا علیؑ اور حضرتِ فاطمہؑ کی اولاد میں سے ائمۂ طاہرینؑ کا جو سلسلہ دنیا میں جاری ہے اسی سلسلے کا ایک امام قائم کی حیثیت میں کام کریں گے۔ جیسا کہ سیّدنا پیر ناصرِ خسروؒ نے اپنی کتاب وجہِ دین میں ماہِ رمضان اور شبِ قدر (لیلۃ القدر) کی جو تاویل کی ہے اس سے یہ حقیقت ظاہر ہے۔[۳]

اسی طرح قیامت کا تصور بھی دوسرے ادیان و مذاہب کے برعکس ائمۂ طاہرینؑ کی تاویلی تعلیم کی روشنی میں کسی اچانک واقعہ کا نام نہیں بلکہ یہ ایک دائمی واقعہ ہے۔ اسلئے کہ قیامت پاداشِ عمل کیلئے ہے اور پاداشِ عمل کا تعلّق تخلیق سے ہے اور تخلیق جیسا کہ حضرتِ مولانا سلطان محمد شاہ صلوات اللہ علیہ فرماتے ہیں: ''اسلام کیمطابق تخلیق ایک وقتِ معیّن میں ایک منفرد عمل سے عبارت نہیں بلکہ وہ ایک دائمی اور مسلسل واقعہ ہے۔[۴]'' اسلئے قیامت بھی ایک دائمی اور مسلسل واقعہ ہے، چونکہ اس دائمی اور مسلسل عمل سے چھوٹے بڑے ہنگامی اور دوری واقعات پیدا ہوتے رہتے ہیں، اس اعتبار سے ان کو چھوٹی بڑی قیامتوں کا نام دیا جاتا ہے اور ان کا سلسلہ جاری ہے، جیسا کہ سیّدنا ناصرِ خسروؒ فرماتے ہیں:

ے منزه مالک الملکی که بی پایان حشر دارد[۵] یعنی وہ ہر صفت سے پاک و مبرّا بادشاہ اپنی بادشاہت میں بے پایاں قیامتوں کا مالک ہے۔ چونکہ قیامت دائمی بھی ہے اور ہنگامی و دوری بھی، اس لحاظ سے تاویلی تعلیمات میں قائم اور قیامت کو بھی ان ہی معنوں

میں استعمال کیا گیا ہے۔

دوری لحاظ سے بھی قیامت کی کئی قسمیں ہیں، مثلاً دورِ صغیر یا کہین کی قیامت جو بالعموم چھ اماموں کے زمانے گزر جانے کے بعد ساتویں امام یا ناطق کے ظہور کے وقت واقع ہوتی ہے؛ دورِ کبیر یا مہین کی قیامت جو چھ ناطقوں کے ادوار کے گزر جانے کے بعد صاحبِ دورِ ہفتم حضرتِ قائم کے زمانے میں واقع ہوتی ہے[6]۔ اسی طرح چھ ادوارِ کبیر کے گزر جانے کے بعد ساتویں صاحبِ دورِ کبیر کے زمانے کی قیامت وغیرہ۔ دوری قیامت کی ایک مثال آفتابِ عالم تاب کے گرد زمین کی گردش ہے، جس طرح آفتابِ عالمتاب کے گرداگرد زمین کی گردش سے دن رات میں بتدریج تبدیلی آتی رہتی ہے، اور یہ تبدیلی نصف کرۂ شمالی میں ۲۱ رجون اور نصف کرۂ جنوبی میں ۲۲ ردسمبر کو حدِّ انتہا کو پہنچ جاتی ہے جن کو بالترتیب صیفی نقطۂ انقلاب اور شتوی نقطۂ انقلاب کہا جاتا ہے اور یہ دن اپنے اپنے نصف کُرے میں روشنی و گرمی مہیّا کرنے کے لحاظ سے سب سے زیادہ فیض بار اور طویل ترین دن ہوتے ہیں، اسی طرح ادوار کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔

اسماعیلی بزرگانِ دین کی تاویلی تعلیمات کا جائزہ لینے سے پہلے یہ بات یاد رکھنا ضروری ہے کہ ان کے یہاں دین کی تکمیل محض تنزیل سے نہیں ہوتی بلکہ تنزیل و تاویل (۳:۷) دونوں کے ذریعے ہوتی ہے۔ تنزیل کا کام خود آنحضرتؐ نے انجام دیا اور تاویل کا کام اپنے اساس مولانا علی علیہ السّلام کے حوالے کیا جو ان کی اولاد کے اُئمۂ طاہرینؑ میں ہمیشہ کیلئے جاری ہے (۷:۵۲-۵۳؛ ۱۷:۱۰۶)، چنانچہ اسماعیلی بزرگانِ دین نے اپنے اپنے زمانوں کے اماموں کی تاویلی تعلیم کی روشنی میں دین کے دوسرے پہلوؤں کے ساتھ ساتھ حضرتِ قائم اور قیامت کی حقیقت کو اپنے اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق سمجھانے کیلئے الگ الگ زبانوں میں کئی ایک کتابیں لکھی ہیں۔

ذیل میں ان بزرگوں اور ان کی کتابوں میں سے چند ایک کا ذکر کیا جاتا ہے:

سیّدنا رازی: الاصلاح، الزینة، اعلام النبوة؛

سیّدنا سجستانی: الافتخار، اثبات النّبؤات، المقالید، الینابیع، الباھرة؛

سیّدنا قاضی نعمان: شرح الاخبار، اساس التّاویل، تاویل الدّعائم، افتتاح الدّعوة؛

سیّدنا جعفر بن منصور الیمن: سرائر و اسرار النّطقاء، تاویل الزّکوٰة، کتاب الکشف؛

سیّدنا کرمانی: راحة العقل، کتاب الرّیاض؛

سیّدنا شیرازی: المجالس المؤیّدیه؛

سیّدنا ناصرِ خسرو: روشنائی نامه (نثر)، وجهِ دین، خوان الاخوان، گشایش ورهایش، جامع الحکمتین، زاد المسافرین، دیوانِ اشعار؛

خواجہ نصیر الدّین (منسوب): روضۂ تسلیم؛

سیّدنا رئیس حسن: دیوانِ قائمیات؛

سیّدنا ابواسحاق: هفت باب؛

سیّد سہراب ولی: تحفة النّاظرین

اسی طرح برصغیر پاک و ہند میں سیّدنا پیر صدر الدّین، سیّدنا پیر حسن کبیر الدّین، سیّدنا پیر شمس اور دوسرے پیروں نے گنانوں میں حضرتِ قائم اور قیامت کے بارے میں لکھا ہے۔

ان بزرگانِ دین کی تعلیمات کا خلاصہ یہ ہے کہ قائم اور قیامت کے بارے میں جو کچھ قرآنِ حکیم اور احادیثِ شریفہ میں آیا ہے وہ حق ہے، لیکن جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے،

ان کی حقیقت تنزیل میں نہیں بلکہ تاویل میں ہے، مثلاً سیّدنا المؤیّد فی الدّین شیرازی لیلۃ القدر جو حجّتِ قائم کی ایک مثال ہے، کے بارے میں وارد ایک حدیث کہ ''اس رات شیاطین کو ہتھکڑیاں پہنا کر قید کیا جاتا ہے اور ہر شریر کے شر کو روکا جاتا ہے'' ۔ فرماتے ہیں کہ ''اگر اس حدیث کو ظاہری طور پر جس طرح لوگ سمجھتے ہیں لیا جائے تو اس کی کوئی حقیقت نہیں بنتی، اسلئے کہ کفار جو شیاطین کی پیروی کرنے والے ہیں، اس رات اپنے کفر سے باز نہیں آتے اور نہ وہ اپنے شر سے رکتے ہیں . . . ۔'' اسلئے اس حدیث کی حقیقت معنی کے لحاظ سے ہے نہ کہ لفظ کے لحاظ سے (یعنی اس کی حقیقت تاویل میں ہے نہ کہ تنزیل میں) اور اس کی تاویل یہ ہے کہ جو لوگ اس حدِّ شریف (یعنی حجّتِ قائم) سے وابستہ ہوگئے وہ شیاطین کے وسوسوں سے جو روحوں میں ڈالتے اور نقصان پہنچاتے ہیں، سے حفاظت اور پناہ میں ہیں''۔ اسلئے قیامت سے متعلق جو کچھ قرآن و حدیث میں آیا ہے، مثلاً آسمانوں اور زمین کا بدل جانا، زمین کا اپنے پروردگار کے نور سے روشن ہوجانا، دابۃ الارض کا کلام، یاجوج و ماجوج کا خروج وغیرہ جو قیامت سے متعلق ہیں، ان کی حقیقت تاویل میں ہے نہ کہ تنزیل میں، اسلئے کہ تنزیل مثل ہے اور تاویل ممثول۔

چونکہ قرآنِ کریم میں قیامت کا بنیادی تعلق وقت اور زمانے کے ساتھ ہے اسلئے جہاں جہاں قرآنِ حکیم میں خدا کے چھ دن میں آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے اور ساتویں دن عرش پر متمکن ہونے کا ذکر آیا ہے (مثلاً ۷:۵۴؛ ۱۰:۳) وہاں ہنگامی یا دوری قیامتوں کا ذکر آیا ہے اور ان دنوں کی حقیقت تاویل میں ڈھونڈنے کی ضرورت ہے نہ کہ تنزیل میں، کیونکہ اگر ان کو تنزیلی معنوں میں لیا جائے تو اس سے ایک طرف تو ان آیات کے ساتھ تضاد پیدا ہوگا جن میں خدا کے ہر چیز کو صرف ''کُنْ'' کہہ کر پیدا کرنے کا ذکر آیا ہے (۲:۱۱۷؛ ۳:۵۹؛ ۱۶:۴۰؛ ۳۶:۸۲) اور دوسری طرف یہ مسئلہ پیدا ہوگا کہ جب کائنات نہ تھی، زمین، آسمان، چاند اور سورج نہ تھے تو خدا کس پیمانے سے دنوں کو ناپتا تھا، اسلئے

از روئے تاویل یہاں دنوں سے مراد ادوار ہیں جن میں سے ہر ایک دور ایک ہزار سال کا ہوتا ہے، اور اس کی تائید قرآن کی اس آیت سے ہوتی ہے جس میں خدا فرماتا ہے کہ اس کا ایک دن دنیا والوں کی گنتی کے حساب سے ایک ہزار سال کے برابر ہوتا ہے (۲۲:۴۷)۔ اور آسمانوں اور زمین سے بھی مراد عالمِ ظاہر نہیں بلکہ عالمِ دین ہے، اسلئے یہاں پر عالمِ دین کی تخلیق کا ذکر ہے نہ کہ عالمِ ظاہر کا، جس کی تخلیق چھ دن یعنی چھ صاحبانِ ادوار کی شریعتوں کے ذریعے ہوتی ہے، یعنی آدم، نوح، ابراہیم، موسیٰ، عیسیٰ علیہم السّلام اور خاتم النّبیّین محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم اور ان میں سے ہر ایک اپنی شریعت اور کتاب کے ذریعے عالمِ دین میں کام کراتا ہے اور ساتویں دن سے مراد حضرتِ قائم القیامت ہے جو صاحبِ شریعت نہیں بلکہ صاحبِ شمار ہے اسلئے صاحبانِ شریعت کے ادوار میں جو کام ہو چکا ہے اس کا حساب لیں گے اور کام کرنے والوں کو اپنے اپنے کاموں کا جزا دیں گے۔[۸]

یہ بات یاد رکھنا ضروری ہے کہ چونکہ قیامت ایک روحانی عمل ہے اسلئے اس کا ادراک حواسِ ظاہر سے نہیں ہوتا، اسلئے قرآنِ کریم میں قیامت کے سلسلے میں عوام کے حوالے سے کئی مرتبہ "لایشعرون" (۱۲:۱۰۷؛ ۴۳:۶۶) استعمال ہوا ہے یعنی عوام کو قیامت کا علم نہیں ہوتا صرف صاحبانِ تاویل اور اہلِ معرفت کو اس کا علم ہوتا ہے۔ چنانچہ صاحبانِ تاویل نے حضرتِ قائم کے بارے میں قرآنی تاویل کی روشنی میں بہت کچھ پیشین گوئیاں کی ہیں اور فرمایا ہے کہ دوسرے اماموں اور قائم کے درمیان ایک بڑا فرق یہ ہوگا کہ ہر امام کا حجّت ان کے بعد آتا ہے لیکن قائم کا حجّت ان سے پہلے آئیگا اور قائم کے نور کا نزول ان کے حجّت میں ہوگا جس کے فیوض و برکات کی وجہ سے ان کا مرتبہ لیلۃ القدر کی طرح ہوگا جو ہزار مہینوں سے بہتر ہے یعنی حجّتِ قائم علم میں ہزار اماموں سے بہتر ہے۔ سیّدنا شیرازی لکھتے ہیں کہ حجتِ قائم صاحبِ بیانِ کُلّی و کشفِ حقیقی ہوں گے[۹]، اور حضرتِ قائم خود کمالِ انبیاء اور ان کے نفوس و عقول کا قبلہ ہوں گے۔[۱۰]

الغرض گزشتہ بزرگانِ دین کی کتابیں حضرتِ قائم اور دورِ قیامت کے بارے میں ایسے حقائق سے پُر ہیں، لیکن ہنوز ان کا زمانہ مخصوص قیامت یا قیامت القیامات سے دُور تھا، اسلئے بیشتر حقائق کا بیان ہر بزرگ نے اپنے وقت کے تقاضوں کے مطابق اشاروں کنایوں میں کیا ہے ۔ جیسے سیّدنا المؤیّد آیات (۱۲: ۴۷-۴۹) کی تاویل میں فرماتے ہیں کہ علم کی فراوانی کا وقت حضرت قائم قیامت کے زمانے میں ہوگا جو صاحبِ بیانِ کُلّی اور کشفِ جلی ہونگے ۔ [11]

ہمارا زمانہ قرآن وحدیث میں مذکور نشانیوں کی روشنی میں دورِ قیامت کا آغاز ہے اور الحمدللہ ہمارے زمانے کے عارفِ کامل حضرت علاّمہ نصیرالدّین نصؔیر ہونزائی ، دامت فیوضاتہ العرفانیّہ ، نے حضرتِ قائم علینا سلامہ اور قیامت کی شناخت کے بارے میں جو حقائق بیان کئے ہیں وہ یقیناً اس دور کے فیوض و برکات کا نتیجہ ہیں کیونکہ اس سے پہلے زمانوں میں ان آیاتِ خداوندی کا ظہور نہیں ہوا تھا جن کو دورِ قیامت میں خدا نے آفاق و انفس میں دکھانے کا وعدہ کیا تھا (۴۱: ۵۳) ۔ علاّمہ بزرگوار اپنی ایک کتاب ''میزان الحقائق'' کے دیباچے میں لکھتے ہیں: ''میں نے اس کتاب میں اکثر ایسے مسائل پر بحث کی ہے جن سے ہمارا زمانہ دوچار ہوا ہے یا ہونے والا ہے، اسلئے کہ پیش آمدہ مسائل کا حل کرنا نہ صرف علومِ دین کی حقانیت اور قدر و منزلت کا ثبوت ہے بلکہ اس میں بنی نوع انسان کی خیرخواہی بھی مضمر ہے ۔ ان میں سے بیشتر ایسے مسائل ہیں جن کو بزرگانِ دین نے صریحاً حل نہیں کیا ہے اسلئے کہ ان چیزوں کیلئے ان کے زمانے کا کوئی تقاضا نہ تھا اسلئے انہوں نے اپنی کتابوں میں ایسے حقائق کو رموز و امثال میں پوشیدہ رکھا ہے تاکہ وقت آنے پر انہیں آشکارا کرلیا جائے ۔'' [12]

علاّمہ بزرگوار اپنے روحانی تجربے کی روشنی میں فرماتے ہیں کہ وہ قیامت جس میں خدا نے اپنی آیات کو آفاق و انفس میں دکھانے کا وعدہ کیا تھا اس کا آغاز ہو چکا ہے ۔

موصوف کے نزدیک آج مادی سائنس کے تمام انکشافات وایجادات خدا کی وہ آیات ہیں جو آفاق میں دکھا رہا ہے اور اس کے بعد وہ اپنی آیات انفس میں دکھانے والے ہیں۔ اسلئے موصوف نے اسی کتاب کے مضامین میں سے ایک کا نام رکھا ہے: ''ایٹمی دور روحانی دور سے ملا ہے''[۱۱۳] ہر چند کہ علاّمہ بزرگوار نے اپنی اکثر کتابوں میں حضرتِ قائم علینا سلامہ اور قیامت کے کسی نہ کسی پہلو کا ذکر کیا ہے، لیکن ''میزان الحقائق'' میں سب سے زیادہ قیامت کی تفصیل اور اس کی قسموں کا ذکر فرمایا ہے۔ فرماتے ہیں کہ قیامت خدا کی گھڑی ہے۔ اور گھڑی جس کیلئے قرآنی لفظ '' اَلسّاعة '' آیا ہے، وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اس کی بنیاد سیکنڈ یا لمح البصر پر ہے، لیکن سیکنڈوں کے مجموعوں کو جمع کیا جائے تو اسی سے منٹ، گھنٹہ، دن، رات، ہفتہ، عشرہ، ماہ، سال، صدی اور ادوار بنتے ہیں۔ بالفاظِ دیگر ساعت یا قیامت ایک دائمی عمل ہے اور اسی عمل سے گونا گون قیامتیں بنتی جاتی ہیں، مثلاً دائمی قیامت، ہنگامی قیامت، شخصی اختیاری قیامت، شخصی اضطراری قیامت، اجتماعی قیامت، عالمی قیامت۔ فرماتے ہیں کہ اس کے علاوہ اور بھی بہت بڑی قیامتیں ہیں، مثلاً کسی سیارے کا اپنے مدار سے ہٹ کر عالم کے حاشیہ کی طرف جانا، یا حاشیہ کی طرف سے کسی سیارے کا اندر کی طرف آنا، یا سورج میں گر کر ختم ہو جانا، یا سورج سے کسی سیارے کا پیدا ہو جانا، یا کُل عالم کا ہیولیٰ میں فنا ہو کر پھر سے پیدا ہونا وغیرہ۔[۱۱۴]

اسی طرح علاّمہ بزرگوار نے اپنی ایک دوسری کتاب ''کوزۂ کوثر'' میں قرآنِ حکیم کے حوالے سے عالمِ دین کی دوری قیامتوں کو نہایت حکیمانہ اور لطیف پیرائے میں ثابت کیا ہے، آیہ (۳:۵۵): ''وَجَاعِلُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ۔ اور جن لوگوں نے تیری پیروی کی ان کو قیامت تک کافروں پر غالب رکھوں گا۔'' کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اس ارشاد کی حکمت یہ ہے کہ حضرتِ عیسیٰؑ کے تابعین اللہ تعالیٰ کے مذکورہ وعدہ کے مطابق اپنے مخالفین پر دینی لحاظ سے (یعنی دلیل وحجّت کے اعتبار سے)

غالب وفاتح رہے تا آنکہ دورِ عیسیٰ کے چھ اماموں کا زمانہ گزر گیا، اور جب دورِ عیسیٰ کے ساتویں امام کا ظہور ہوا تو اس وقت نصرانیت کی قیامت برپا ہوئی، کیونکہ پیغمبرِ اسلامؐ ایک نئی کتاب اور تازہ شریعت لیکر دنیا میں تشریف فرما ہوئے۔ اب حضرتِ عیسیٰؑ کے دین کے متعلق اللہ تعالیٰ نے جو کچھ وعدہ فرمایا تھا وہ پورا ہو چکا۔ اگر ہم اس آیۂ مبارکہ کے ایسے معنی نہ لیں بلکہ یوں کہیں کہ دنیائے عیسائیت (نصرانیت) میں ابھی تک کوئی قیامت واقع نہیں ہوئی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اگر نصاریٰ ظہورِ اسلام کے بعد مسلمان نہ بنیں (یعنی حضرتِ محمدؐ کی دعوت کو قبول نہ کریں) تو ان پر کوئی جرم نہیں، اور جو غیر عیسائی اسلام کو قبول کریں تو وہ پھر بھی مسلمان نہیں ہوسکیں گے، کیونکہ بموجب وعدۂ الٰہی عیسائیوں کو قیامت تک اپنے مخالفین پر غالب وفاتح ہونے کا حق حاصل ہے۔ تو کیا کوئی دانشمند مسلمان اس بات کو قبول کرے گا؟ نہیں، ہرگز نہیں۔[15] [جبکہ اسی سورہ کی آیت (۳:۱۱۰) میں خدا مسلمانوں سے خطاب کرتے ہوئے فرماتا ہے: "كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاس = تم بہترین امّت ہو جسے لوگوں (کی ہدایت) کیلئے پیدا کی گئی ہو"]۔

جاننا چاہئے کہ مذکورہ دلیل سے نہ صرف یہی حقیقت واضح وروشن ہوئی کہ ہر ناطق پیغمبرؑ کی دنیائے شریعت میں ساتویں امام کے آنے پر قیامت برپا ہو جاتی ہے، بلکہ اس کے ساتھ ساتھ یہ اصول بھی معلوم ہوا کہ قیامت خواہ چھوٹی ہو یا بڑی، اختیاری ہو یا اضطراری، انفرادی ہو یا اجتماعی، جب بھی آ جائے تو وہ غیر شعوری طور پر آتی ہے، چیختی چلاّتی ہوئی نہیں آتی۔[16]

الغرض علاّمہ بزرگوار نے قیامت کے ہر پہلو پر روشنی ڈالی ہے اور ان حقائق واسرار کو جو بزرگانِ ماتقدم نے رموز واشارات میں بیان کیا تھا، برملا طور پر بیان کیا ہے خصوصاً حجّتِ قائم، حضرتِ قائم اور خلیفۂ قائم کے بارے میں۔ اپنی ایک اور کتاب "قرآنی مینار" میں اس دور کے بارے میں فرماتے ہیں: یہ ہفت ادوارِ کبیر میں سے آخری دور ہوگا جس

میں بڑے بڑے واقعات و معجزات رونما ہوں گے، بین الاقوامی اتحاد ویگانگت کا دور دورہ ہوگا، سیّارۂ زمین نمونۂ بہشت بن جائیگا، دنیا بھر میں نورِ اسلام کی روشنی پھیل جائیگی، روحانی سائنس عام ہوجائیگی، لوگ اڑن طشتریوں کی مدد سے پرواز کرکے دوسرے سیاروں کی سیاحت کریں گے اور مومنینِ بایقین سے اولیاء اللہ کی طرح ظہورِ کرامات ہونے لگے گا۔[۱۷]

مزید فرماتے ہیں: ''ان تمام پُرحکمت پیش گوئیوں کو حقیقی معنوں میں جاننے کی ضرورت ہے جو دورِ قیامت کی بڑی بڑی تبدیلیوں اور ترقّیوں سے متعلق ہیں۔''[۱۸]

الحمد للہ علاّمہ بزرگوار نے دورِ قیامت کے نقیبِ اعظم کی حیثیت میں دورِ قیامت کی ان پُرحکمت پیش گوئیوں کو حقیقی معنوں میں سمجھانے کیلئے اپنی حیاتِ طیّبہ کو قربان کردیا ہے۔ خود فرماتے ہیں:

میرے قائم نے مجھے لوگوں سے قربان کردیا
اس خلیلی کام سے دنیا کو حیران کردیا[۱۹]

موصوف کی نثر و نظم میں سو (۱۰۰) سے زیادہ کتابیں اس حقیقت کی شاہد ہیں، ان کتابوں کے غائرانہ مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں گزشتہ بزرگانِ دین کے علوم کا خلاصہ بھی ہے اور اس کے ساتھ اضافی علمِ قیامت بھی، مثلاً عالمِ شخصی کے حقائق، عالمِ شخصی میں پیشانی کا مقام، شعوری ولاشعوری قیامت، انائے علوی وانائے سفلی وغیرہ۔ قائم شناسی کے سلسلے میں علاّمہ بزرگوار کی کتابوں میں ''قرآنِ حکیم اور عالمِ انسانیت'' اور زیرِ نظر کتاب ''قائم شناسی'' خصوصی اہمیت کے حامل ہیں اور ان کی علوشان کا یہ مرتبہ ہے کہ اس میں علاّمہ بزرگوار نے حجّتِ قائم، حضرتِ قائم اور خلیفۂ قائم کے نہ صرف اسماء بلکہ ان کے مسمیات کی بھی شناخت کرائی ہے۔ اس سِرِّ مگو کے افشا کی سعادت کا سہرا حضرتِ قائم نے موصوف کے سر پر باندھا ہے جو حضرتِ آدمؑ کے زمانے سے بزرگانِ دین کے دلوں سے دلوں میں رازدارانہ صورت میں منتقل ہوتے آیا تھا۔ ایسی تعلیم دینا یقیناً کسی کیلئے اس وقت تک ممکن

نہیں ہوسکتا جب تک وہ حق الیقین اور فنا فی القائم کے مرتبے پر فائز نہ ہو۔ موصوف یقیناً حضرتِ قائم علینا سلامہ کی عظیم ترین گویا ودانا آیت (معجزہ) ہیں اسلئے قائم شناسی کے گہرہائ ضیا بخش اور دُرَرِ بیش بہا آپ کی زبانِ فیض بار اور قلمِ جواہر نگار سے وجود میں آتے رہتے ہیں، نہیں تو یہ کس طرح ممکن ہوسکتا تھا کہ ہونزا جیسے علم وحکمت سے دُور افتادہ علاقہ سے جہاں ۱۹۴۶ء یعنی حضرتِ مولانا سلطان محمد شاہ صلوات اللہ علیہ کی بابرکت ڈائمنڈ جوبلی (جس کی فیوضات و برکات سے ہونزہ کے ہر گاؤں میں سکول قائم ہوئے) سے قبل صرف ایک ہی پرائمری سکول تھا اور ۱۹۱۳ء سے قبل اس کا بھی وجود نہ تھا[20]، سے ایک ایسی ہستی پیدا ہو کہ جن کے نورِ حکمت ومعرفت سے اہلِ زمانہ کی آنکھیں خیرہ ہوجائیں۔ الحمدلِلّٰہ علیٰ مَنّہ واِحسانہ۔ اللّٰھمَّ متعنا بطول حیاتہ الطیّبۃ ونوّر عقولنا بانوارہ العرفانیّۃ۔

طالبِ دُعائے مقدسِ بزرگوار
ڈاکٹر فقیر محمد ہونزائی
مرکزِ علم وحکمت، لندن
۳؍اکتوبر ۲۰۰۴ء

یادداشتہا

۱۔ ابوداؤد، سنن (ریاض، ۱۹۹۹ء)، ص ۶۰۱، احادیث ۴۲۸۲-۴۲۹۰؛ محمد تیجانی سماوی، حکمِ اذان، ترجمۂ مستجاب احمد انصاری (تہران، تاریخ ندارد)، ص ص ۳۰۶-۳۱۶۔

۲۔ ابوحاتم احمد بن حمدان الرازی، کتاب الاصلاح (تہران، ۱۳۷۷ ہجری شمسی)، ص ۶۱؛ ناصرِ خسرو (پیر)، شش فصل تصحیح ایوانف (قاہرہ، ۱۹۴۸ء)، ص ۳۹۔

۳۔ ناصرِ خسرو (پیر)، وجہِ دین، تصحیح غلام رضا اعوانی (تہران، ۱۳۹۷ ہجری قمری)، ص ص ۲۶۰-۲۶۱، ۲۵۳-۲۵۴؛ حمید الدّین کرمانی، راحۃ العقل، تصحیح محمد کامل حسین اور محمد مصطفیٰ حلمی (قاہرہ، ۱۹۵۲م)، ص ۴۳۱۔

۴۔ سلطان محمد شاہ (امام)، میمائرس آف آغا خان (لندن، ۱۹۵۴ء)، ص ۱۷۵۔

۵۔ ناصرِ خسرو (پیر)، دیوانِ اشعار، تصحیح نصر اللہ تقوی (تہران، ۱۳۶۷ ہجری شمسی)، ص ۱۳۴۔

ابو یعقوب السجستانی، اثبات النبوّات، تصحیح عارف تامر (بیروت، ۱۹۸۲ء)، ص ص ۱۸۱، ۱۸۲، ۱۹۳۔

۷۔ المؤیّد فی الدّین الشیرازی، المجالس المؤیّدیہ، تصحیح مصطفیٰ غالب (بیروت، ۱۹۸۴ء)، iii، ص ۱۱؛ ترمذی، جامع (ریاض، ۱۹۹۹ء)، ص ۴۱۷، حدیث ۲۸۲۔

۸۔ وجہِ دین، ص ص ۶۲-۶۳؛ ــــ، جامع الحکمتین، تصحیح محمد معین اور ہنری کربین (تہران، پیرس، ۱۹۵۳ء)، ص ص ۱۶۳-۱۶۵۔

۹۔ المجالس المؤیّدیہ ii، ص ۶۱۲۔

۱۰۔ ایضاً، iii، ص ۸۔

۱۱۔ ایضاً، ii، ص ۵۹۰، ۵۸۹۔

۱۲۔ نصیرالدّین نصیرؔ (علّامہ)، میزان الحقائق (کراچی، ۱۹۶۲ء)، ص ص ۸-۹۔

۱۳۔ ایضاً، ص ص ۵۴-۵۵۔

۱۴۔ ایضاً، ص ص ۱۷-۳۲۔

۱۵۔ ـــــ، کوزۂ کوثر (کراچی، ۱۹۹۴ء) ص ۱۸۔

۱۶۔ ایضاً، ص ص ۱۸-۱۹۔

۱۷۔ ـــــ، قرآنی مینار (کراچی، ۱۹۹۰ء) ص ۲۲۰۔

۱۸۔ ایضاً، ص ۲۲۱۔

۱۹۔ ـــــ، دیوانِ نصیری (کراچی، ۲۰۰۴ء)، ص ۸۴۔

۲۰۔ ریاض احمد خان (راجہ)، وادیٔ ہنزہ (گلگت، ۲۰۰۳ء)، ص ۶۷

امیرالمومنین امام العالمین اسد اللہ الغالب علی ابن طالب کرم اللہ وجۂ کے علم و کشف اور اس کے متعلقات کے بیان میں

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحمٰنِ الرَّحِیۡم۔

تفسیر بحرالدرر اور ریاضت القدس میں عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ ایک دن امیرالمومنینؑ نے مجھ سے فرمایا اے عبداللہ! نماز عشا سے فارغ ہو کر میرے پاس آنا۔ جب میں گیا تو فرمایا اے عبداللہ تو الحمد کے الف لام کے معنی بھی جانتا ہے۔ میں نے عرض کی کہ امیرالمومنینؑ بہتر جانتے ہیں۔ پھر ایک پہر رات تک الفؔ اور لامؔ کے معنے میں اس قدر حقائق بیان فرمائے جن کا ایک شمہ بھی میرے دل میں نہ گزرا تھا۔ پھر حائے الحمد کی تفسیر کے متعلق معارف بیان کرنے میں رات کا دوسرا حصّہ پورا کر دیا۔ بعد ازاں اپنی زبان معجز بیان سے ارشاد فرمایا اے عبداللہ جو کچھ میں نے بیان کیا تو نے سُنا؟ میں نے عرض کیا یا امیرالمومنینؑ! ہاں میں نے سُنا اور حیران ہُوا۔ اس وقت فرمایا یَا عَبۡدَاللّٰہِ لَوۡکَتَبۡتُ فِیۡ مَعَانِی الۡفَاتِحَۃِ لَاَوۡقَرۡتُ سَبۡعِیۡنَ بَعِیۡراً یعنے اے عبداللہ! اگر مَیں سورۂ فاتحہ کے معنے لکھوں تو ستر اونٹ لاددوں۔

نیز ارشاد فرمایا جو کوئی سورۂ فاتحہ کو درست طور پر پڑھے وہ آتشِ دوزخ سے بے خوف ہو جاتا ہے اور جو کوئی اس کے معنی واجبی طور پر جانتا ہو۔ وَجَبَتۡ لَہُ الۡجَنَّۃُ وَاَکۡرَمَہُ اللّٰہُ بِـرُؤۡیَتِہٖ وَ قُرۡبَتِہٖ یعنی بہشت اس کے لئے واجب ہو جاتا ہے۔ اور حق تعالیٰ اس کو اپنے قرب اور دیدار سے معزز فرماتا ہے۔

ابنِ عباس کہتے ہیں کہ میں نے اپنا علم آنجناب کے علم کے مقابلہ میں ایسا پایا

جیسے سمندر کے مقابلے میں ایک قطرہ۔ اور ابن فخری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک روز امیر المومنین علیہ السلام نے فرمایا۔ لَوْشِئْتُ لَاوْ قَرْتُ بِبَآءِ بِسْمِ سَبْعِیْنَ بَعِیْراً۔ یعنی اگر میں چاہتا تو باو بسم اللہ کی تفسیر سے ستر اونٹ لاددیتا۔

نیز اسی بزرگوار سے روایت ہے کہ ایک روز امیرالمومنینؑ نے فرمایا اگر میں چاہتا تو تمام لوگوں کے حالات سے خبر دیتا لیکن مجھے اس امر کا خیال ہے کہ کہیں میری محبت میں اس شریعتِ رسول صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کے منکر نہ ہو جائیں (کوکبِ دورّی، باب پنجم، منقبت نمبر۱، صفحہ نمبر۳۲۲ تا ۳۲۳)۔

جنّت کے گھوڑوں کے بارے میں

١ .عَـن بُـرَيـدَة عَن اَبِيه: اَنَّ رَجُلاً سَأَلَ النَّبِیَّ ؐ فَقَالَ يَارَسُولَ اللهِ! هَلُ فِي الجَنَّةِ مِنُ خَيُـلٍ؟ قَـالَ: ''اِنِ اللهُ اَدُخَـلَکَ الْـجَـنَّةَ فَلا تَشَـاءُ اَنُ تُـحَمَلَ فِيهَا عَلَی فَرَسٍ مِنُ يَاقُوتَةٍ حَمُراءَ تَطِيُرُبِکَ فِی الُجَنَّةِ حَيُثُ شِئُتَ'' – قَالَ وَسَأَ لَهُ رَجُلٌ فَقَالَ: يَارَسُولَ اللهِ! هَلُ فِی الُجَنَّةِ مِن اِبِلٍ؟ قَالَ: فَلَمُ يَقُلُ لَهُ مِثُلَ مَا قَالَ لِصَاحِبِهِ فَقَالَ: ''اِنُ يُدُخِلُکَ اللهُ الجَنَّةَ، يَکُنُ لَکَ فِيهَا مَااشُتَهَتُ نَفُسُکَ و لَذَّ تُ عَيُنُکَ.''

٢ . عَنُ اَبِی اَيُّوبَ قَالَ: اَتَی النَّبِیَّ ؐ اَعُرَابِیٌّ فَقَال: يَارَسُولَ اللهِ! اِنِّی اُحِبُّ الُخَيُلَ فِـی الـجَـنَّةِ خَيُـل''؟ قَـالَ رَسُـولُ اللهِ ؐ: ''اِنُ اُدُخِلُتَ الُجَنَّةَ اُتِيتَ بِفَرَسٍ مِنُ يَاقُوتَةٍ لَهُ جَنَاحانِ فَحُمِلُتَ عَلَيُهِ، ثُمَّ طَارَبِکَ حَيُثُ شِئُتَ.''

ترجمہ:

ا۔ بُرَیدہ نے اپنے باپ سے روایت کی ہے کہ ایک مرد نے رسول اللہؐ سے پوچھا اور کہا کہ یا رسول اللہ! آیا جنت میں گھوڑے ہیں؟ رسول اللہؐ نے فرمایا: اگر اللہ تعالیٰ تجھے جنت میں داخل کرے تو کیا تو نہیں چاہے گا کہ وہاں تجھے سرخ یاقوت کے ایک گھوڑے پر سوار کیا جائے، جو تجھے لے کر جہاں تو چاہے اڑتا پھرے۔ راوی کہتا ہے کہ ایک اور مرد نے رسول اللہؐ سے پوچھا کہ یا رسول اللہ آیا جنت میں اونٹ ہیں؟ رسول اللہ نے اس کے لئے وہ نہیں فرمایا جو اس کے ساتھی کے لئے فرمایا تھا، بلکہ فرمایا کہ اگر اللہ تعالیٰ تجھے جنت میں داخل کرے تو وہاں تیرے لئے وہ چیز ہوگی جو تیرا جی چاہے اور جس سے تیری

آنکھ کو لذت ملے۔

۲۔ ابو ایوب سے روایت ہے کہ ایک اعرابی رسول اللہ کے پاس آیا اور کہا: یا رسول اللہ میں گھوڑوں کو چاہتا ہوں، آیا جنت میں گھوڑے ہیں؟ رسول اللہؐ نے فرمایا: اگر تجھے جنت میں داخل کیا جائے تو تجھے یاقوت کا ایک گھوڑا دیا جائے گا جس کے دو بازو ہونگے اور جس پر تجھے سوار کیا جائے گا، پھر وہ گھوڑا تجھے جہاں تو چاہے لیکر اڑے گا۔

مرکزِ علم و حکمت، لندن

۱۸ اپریل ۲۰۰۶ء

خدا درصورتِ حُوران وغِلمان کنزِ مخفی ھے

بِسمِ اللہِ الرَّحمٰنِ الرَّحیم۔

ے خدا در صورتِ حُوران و غِلمان کنزِ مخفی ھے
نہیں معلوم ان سب کو یہ حکمت جو بھی نادان ھے

اس پُرحکمت و معرفت شعر میں ''کنزِ مخفی'' کی تلمیح مشہور حدیثِ قدسی ''**کُنتُ کَنزاً مَخفِیّاً فَاَحْبَبْتُ اَنْ اُعرَفَ فَخَلَقْتُ الْخَلْقَ**، یعنی میں ایک چھپا ہوا خزانہ تھا، میں نے چاہا کہ پہچانا جاؤں تو (اس مقصد کے لئے) میں نے 'خلق' کو پیدا کیا'' کی طرف ہے۔

اس شعر کی اہمیت کے پیشِ نظر استادِ بزرگوار نے اس کو ''شعرِ قیامت خیز'' قرار دیا ہے، اور واقعاً دورِ قیامت سے پہلے اس حدیثِ قدسی کی ایسی منطقی و عرفانی تشریح کہیں نہیں پائی جاتی، اس قیامت خیز انقلابی شعر کی اہمیت کو مناسب طور پر سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے اس حدیثِ قدسی کے سابقہ تشریحات کے پس منظر اور مرکزی مفہوم کو مختصراً پیش کیا جائے۔

دورِ قیامت سے پہلے بہت سے حضرات نے الگ الگ پہلوؤں سے اس حدیثِ قدسی کی تشریح کی کوششیں کی ہیں، لیکن ان تمام تشریحات میں شارحین کا طریقِ استدلال ''عالمِ ظاہر'' کی تخلیق کے محور کے گرد گھوم رہا ہے، لیکن ظاہر ہے کہ اگر یہ مانا جائے کہ خدا نے عالمِ ظاہر کو ایک مخصوص وقت میں پیدا کیا، تو اس سے ایک طرف عالمِ ظاہر کی تخلیق کی ابتدا ثابت ہوتی ہے اور دوسری طرف عالمِ ظاہر خدا سے الگ تھلگ ایک حقیقت۔ پہلی صورت میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ خدا کو اپنی معرفت کے لئے عالمِ ظاہر کو پیدا کرنا تھا اور اس نے ایک وقتِ معین میں اسے پیدا کیا، تو اس سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس سے پہلے اسے کیوں پیدا نہیں کیا؟ یا اُس کے پیدا کرنے میں کیا چیز مانع تھی جس کی وجہ سے وہ (خدا) اس کو پیدا نہ کرسکا؟ اس صورت

میں یہ بات مضمر دکھائی دیتی ہے کہ یا تو خدا کے علم میں کمی تھی، جس کی وجہ سے وہ اس کا صحیح تصور نہ کرسکا، یا اُس کی قدرت میں کمی تھی، جس کی وجہ سے عالمِ ظاہر کے تصوّر کو عملی جامہ نہ پہنا سکا، دونوں صورتوں میں خدا کی صفات پر حدوث کا اطلاق ہوتا ہے، اس کے ساتھ خدا کے دوسرے صفاتی نام ہیں، جن کا تعلق مخلوق کے ساتھ ہے، اس لئے کسی مخلوق کے بغیر ان اسماء کا اطلاق خدا پر نہیں ہو سکتا، مثلاً خالق اور ربّ کو لیں، اگر کسی مخلوق و مربوب کے بغیر ان کا اطلاق خدا پر کیا جائے تو یہ حقیقت سے عاری خالی خولی نام ہوں گے، جبکہ خدا کی ذاتِ پاک ایسے ناموں سے منزّہ ہے، جن میں کوئی حقیقی معنی نہ ہوں۔

عالمِ ظاہر کو خدا سے الگ تھلگ ایک حقیقت سمجھنے میں بھی ایسے مسائل کا سامنا ہوتا ہے، مثلاً یہ پوچھا جاسکتا ہے کہ وہ کونسی چیز ہے جس سے خدا نے کائنات کو پیدا کیا؟ اگر خدا سے الگ کسی اور چیز کا تصور کیا جائے تو اس سے شرک یا ظلمِ عظیم کی آلائش سے دامن نہیں بچایا جاسکتا، اس کے علاوہ اس حدیثِ قدسی میں لفظِ ''مخفی'' سے بھی یہ منطقی سوال پیدا ہوتا ہے، کہ اگر کوئی وقت ایسا تھا جس میں خدا کے سوا کوئی مخلوق نہ تھی، تو خدا خود کو کس چیز سے چھپاتا تھا؟

الغرض حدیثِ مذکور میں ''خلق'' سے ''عالمِ ظاہر'' کو مراد لینے میں ایسے بہت سے مسائل درپیش آتے ہیں اور ان کا تشفی بخش حل کسی نے پیش نہیں کیا ہے۔

الحمدُللہ آج دورِ قیامت میں جبکہ زمینِ دعوت حضرتِ قائم القیامت کے نور سے روشن ہوگئی ہے ایک طرف اس مشکل مسئلے کو حل کرنے کا جو غلط طریقہ اختیار کیا گیا ہے، اس کی نشاندہی کی گئی ہے اور دوسری طرف معرفت کی روشنی میں نہایت ہی منطقی طور پر روح پرور اور عقل افروز تشریح پیش کی گئی ہے، ہمارے دور میں اسکا حل اجمالی اور تفصیلی دونوں صورتوں میں پایا جاتا ہے، اس کا اجمالی حل حضرتِ اعظم الائمہ حضرت مولانا سلطان محمد شاہ (فداہٗ ارواحُنا) نے اپنی نامور کتاب The Memoirs of Aga Khan میں مرحمت فرمایا ہے، اعظم الائمہ فرماتے ہیں کہ کائنات کو خدا سے الگ تھلگ سمجھنا اور عالمِ ظاہر کی تخلیق کو ایک وقتِ معین میں تسلیم کرنا،

اسلامی تعلیمات کے منافی ہیں بلکہ یہ یہودی نظریات ہیں۔ امامِ عالیمقام فرماتے ہیں کہ اسلام میں عالمِ ظاہر جو واقعات کا ایک لامتناہی سلسلہ (An infinite succession of events) ہے، خدا کا ظہورِ برترین (supreme manifestation) ہے، اس لئے اس کے کسی ایک وقتِ معین میں پیدا کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہے، لہٰذا امامِ عالیمقام فرماتے ہیں کہ اسلام میں تخلیق ایک دائمی اور مسلسل واقعہ ہے، اس لئے اس حدیثِ قدسی میں ''خلق'' سے عالمِ ظاہر مراد لینا حقیقت سے بعید ہے۔

اس کی تفصیلی تشریح استادِ بزرگوار کی کتابوں میں پائی جاتی ہے، جس طرح آن موصوف نے حضرتِ اعظم الائمہ کے دوسرے تصورات مثلاً یک حقیقت، روح، نور، وغیرہ کے تصورات کے اجمالی بیان کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے، اسی طرح تصورِ تخلیق کے اجمالی بیان کو بھی مفصل طور پر بیان کیا ہے، استادِ بزرگوار فرماتے ہیں کہ قرآنِ کریم، احادیثِ قدسی، اور احادیثِ نبوی میں جو ارشادات تخلیق سے متعلق ہیں، ان کا تعلق سرے سے عالمِ ظاہر کے ساتھ ہے ہی نہیں بلکہ ان کا تعلق عالمِ شخصی سے ہے، اس لئے یہاں پر ''خلق'' سے عالمِ ظاہر کو مراد لینا ہی غلط ہے اور اس غلط بنیاد پر جو بھی تشریح کرنے کی کوشش ہوگی وہ ''خشتِ اول چون نہد معمار کج + تا ثریّا می رود دیوار کج'' کی مصداق ہوگی، یعنی اس کا نتیجہ غلط ہی نکلے گا۔

اُستادِ بزرگوار اس بنیادی غلطی کی نشاندہی کے ساتھ ساتھ تفصیل کے ساتھ اپنی کتابوں اور خصوصاً ''ہزار حکمت'' میں حکمت ۵۲۷ سے لیکر حکمت ۵۸۷ میں کنزِ مخفی اور خلقت الخلق کی، تصورِ تخلیق کے تناظر میں، نہایت ہی بصیرت افروز تشریح فرمائی ہے، جس کا خلاصہ یہاں پیش کرنے کی حقیر کوشش کی جاتی ہے۔

استادِ بزرگوار ہزار حکمت میں فرماتے ہیں: ''اے نورِ عینِ من! اِس پُراسرار حدیثِ قدسی کو عالمِ ظاہر کی نسبت سے نہیں بلکہ عالمِ شخصی کے تناظر میں سمجھ لینا، کیونکہ یہ سچ ہے کہ خدا اپنے دوستوں کے عالمِ شخصی ہی میں چھپا ہوا خزانہ تھا، پھر حضرتِ ربّ نے ان کو روحانی اور عقلانی

طور پر پیدا کیا اور خزانۂ معرفت سے انہیں ہمیشہ کے لئے مالا مال فرمایا۔'' (حکمت ۷۵۲)۔

مزید فرماتے ہیں: ''جب تک مومنِ سالک روحانی طور پر پیدا نہ ہو جائے، تب تک اس کے حق میں ربّ العزّت ایک ناشناختہ خزانہ ہے، روحانی تولُّد کے بعد ہی عارفین و کاملین دیدار اور معرفت کی لازوال دولت سے مالا مال ہو جاتے ہیں۔'' (حکمت ۷۵۳)۔

مزید بران فرماتے ہیں: ''ربِّ کریم نے اپنی ذاتِ پاک کی تمثیل گنجِ پنہان سے اس لئے دی، تاکہ ہر عارف اس خزانۂ ازل کو عالمِ شخصی ہی میں حاصل کرے، جیسا کہ ارشادِ نبوی ہے: مَن کَانَ لِلّٰہِ کَانَ اللہُ لَہ۔ جو شخص خدا ہی کا ہو جاتا ہے تو خدا بھی اُسی کا ہو جاتا ہے، یعنی جو معرفت کو حاصل کرتا ہے وہ خود گنجِ معرفت ہو جاتا ہے۔''(حکمت ۷۵۶)۔

الحمدُللہ، آج استادِ بزرگوار کی علمی و عملی تربیت سے نفوسِ خانۂ حکمت حُوران و غلمان کی حیثیت میں اپنے اپنے عوالمِ شخصی میں علم الیقین، عین الیقین، اور حق الیقین کی روشنی میں اس کنزِ مخفی کے اسرارِ معرفت سے باخبر ہوتے ہوئے مثلِ قائم، مثلِ روحانی، زندہ قرآن، زندہ جنت کے مراتبِ عالیہ سے گزرتے ہوئے خود کنزِ مخفی بنتے جا رہے ہیں، **الحمدُللہ علی منّہٖ و اِحسانہٖ۔**

مرکزِ علم و حکمت لندن

۵، دسمبر ۲۰۰۶ء

رَفعِ شریعت

بِسمِ اللہِ الرَّحمٰنِ الرَّحیم۔

رَفعِ شریعت کی اصطلاح، جس کے لفظی معنی شریعت کو اٹھانے کے ہیں، دو متضاد و متخالف معنوں میں استعمال ہوئی ہے، وہ حضرات جو قرآنِ حکیم کے صرف ظاہری اور تنزیلی معنوں کے قائل ہیں، ان کے ہاں اس سے مراد شریعت کو پسِ پشت ڈالنا یا نظر انداز کرنا ہے، اس لئے وہ حضرات اس کے لئے اِباحت (antinomianism) اور الحاد جیسے ناروا الفاظ کا استعمال کرتے ہیں، ان کے برعکس وہ حضرات جو تنزیلی معنوں کے ساتھ تاویلی معنوں کے بھی قائل ہیں، ان کے ہاں رفعِ شریعت انبیائے کرام علیہم السّلام کی سنت رہی ہے اور یہ دین کے تکامل، ارتقاء اور بارآوری کا باعث ہے، چنانچہ اس نقطۂ نظر کے حامل حضرات کے ہاں یہ دینِ حق کی ایک اساسی خصوصیت ہے، اس لئے تمام ادیانِ عالم میں اس کے واضح شواہد پائے جاتے ہیں، یعنی جن عظیم پیغمبروں نے شریعتیں لائی ہیں، ان میں سے ہر ایک نے گذشتہ شریعت میں ترمیم کی اور اپنے وقت کے تقاضے کے مطابق اس کی جگہ پر ایک نئی شریعت لائی، اگر اوضاعِ شریعت کا وقت اور زمانے کے ساتھ کوئی تعلق نہ ہوتا تو خدا الگ الگ ادوار میں الگ الگ پیغمبروں کے ساتھ الگ الگ شریعتیں نہ بھیجتا اور تمام ادوار و اوقات کے لئے ایک ہی شریعت کو مقرر کرتا، لیکن ایسا نہیں، بلکہ یہ ایک برملا حقیقت ہے کہ الگ الگ پیغمبروں نے الگ الگ شریعتیں لائیں، اور ان میں ترمیمیں کیں، یہاں تک نہیں بلکہ ربّ العزت نے ایک پیغمبر کے زمانے کے اوضاع کو دوسرے پیغمبر کے زمانے کے لئے ''اصر اور اغلال'' یعنی سنگین بوجھ اور طوق قرار دیا ہے، جیسا کہ آنحضرتؐ کے بارے میں فرمایا گیا ہے: ''یَاْمُرُهُم بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهٰهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَيَضَعُ عَنهُمْ اِصرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِم'' (۱۵۷:۷)، یعنی وہ اچھے کام کا حکم دیتا ہے اور بُرے کام سے روکتا ہے اور پاکیزہ چیزیں ان پر حلال اور گندی چیزیں ان پر حرام کردیتا ہے اور سنگین بوجھ اور طوقوں کو، جو ان پر تھے، ان سے اتارتا ہے۔ اس سے روزِ روشن کی طرح ثابت ہوتا ہے کہ وقت کے تقاضوں کے لحاظ سے رفعِ شریعت دینِ حق کا ایک اساسی پہلو ہے۔

اس حقیقت کی مزید وضاحت کے لئے ضروری ہے کہ سب سے پہلے راسخون فی العلم یعنی ائمۂ طاہرین علیہم السّلام، جو قرآنِ حکیم کی تاویل اور حکمت کے حقیقی عالم اور معلّم ہیں، کی تاویلی تعلیمات کی روشنی میں قرآنی ارشادات کو دیکھا جائے، قرآنِ حکیم سے ظاہر ہے کہ شریعت دینی قوانین و قواعد کا مجموعہ ہے اور دینِ خدا کی فطرت کا نام ہے، جس کے مطابق انسان کو پیدا کیا گیا ہے، اور خدا کے اس قانونِ تخلیق میں کوئی تبدیلی نہیں، جیسا کہ ارشاد ہے: ''فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ؕ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِىْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ؕ لَاتَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ''(۳۰:۳۰) (اے رسول!) ایک حنیف کی طرح اپنا رخ دین کی طرف کرو، جو خدا کی فطرت ہے، جس کے مطابق خدا نے انسان کو پیدا کیا، اور خدا کی خلقت میں کوئی تبدیلی نہیں، وہی دینِ قائم ہے، لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے ہیں۔

اس آیت سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اگر صحیح معنوں میں خدا کی فطرت اور اس کے دین کو سمجھنا ہے تو انسان کی ماہیت اور حقیقت کو سمجھنے کی کوشش کی جائے، جو فطرت کا جامع و کامل نمونہ و خلاصہ ہے، انسانی فطرت پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر چند انسان کی ''انا'' یا ''خودی'' بچپن سے لے کر بڑھاپے تک علم و تجربے میں وسعت کے باوجود اپنی جگہ برقرار رہتی ہے، لیکن انسان سے متعلق ہر چیز بدلتی رہتی ہے، مثلاً انسان کی خوراک کو لیں، بچپن میں ماں کے دودھ کی صورت میں کتنی ہلکی اور نرم ہوتی ہے، لیکن وقت کے ساتھ نشوونما کے لئے ثقیل سے ثقیل تر غذا کھانے کی ضرورت پڑ جاتی ہے، لیکن اگر کوئی یہ دلیل دے کہ چونکہ بچے نے شروع میں دودھ ہی پیا ہے اس لئے ہمیشہ کے لئے دودھ ہی پینا چاہئے تو کیسی غیر منطقی دلیل ہوگی۔

اس سے روشن تر مثال تعلیم کی ہے کہ اس میں شروع میں ایک بچہ ابجد سیکھتا ہے اور پھر بتدریج پہلی، دوسری وغیرہ کلاسوں سے آگے بڑھتے ہوئے بی۔اے، ایم۔اے اور پی۔ایچ۔ڈی کے درجات سے گزرتا ہے، اس میں دلچسپ اور حکمت آگین نکتہ یہ ہے کہ جب طالبِ علم ایک کلاس سے دوسری کلاس میں جاتا ہے تو دوسری کلاس کے ساتھ پہلی کلاس میں بھی حاضری دینا نہ ممکن ہے اور نہ ضرورت، اس لئے پہلی کلاس کی حقیقت، یعنی جو کچھ وہاں سکھایا گیا تھا، دوسری کلاس میں خودبخود شامل

ہوگئی ہے، اس روشن حقیقت کے باوجود کوئی اگلی کلاسوں میں بھی حاضری دینے کا اصرار کرے تو اس صورت میں تحصیلِ حاصل کے سوا اس کو اور کیا مل سکتا ہے؟ جو حضرات شریعت میں ترمیم اور ترقی کے قائل نہیں، اُن کی دلیل اِن دلائل سے کچھ زیادہ مختلف دکھائی نہیں دیتی ہے۔

انسان کی فطرت کی بنیاد پر ان دلائل کے ساتھ ساتھ خود قرآن میں خدا برملا فرماتا ہے کہ وہ آیات کو منسوخ کرتا ہے، لیکن ان کی جگہ ان سے بہتر یا ان جیسی آیات کو نازل کرتا ہے، جیسا کہ فرمایا ہے: ''مَانَنۡسَخۡ مِنۡ اٰیَۃٍ اَوۡ نُنۡسِھَا نَاۡتِ بِخَیۡرٍ مِّنۡھَآ اَوۡمِثۡلِھَا'' (۱۰۶:۲)، یعنی ہم کوئی آیت منسوخ نہیں کرتے اور نہ ہی اس کو بھلا دیتے ہیں، مگر اس سے بہتر یا اس جیسی آیت کو نازل کرتے ہیں۔ الغرض جس طرح انبیائے ماسلف کی شریعتوں میں وقت کے تقاضوں کی وجہ سے ترمیمات ہوتی آئی ہیں، ان سے آنحضرتؐ کی شریعت مستثنٰی نہیں ہو سکتی، اور یہ حقیقت انسان کی فطرت اور خود قرآن حکیم سے ثابت ہے، کیونکہ ہر چند اعلانِ وصایت و امامت کے ساتھ اِکمالِ دین اور اِتمامِ نعمت کا اعلان ہوا تھا، لیکن ظاہر ہے کہ یہ سب کچھ پیغمبر کے زمانے میں حدِّ قوّت میں تھا اور اس کو حضرتِ قائم القیامت (ع۔س) کے زمانے میں حدِّ فعل میں آنا تھا، جس کے فیوض و برکات کی بشارت دیتے ہوئے پیغمبرؐ فرماتے ہیں: ''لَوۡ لَمۡ یَبۡقَ مِنَ الزَّمانِ اِلَّا یَوۡمٌ وَاحِدٌ لَطَوَّلَ اللهُ ذٰلِکَ الۡیَوۡمَ حَتّٰی یَخۡرُجُ مِنۡ ذُرِّیَّتِی رَجُلٌ یَمۡلَاءُ الاَرۡضَ قِسۡطاً وَعَدۡلًا کَمَا مُلِئَتۡ ظُلۡماً وَجَوۡراً۔'' یعنی اگر زمانے سے صرف ایک ہی دن باقی رہ جائے تو خدا اس دن کو لمبا کردے گا، یہاں تک کہ میری ذُرّیّت سے ایک آدمی پیدا ہوگا جو زمین کو انصاف و عدل سے بھر دے گا، جس طرح آج یہ ظلم و جور سے بھری ہوئی ہے۔

اس حدیث سے ظاہر ہے کہ پیغمبر جو کچھ کرنا چاہتے تھے، اس کو اپنے وقت میں انجام دینا ممکن نہ تھا، بلکہ آپ کی یہ خواہش آپ کے ایک فرزند، جو قائم القیامت کے مرتبے میں کام کریں گے، کے زمانے میں پوری ہونے والی تھی، ظاہر ہے کہ حضرتِ قائم کے زمانے میں جو حالات و تقاضے ہوں گے، وہ آنحضرت کے زمانے سے مختلف ہوں گے، اور اگر حضرتِ قائم ان حالات و تقاضوں کے مناسب کوئی ہدایت دیں تو اس سے دین میں کیا خرابی اور خلل پیدا ہو سکتا ہے، جبکہ پیغبر صلّی اللہ علیہ و آلہ و سلّم خود فرماتے ہیں: ''اِنَّکُمۡ فِیۡ زَمَانٍ مَنۡ تَرَکَ مِنۡکُمۡ عُشۡرَ مَا اُمِرَبِهِ هَلَکَ ثُمَّ یَاۡتِیۡ زَمَانٌ مَنۡ عَمِلَ

مِنْهُمْ بِعُشْرِ مَا اُمِرَ بِهٖ نَجَا۔'' یعنی تم ایک ایسے زمانے میں ہو جس میں تم میں سے جو کوئی اس چیز کا، جس کا حکم دیا گیا ہے، دسواں حصّہ چھوڑ دے تو وہ ہلاک ہو جائے گا، پھر ایک زمانہ آئے گا جس میں [اس زمانے کے] لوگوں میں سے جو کوئی اس چیز کے، جس کا حکم دیا گیا ہے، دسویں حصّے پر عمل کرے گا تو وہ نجات پائے گا۔ (**ترمذی، حدیث ۲۲۶۷؛ مشکوٰۃ المصابیح، باب الاعتصام بالکتابِ والسنۃ**)۔

اس کے باوجود اہلِ ظاہر کا اِصرار ہے کہ آنحضرت صلعم کی شریعت میں کوئی تبدیلی ممکن نہیں، اس لئے کہ آپ کے بعد قیامت برپا ہوگی اور اس کے ثبوت میں اس حدیث کو پیش کیا جاتا ہے: ''**بُعِثْتُ اَنَا وَالسَّاعَةُ كَهَاتَيْنِ**۔'' میں اور قیامت ان دو انگلیوں کی طرح مبعوث ہوئے ہیں۔ یعنی آنحضرت نے یہ دکھانے کے لئے کہ آپؐ اور قیامت ایک ساتھ آئے ہیں، دوسرے دو انگلیوں کی بجائے جو آگے پیچھے ہوتے ہیں، دونوں انگشتانِ شہادت کو ایک ساتھ رکھ کر دکھاتے ہوئے فرمایا کہ میں اور قیامت ان دونوں کی طرح ایک ساتھ آئے ہیں۔

اس استدلال سے یہ بات ثابت ہوئی کہ اہلِ ظاہر کو تصورِ قیامت کے سمجھنے میں مغالطہ ہوا ہے، ان کے نزدیک انسانی تاریخ میں ابھی تک کوئی قیامت برپا ہوئی ہی نہیں بلکہ یہ مستقبل میں کسی وقت میں ہونے والی ہے، ایسا تصور یقیناً آپؐ کے ارشاد کے منافی معلوم ہوتا ہے کہ آج سے تقریباً پندرہ سو سال پہلے آپؐ نے فرمایا تھا کہ میں اور قیامت ایک ساتھ مبعوث ہوئے ہیں، اس کے ساتھ آپؐ نے یہ بھی فرمایا: ''**مَنْ مَاتَ فَقَدْ قَامَتْ قِيَامَتُهٗ**۔'' یعنی جو شخص مر جاتا ہے اس کی قیامت برپا ہوتی ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ ابھی تک کوئی قیامت برپا نہیں ہوئی تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر یہ قیامت کہاں سے آئی؟

تصورِ قیامت کو سمجھنے کے لئے قرآن میں دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ قیامت کا تعلق وقت سے ہے اور کئی ایک آیات میں اس کو یوم اور ساعت سے تعبیر کیا گیا ہے اور اس سے بھی بڑھ کر فرمایا گیا ہے کہ مختصر ترین قیامت کا کام آنکھ جھپکنے یا اس سے بھی کم وقت میں واقع ہوتا ہے، جیسا کہ فرمایا گیا ہے: ''**وَمَآ اَمْرُ السَّاعَةِ اِلَّا كَلَمْحِ الْبَصَرِ اَوْ هُوَ اَقْرَبُ**'' (۱۶:۷۷)، یعنی: اور قیامت کا واقع

ہونا تو ایسا ہے جیسے پلک کا جھپکنا، بلکہ اس سے بھی زیادہ جلدی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ قیامت لمحِ بصر یا ایک سیکنڈ یا اس سے بھی کم وقت میں واقع ہوتے ہوئے منٹ، گھنٹہ، دن، ہفتہ، مہینہ، سال، سو سال، ہزار سال، ادوار، اور اَکوار کے عرصے بناتے ہوئے ہمیشہ کے لئے جاری و ساری ہے، اس لئے دنیا میں بہت سی قیامتیں ماضی میں واقع ہو چکی ہیں اور بہت سی مستقبل میں واقع ہوتی جائیں گی، اس لئے حکیم پیر ناصر خسرو (قس) علوی فرماتے ہیں:

ے هُوالاوّل هُوالآخر هُوالظّاهر هُوالباطن
منزّه مالکِ الملکی که بی پایان حشر دارد

ترجمہ: وہ اوّل ہے، وہ آخر ہے، وہ ظاہر ہے، وہ باطن ہے، وہ پاک و برتر ایسے ملک کا مالک ہے کہ جس میں لاانتہا قیامتیں ہیں۔

چونکہ قیامت کا تعلق وقت سے ہے اور وقت میں تخلیق مختلف صورتوں میں جاری ہے، اس لحاظ سے قیامت کو بھی مختلف صورتوں میں جاری و ساری ہونا ہی ہے، اس لئے کہ قیامت تخلیق کا نتیجہ ہی ہے، جیسے ایک فصل کی بوائی سے اس کی تخلیق شروع ہوتی اور کٹائی پر اس کی قیامت برپا ہوتی ہے، بالکل اسی طرح آنحضرت سے پہلے پیغمبروں کے ادوار کی قیامتیں ہوتی رہی ہیں اور آپؐ کے بعد بھی ان کا سلسلہ جاری رہے گا، آنحضرت سے پہلے واقع شدہ قیامتوں کی واضح ترین مثال حضرتِ عیسیٰؑ کی ہے جن کے بارے میں خدا فرماتا ہے: ''وَجَاعِلُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ'' (۳:۵۵)، اور جن لوگوں نے تمہاری پیروی کی ان کو قیامت تک کافروں پر فوقیت دوں گا۔ اس آیت سے ظاہر ہے کہ حضرتِ عیسیٰ کے تابعین قیامت تک ان سب پر فائق رہیں گے، جنہوں نے آپ کی پیروی سے انکار کیا، اسی سورہ میں ایک دوسری آیت (۳:۱۱۰) میں خدا تابعینِ حضرتِ محمد مصطفیٰؐ سے فرماتا ہے: ''كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ۔'' تم اچھے گروہ ہو کہ لوگوں کی ہدایت کے واسطے پیدا کئے گئے ہو، تم اچھے کاموں کا حکم کرتے ہو اور بُرے کاموں سے روکتے ہو، اور خدا پر ایمان رکھتے ہو۔ یہاں پر خدا ایک طرف تابعینِ حضرتِ عیسیٰؑ کو دوسروں پر فائق قرار دیتا ہے اور دوسری طرف تابعینِ حضرتِ محمد مصطفیٰؐ کو بہترین امت قرار دیتا ہے، اس کی قابلِ فہم

توجیہہ یہ ہو سکتی ہے کہ تابعینِ حضرتِ عیسیٰؑ آپؑ کے دور کے آخر تک خدا کی نظروں میں دوسروں پر فوقیت رکھتے تھے، دور کے اختتام پر جب حضرت محمد مصطفیٰؐ مبعوث ہوئے اور قیامت برپا ہوگئی تو یہ فوقیت ان کے نصیب میں آگئی، جنہوں نے آپؐ کی پیروی کی، اس توجیہہ کے بغیر کوئی تابعِ حضرتِ محمدؐ یعنی مسلمان نہ معلوم کس طرح اس بات کو تسلیم کرے گا کہ تابعِ عیسیٰؑ یعنی عیسائی قیامت تک ان پر فائق رہے گا۔

بحثِ مذکورۂ بالا سے ظاہر ہے کہ قیامت کا تعلق وقت اور تخلیق سے ہے، اس لئے جب تک وقت اور تخلیق جاری ہیں تو قیامت بھی جاری ہے، اس کے باوجود اہلِ ظاہر کے لئے قیامت کی شناخت مشکل اس لئے ہے کہ علمِ قیامت کا تعلق جو اس ظاہر سے نہیں بلکہ یہ ایک باطنی اور روحانی واقعہ ہے، اس لئے اہلِ ظاہر کی نسبت سے خدائے تعالیٰ قیامت کے بارے میں فرماتا ہے کہ بے خبری اور لاشعوری صورت میں واقع ہوگی، یعنی قیامت تو واقع ہوگی لیکن روحانی کیفیت میں ہونے کی وجہ سے اہلِ ظاہر کو اس کا شعور نہیں ہوگا، جیسا کہ فرمایا گیا ہے: ''**تَاْتِیَھُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً وَّھُمْ لَایَشْعُرُوْنَ**'' (۱۲:۱۰۷)، یعنی قیامت ان پر اچانک آجائے اور ان کو کچھ خبر بھی نہ ہو۔ اس میں شک نہیں کہ خدا نے بڑی قیامتوں کے ظاہری آثار دکھانے کا بھی وعدہ فرمایا ہے، مثلاً: ''**سَنُرِیْھِمْ اٰیٰتِنَا فِی الْاٰفَاقِ وَفِیْٓ اَنْفُسِھِمْ حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَھُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ**'' (۴۱:۵۳)، یعنی ہم عنقریب ہی اپنی نشانیاں آفاق میں اور ان کے نفوس میں دکھائیں گے، یہاں تک کہ ان پر ظاہر ہو جائے گا کہ وہی یقیناً حق ہے، لیکن ان کی شناخت کا تعلق بھی اہلِ باطن سے ہے، اس لئے قیامتیں روحانی اور باطنی طور پر آتی رہتی ہیں، لیکن اہلِ ظاہر کو ان کا علم نہیں ہوتا اور ان کا وقت انتظار میں گزرتا ہے، اس لئے کیا عجب ہے کہ جس قیامت کے لئے پیغمبرؐ نے فرمایا تھا کہ انگشتانِ شہادت کی طرح ہم ایک ساتھ مبعوث ہوئے ہیں وہ پیغمبر کے ساتھ آکر گزر گئی ہو اور جس کا اہلِ ظاہر کو شعور نہ ہوا ہو۔

اب پیغمبر کی شریعت کے بارے میں اس بنیاد پر یہ کہنا کہ چونکہ اس کے بعد ایک مخصوص قیامت واقع ہونے والی ہے، اس لئے اس میں ترمیم ممکن نہیں، نہ قرآن سے ثابت ہے اور نہ حدیث سے اور نہ عقلِ سلیم اس کو قبول کرتی ہے، اس لئے شریعت میں ترمیم وقت کا ایک تقاضا ہے، اس

لئے اس تقاضے کو اس میں بھی پورا ہونا چاہیئے، چنانچہ اس ضرورت کے پیشِ نظر حضرت امام سلطان محمد شاہؑ فرماتے ہیں: ''یہ بات ہمیشہ کیلئے ...ثابت ہونی چاہیئے کہ درحالیکہ قرآن کے الفاظ وہی رہتے ہیں، ہر ایک نسل، ہر ایک صدی، اور ہر ایک زمانے کے لئے ضروری ہے کہ ایک نئی اور ماضی سے مختلف تاویل کرے، نہیں تو اسلام نیست و نابود ہو جائے گا'' یہاں پر امامِ عالیمقام کے ارشاد سے یہ بھی ثابت ہے کہ ترمیم یا تدریجی تعلیم کا تعلق تنزیل یا نصِّ قرآن سے نہیں بلکہ اس کی تاویل سے ہے، جو اس تنزیل میں پوشیدہ ہے، جس کا ظہور وقت کی ضرورت کے ساتھ اولوا الامر کے ذریعے ہوتا رہتا ہے(۷:۵۲-۵۳؛ ۱۷:۱۰۷) چنانچہ امام موصوف مزید فرماتے ہیں: ''ادارۂ اولوا الامر، جس کی تعبیر خلیفہ یا امام سے کی جا سکتی ہے [کے مقرر کرنے سے] اور اولوا الامر کی اطاعت کو براہِ راست خدا اور رسول کی اطاعت کے بعد رکھتے ہوئے خدا نے اس بات کو یقینی بنایا ہے کہ دین سائنس، علم، فنون، اور صنعت و حرفت کے ساتھ زندہ رہتے، پھیلتے، اور ترقی کرتے ہوئے ہمیشہ کے لئے رہے گا''

دینِ اسلام کی اس فطری حرکیت کی وجہ سے اہلِ ظاہر کی تشدّد پسندی کے باوجود اہلِ تاویل کے ساتھ اہلِ تصوف اور جو عقلِ سلیم سے کام لیتے ہیں، اس تدریجی تعلیم کے قائل ہوتے جاتے ہیں، اور شریعت کے ساتھ طریقت، حقیقت، اور معرفت کے درجات کو تسلیم کرتے جاتے ہیں، ہمارے زمانے کے ایک عارفِ کامل حضرتِ علاّمہ نصیرالدّین نصیر ہونزائی جنہوں نے اپنی ساری زندگی کو اسلام کی باطنی حقیقت کی شرح و توضیح کے لئے وقف کیا ہے، درجاتِ تعلیم کی کی تدریجی ترقی کا ایک پُرحکمت نقشہ کھینچا ہے کہ کس طرح یہ درجات آپس میں ملے ہیں اور کس طرح بتدریج ترقی کرتے ہیں، رفعِ شریعت کی حقیقت کو سمجھنے کے لئے اس نقشے کی اہمیت کی خاطر اس کو اور اس کی وضاحت کو ذیل میں درج کیا جاتا ہے، بحوالۂ آٹھ سوال کے جواب صفحات ۳۱ اور ۳۲:

درجاتِ اسلام

دینِ اسلام صراطِ مستقیم (یعنی سیدھا راستہ) ہے اور ظاہر ہے کہ ہر طویل راستے کی چند منزلیں ہوا کرتی ہیں، چنانچہ راہِ اسلام کی چار منزلیں ہیں، جن کے نام ہیں: شریعت، طریقت، حقیقت، اور معرفت، ہم ان چار منزلوں کو چار درجات بھی کہہ سکتے ہیں، مگر یہاں یہ اصول ہمیشہ کے لئے

یاد رہے کہ ان میں سے ہر درجے میں دوسرے تین درجوں کے اجزاء بھی کم و بیش شامل ہیں، مثال کے طور پر جس منزل میں حقیقت ہے، اس میں خالص حقیقت نہیں ہوسکتی ہے، لہٰذا ایک اندازے کے مطابق حقیقت میں ۲۰ فیصد شریعت، ۲۵ فیصد طریقت، ۳۰ فیصد حقیقت، اور ۲۵ فیصد معرفت کی باتیں ہوتی ہیں، یہی مثال باقی تین درجوں کی بھی ہے، اس مطلب کو درجِ ذیل نقشہ میں ظاہر کیا گیا ہے:

اجزائے چہارگانہ

شمار	منازل	شریعت فیصد	طریقت فیصد	حقیقت فیصد	معرفت فیصد	مجموعہ
۱	شریعت	۴۰	۲۵	۲۰	۱۵	۱۰۰
۲	طریقت	۲۵	۳۰	۲۵	۲۰	۱۰۰
۳	حقیقت	۲۰	۲۵	۳۰	۲۵	۱۰۰
۴	معرفت	۱۵	۲۰	۲۵	۴۰	۱۰۰

رفعِ شریعت کے سلسلے میں ایک اور اشتباہ کے ازالے کی ضرورت ہے، جیسا کہ شروع میں ذکر ہوا ہے کہ بعض حضرات نے اس سے مراد اِباحت و الحاد کو لیا ہے، یعنی تمام اخلاقی اقدار کو بالائے طاق رکھ کر نفسِ امّارہ کی غلامی کرتے ہوئے خواہشاتِ نفسانی میں گرفتار ہونا اور شرّ و فساد برپا کرنا، یہ مفہوم نہایت شرانگیز اور اصل مفہوم سے بہت ہی دُور دکھائی دیتا ہے، اور اس کا مقصد اس کے ماننے والوں کو بدنام کرنے کی ایک مذموم کوشش ہے، نہیں تو جس طرح آنحضرت نے دورِ قیامت کے فیوضات و برکات کی بشارت دی ہے، کہ اس وقت ظلم و ستم کا خاتمہ اور عدل و انصاف کا دور دورہ ہوگا تو یقینی بات ہے، کہ ایسے بابرکت دور میں لوگ زیادہ سے زیادہ خدا کے ذکر و فکر اور طاعت و عبادت کی طرف مائل ہوں گے، نہ کہ خواہشاتِ نفسانی اور شرّ و فساد اور ظلم و جور کی طرف، اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے خواجہ نصیرالدّین طوسی اپنی کتاب روضۂ تسلیم (ص ۱۳۵، انگریزی ترجمہ "Paradise of Submission" ص ۱۱۰، چاپ لندن، ۲۰۰۵) میں لکھتے ہیں:

’’زمانِ شریعت...طاعات بشرط تعیین اوقات فرمایند ... و استغراقِ طاعات باشد

در اوقات، وزمانِ قیامت ... طاعات برفعِ تعیین اوقات فرمایند... واستغراقِ اوقات باشد در طاعات۔"

یعنی شریعت کے زمانے میں عبادات مقرّرہ اوقات کی شرط کے ساتھ ادا کرنے کے لئے فرمایا جاتا ہے، اور عبادات اوقات میں مستغرق ہوتی ہیں، اور قیامت کے زمانے میں عبادات مقررہ اوقات کی شرط کے بغیر ادا کرنے کے لئے فرمایا جاتا ہے اور اوقات عبادات میں مستغرق ہوتی ہیں۔

اس بیان سے ظاہر ہے کہ رفعِ شریعت سے مراد اِباحت و الحاد نہیں بلکہ ابتدائی تعلیم سے اعلیٰ تعلیم کی طرف آگے بڑھنا اور مقرّرہ اوقات میں خدا کو یاد کرنے کی جگہ ہمہ وقت یاد کرنے کی طرف دعوت ہے، جیسا کہ قرآنِ کریم میں صلواۃِ موّقت یا موقوت (۴:۱۰۳) اور صلواۃِ دائم (۲۳:۷۰ ، ۳:۱۹۱ ، ۴:۱۰۳) دونوں کا ذکر آیا ہے، لیکن ظاہر ہے کہ صلوٰۃِ دائم میں وقت کی قید و پابندی باقی نہیں رہتی، اس لئے رفعِ شریعت سے مراد اِباحت و الحاد کو لینا یا تو اس کے سمجھنے میں بہت بڑی غلطی ہوئی ہے، یا جان بوجھ کر حقیقت کو مسخ کرنے کی ایک کوشش۔

اخیر میں دیکھنا یہ ہے کہ رفعِ شریعت کا اطلاق کلّی شریعت پر ہوتا ہے یا جزوی شریعت پر، اور اس سلسلے میں انبیائے ماسَلَف کی کیا سنّت رہی ہے، اس سلسلے میں بزرگانِ دین نے آیاتِ محکمات و متشابہات کی بنیاد پر شریعت کو عقلی اور وضعی دو حصّوں میں تقسیم کیا ہے، شریعتِ عقلی سے شریعت کا وہ حصّہ مراد ہے جس کے اُٹھانے سے نظامِ معاشرہ درہم برہم ہو جاتا ہے اور ہرج مرج پیدا ہو جاتا ہے، اس لئے ایسی شریعت میں کسی لاحق پیغمبر نے کسی سابق پیغمبر کی شریعت میں کبھی ترمیم نہیں کی ہے، جیسے کسی کا قتل کرنا، دوسروں کا مال چھیننا، وغیرہ، گویا عقلی شریعت کو کبھی اُٹھایا نہیں جاتا اور یہ یکسان طور پر تمام انبیائے کرام کی شریعتوں میں جاری رہتی ہے۔

شریعتِ وضعی سے شریعت کا وہ حصّہ مراد ہے جس کے اٹھانے سے نظامِ معاشرہ میں کوئی خلل اور ہرج مرج پیدا نہیں ہوتا، مثلاً نماز، روزہ، زکواۃ، حج وغیرہ، یہ اوضاع یہودیت، عیسائیت، اسلام وغیرہ سب ادیان میں پائے جاتے ہیں، لیکن ان کی شکلیں الگ الگ ہیں، یعنی ان میں ترمیمات ہوتی رہی ہیں، یعنی یہ اوضاع ایک ناطق یا شارع پیغمبر اپنے وقت کے تقاضوں کے مطابق ایک مخصوص مقصد (end) کے

حصول کے لئے ایک مخصوص عمل کو وسیلہ (means) کے طور پر وضع کرتا ہے، جب وہ مقصد حاصل ہوتا ہے تو پھر ذریعہ کی ضرورت باقی نہیں رہتی، اس کی ایک بہترین مثال کسی میوہ دار درخت کی کلی اور میوۂ پختہ سے دیا جا سکتا ہے، ظاہر ہے کہ ایک کلی میں پھول، میوۂ خام، اور میوۂ پختہ سب پنہان ہیں، لیکن کلی کی صورت میں کوئی نہ پھول کو دیکھ سکتا ہے اور نہ میوۂ پختہ کو، کلی کو میوۂ پختہ تک پہنچنے کے لئے پھول اور میوۂ خام کی تدریجی حالتوں سے گزرنا ہوگا اور اس تدریجی ترقی میں پہلی اور دوسری شکل یعنی کلی اور پھول کو ایک ساتھ رہنا ممکن نہیں، بلکہ دوسری شکل کے پیدا ہونے پر پہلی غائب ہو جاتی ہے، اس کا یہ مطلب نہیں کہ دوسری شکل کے پیدا ہونے سے پہلی شکل کو کوئی نقصان ہوا، بلکہ ہر دوسری شکل پہلی شکل ہی کی ترقی یافتہ شکل ہے، اسی طرح دین میں بھی شریعت وضع کے اٹھانے سے اس کو کوئی نقصان نہیں ہوتا، بلکہ یہ اس کی ترقی اور تکامل کی علامت ہے، جیسا کہ آیتِ ناسخ و منسوخ (۱۰۶:۲) سے ظاہر ہے۔

حضراتِ انبیاء علیہم السّلام اوضاعِ شریعت کے تحت کس طرح حقائق پنہان رکھتے ہیں اور وقت آنے پر ان کی کیوں ضرورت باقی نہیں رہتی ہے، اس کی مثالیں بزرگانِ دین کی کتابوں میں جابجا ملتے ہیں، مثلاً مناسک حج میں بیت اللہ کی زیارت کا حکم دینے میں کیا حقیقت پوشیدہ ہے، پیر ناصر خسرو (ق۔س) اپنی کتاب خوان الاخوان (ص، ۳۴۳، چاپ قاہرہ، ۱۹۴۰) میں فرماتے ہیں: "[کہ جب کوئی پیغمبر ایک نئی شریعت لاتا ہے اور وہ حدِ قوت میں ہونے کی وجہ سے کمزور] ہوتی ہے ساتھ ساتھ پیغمبر کو اس بات کا علم ہوتا ہے کہ اس کے بعد شیاطین امامِ حق کے خلاف امّت کو دھوکہ دیں گے اور وہ ان کی پیروی کریں گے، اس لئے پیغمبر [اپنی امّت کو اس گمراہی سے بچانے کے لئے] ایک گھر کو 'خدا کے گھر' کا نام دے کر امّت کو اس کی زیارت کا حکم دیتا ہے، تاکہ یہ گھر ان کے لئے دلالت کرے کہ امامِ حق ایک ہی ہوتا ہے، جس کو رسول مقرّر کرتا ہے اور اس کے علاوہ کسی اور کو امام نہیں کہنا چاہیئے، جس طرح خدا کی عبادت میں ہر گھر کی طرف رُخ نہیں کیا جاتا سوائے اس گھر کے جس کو پیغمبر نے خدا کا گھر قرار دیا ہے، [ساتھ ساتھ] لوگ جان لیں کہ امامِ حق خاندانِ رسول سے ہوتا ہے اور وہ خدا کے علم کا گھر ہوتا ہے۔"

حاصلِ کلام یہ ہے کہ دینِ حق دو قسم کی شریعت پر مشتمل ہے، ان میں سے ایک عقلی شریعت ہے جو اٹل اور بے بدل قوانین پر مشتمل ہے، جو تمام انبیاء علیہم السّلام کی شریعتوں میں یکسان طور پر پائے جاتے ہیں، اور دوسری وضعی شریعت ہے جو ان احکام و اوضاع پر مشتمل ہے، جو وقت اور دَور کے لحاظ سے بدلتے رہتے ہیں، اس لئے یہ انبیاء علیہم السّلام کی شریعتوں میں الگ الگ شکلوں میں پائے جاتے ہیں، رفعِ شریعت کا تعلق عقلی شریعت سے نہیں بلکہ وضعی شریعت سے اور اس میں وقت اور زمانے کے لحاظ سے اوضاع میں تبدیلی دینِ حق کا ایک اساسی پہلو ہے، اس لئے کہ اس میں دینِ حق کا ارتقاء، تکامل، اور بار آوری پنہان ہے، **الحمدُللہ علیٰ منّہِ و اِحسانہ۔**

جن کتابوں میں رفعِ شریعت کا ذکر آیا ہے، ان میں سے چند ایک:

مولانا المعزلدین اللہ	:	**ادعیۃ الایّام السبعۃ**
	:	**تأویل الشّریعۃ**
سیدنا جعفر بن منصور الیمن	:	**سرائر النطقاء**
	:	**الفترات و القرانات**
سیدنا ابو یعقوب سجستانی	:	**کتاب اثبات النبؤات**
	:	**کتاب الافتخار**
سیدنا ناصر خسرو	:	**خوان الاخوان**
	:	**وجہِ دین**
خواجہ نصیرالدّین طوسی	:	**روضۂ تسلیم**
حضرت حسن محمود کاتب	:	**دیوانِ قائمیات**

فقیر ہونزائی

مرکزِ علم و حکمت، لندن

۳۱، دسمبر ۲۰۰۶ء

ترمیم کی تاریخ: ۱۶، مارچ ۲۰۰۷ء

حضرتِ خدیجۃ الکبریٰ علیہا السلام

حضرتِ خدیجۃ الکبریٰؑ ہمارے رسولِ اکرمؐ خاتم النبیین و سیدالمرسلین حضرتِ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم کی اولین رفیقۂ حیات کا نامِ نامی اور اسمِ گرامی ہے، آپؑ دینِ حق کی تاریخ میں اپنی خدماتِ جلیلہ کی وجہ سے ہمیشہ کے لئے زندہ اور تابندہ ہیں، آپؑ کی خدمات کا دائرہ رسولِ اکرمؐ کی بعثت سے پہلے اور بعثت کے بعد دونوں ادوار پر پھیلا ہوا ہے۔

حضرتِ خدیجۃ الکبریٰؑ حضرتِ خُوَیلِد بن اسد بن عبد العُزّیٰ بن مولانا قُصَیؑ علیہ السلام کی صاحبزادی تھیں، آپ کی والدۂ ماجدہ کا نام فاطمہ تھا، جو زائدہ بن الاصمّ بن رَواحہ بن حجر بن عبد بن مَعِیص بن عامر بن مولانا لُـؤَیؑ علیہ السلام کی صاحبزادی تھیں، مولانا قصی اور مولانا لُؤَی دورِ پنجم کے مستقر اماموں میں سے ہیں، اس طرح آپؑ کا نسب باپ کی طرف سے چوتھی اور ماں کی طرف سے نویں پشت میں رسول اللہؐ سے ملتا ہے۔ آپؑ کی ولادتِ باسعادت ۵۵۵ عیسوی کو ہوئی تھی، آپؑ کی بزرگی و سیادت کے آثار بچپن سے نمایاں تھے، آپؑ کو آپ کی عفت، شرافت، اور سیادت کے باعث طاہرہ اور سیدۃ النساء کے القاب سے یاد کیا جاتا تھا۔

حضرتِ خدیجۃ الکبریٰؑ کو ربّ العزّت نے اخلاقی صفاتِ عالیہ کے ساتھ ظاہری مال و متاع سے بھی نوازا تھا۔ بقول مصنف ناسخ التواریخ میرزا محمد تقی سپہر، مالِ تجارت کی بار برداری کے لئے آپؑ کے پاس اَسی ہزار اونٹ تھے اور آپؑ مکہ میں تجارت میں کامیاب خواتین کی سردار تھیں۔

حضرتِ خدیجۃ الکبریٰؑ کی ان سعادتوں سے بھی بڑھ کر ایک اور سعادت تھی اور وہ دینی سعادت تھی۔ آپؑ اُن خوش نصیب انسانوں میں سے تھیں جن کے بارے میں قرآنِ کریم فرماتا ہے: "اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ ۔" (۱۴۶:۲ ؛ ۲۰:۶) یعنی جن لوگوں کو ہم نے کتاب عطا فرمائی ہے وہ اس (آنحضرتؐ) کو اس طرح پہچانتے ہیں جس طرح وہ اپنے بچوں کو پہچانتے ہیں۔

دعوتِ حق کی کتابوں مثلاً سیدنا جعفر بن منصور الیمن کی کتاب سرائر و اسرار النطقاء سے معلوم ہوتا ہے کہ دورِ پنجم کے حدودِ دین میں حضرتِ خدیجۃ الکبریٰؑ کا مرتبہ نہایت بلند تھا، سیدنا جعفر فرماتے

ہیں کہ آپؑ اُس دور کے امامِ مقیم مولانا ابو طالب علیہ السلام کی حجت تھیں، مولانا ابو طالبؑ اپنے وقت میں سابق یعنی عقلِ کُلّ کے مرتبے پر تھے اور آپؑ تالی یعنی نفسِ کُلّی کے مرتبے پر تھیں، اس لئے کتبِ دعوت میں آپؑ کو ''حجتُ الوقت'' یا ''حجتِ صاحب الوقت'' اور ''خاتم الاربعین'' کے بلند ترین مراتب سے یاد کیا گیا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ آنحضرتؐ حدودِ دین کی سیڑھی پر چڑھتے ہوئے حضرتِ امامِ مقیم مولانا ابو طالب علیہ السلام سے براہِ راست تائید حاصل کرنے اور مرتبۂ ناطق پر فائز ہونے سے پہلے آپؑ (حضرتِ خدیجۃ الکبریٰؑ) سے روحانی تعلیم حاصل کرتے تھے۔

دعوتِ حق اور حدودِ دین کے سلسلے میں یہ جاننا ضروری ہے کہ حضرتِ ابراہیم علیہ السلام کے زمانے سے آنحضرتؐ کے زمانے تک نورِ امامت استقرار اور استیداع دو حیثیتوں میں کام کرتی رہی تھی، مستقر امامت پوشیدہ طور اور مستودع امامت برملا طور دعوتِ حق کا کام کرتی تھی، چنانچہ حضرتِ مولانا اسماعیل علیہ السلام کی اولاد نے مولانا قیدار علیہ السلام سے مولانا ابو طالب علیہ السلام تک مستقر اماموں کی حیثیت میں دعوتِ حق کا کام جاری رکھا، مستقر اماموں کے معجزات میں سے حضرتِ مولانا عبد المطّلب علیہ السلام نے اَبْـرَھَۃُ الْاَشْـرَم کے کعبہ پر حملے کے موقع پر جو معجزہ دکھایا تھا، وہ خواص و عوام سب میں مشہور ہے، ابرھہ اور اسکی فوج کا جو حشر ہوا اس کا ذکر قرآن کریم میں سورۂ فیل میں بھی آیا ہے۔

مستقر اماموں کے سلسلۂ اشخاص یعنی جسمانی جاموں میں نورِ امامت منتقل ہوتے ہوئے کس طرح مولانا ابو طالب علیہ السلام تک پہنچا، اس کا ذکر کتبِ دعوتِ حق کے علاوہ دوسری کتابوں میں بھی پایا جاتا ہے، مثلاً عبد الکریم شہرستانی اپنی کِتـابُ الْـمِـلَلْ وَ النِّحَلْ کے دوسرے حصے میں لکھتے ہیں کہ حضرتِ آدم علیہ السلام سے جو نور حضرتِ ابراہیم علیہ السلام میں آیا تھا، وہ ان کے زمانے میں دو حصوں میں منقسم ہوگیا، ایک حصہ بنی اسرائیل میں اور دوسرا بنی اسماعیل میں۔ جو نور بنی اسرائیل میں آیا تھا وہ ظاہری طور پر کام کر رہا تھا اور جو نور بنی اسماعیل میں آیا تھا وہ پوشیدہ طور پر کام کر رہا تھا۔ آگے جاکر مزید لکھتے ہیں کہ تاریخ میں حضرتِ اسماعیل علیہ السلام کی اولاد کو ''آلُ اللہ'' اور ''اَھْـلُ اللہ'' کہا گیا ہے اور حضرتِ اسرائیلؑ کی آل کو ''آلِ یعقوب''، ''آلِ موسیٰ''، اور ''آلِ ہارون'' کہا گیا ہے۔

مستقر اماموں کے پوشیدہ طور پر دعوتِ حق کا کام کرنے کی حقیقت پر روشنی اس حدیث سے بھی

پڑتی ہے جس میں آنحضرتؐ مولانا علی علیہ السلام سے مخاطب ہیں: ''یَاعَلِیُّ کُنْتَ مَعَ الْاَنْبِیآءِ سِرًّا وَمَعِی جَھْرًا''، یعنی یاعلی آپ (تمام) انبیاء کیساتھ پوشیدہ طور پر تھے اور میرے ساتھ آشکار صورت میں ہیں۔

الغرض حضرتِ خدیجۃ الکبریٰؑ حدودِ دین میں اس عظیم مرتبے پر فائز تھیں، جس میں عالمِ امر اور عالمِ خلق یا عالمِ روحانی اور عالمِ جسمانی دونوں کے حالات چشمِ باطن کے سامنے روشن رہتے ہیں، اس لئے حضرتِ خدیجۃ الکبریٰؑ نورِ معرفت کی روشنی میں آنحضرتؐ کو اپنی اولاد کی طرح پہنچانتی تھیں کہ ان کا مرتبۂ عالی کیا ہے اور کس طرح خدائی پروگرام کے مطابق دینِ حق کے ناطقِ ششم کے مرتبے پر فائز ہونے والے ہیں۔ اس ظاہری و باطنی پس منظر کی روشنی میں مولانا ابو طالبؑ نے آنحضرتؐ کی حضرتِ خدیجۃ الکبریٰؑ سے شادی کرا دی، جس کا خطبہ آپؑ نے خود پڑھا اور خطبے میں اس عظیم مرتبے کی طرف بھی اشارہ فرمایا، جس پر آنحضرتؐ مستقبل میں فائز ہونے والے تھے، خطبہ حسبِ ذیل ہے:

''اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ ھٰذَا الْبَیْتِ الَّذِی جَعَلَنَا مِنْ ذُرِّیَّۃِ اِبْرٰھِیْمَ وَزَرْعِ اِسْمَاعِیلَ وَ ضِئْضِئِ مَعَدٍّ و عُنْصُرِ مُضَرَ، وَجَعَلَنَا حَضَنَۃَ بَیْتِہِ وَسُوَّاسَ حَرَمِہ. وَجَعَلَ لَنَا بَیتًا مَحْجوجًا وَ حَرَمًا آمِنًا. وَجَعَلَنَا الحُکَّامَ عَلَی النَّاسِ وَبَارَکَ لَنَا فی بَلَدِنَا الَّذِی نَحْنُ فِیْہ. ثُمَّ اِنَّ ابنَ اَخِی ھَذَا مُحَمَّدٌ بن عَبْدِاللہ لَایُوْزَنُ بِرَجُلٍ مِنْ قریشٍ اِلّا رَجَحَ بِہ شَرَفًا وَ نُبْلًا و فَضْلًا و عَقْلًا، وَلَا یُقَاسُ بِہ رَجُلٌ اِلَّا عَظُمَ عَنْہ وَلَاعِدْلٌ لَہ فِی الْخَلْقِ وَاِنْ کَان مُقِلًّا فِی الْمَالِ. فَاِنّ الْمَالَ رِفْدٌ حَامِلٌ وَ ظِلٌّ زَائِلٌ وَاَمْرٌ حَائِلٌ وعَارِیَۃٌ مُسْتَرْجِعَۃٌ. وَمُحَمّدٌ مَنْ قَدْ عَرَفْتُمْ قَرَابَتَہ. وَلَہ فِی خَدِیْجَۃٍ رَغْبَۃٌ وَلَھَا فِیْہِ رَغبَۃٌ. وَلَقَدْ جِئْنَاکَ لَنَخْطُبَھَا اِلَیْکَ بِرِضَاھَا وَاَمْرِھَا وَالْمَھْرُ عَلَیَّ فِی مَالِی الَّذِی سَئَلْتُمُوْہُ عَاجِلَۃً وآجِلَۃً. وَلَہ وَرَبِّ ھَذَا الْبَیْتِ بَعْدَ ھَذا نَبَأٌ عَظِیْمٌ وَدِیْنٌ شَایِعٌ وَرَأْیٌ کَامِلٌ وَخَطَرٌ جَلِیلٌ جَسِیْمٌ۔''

مولانا ابو طالب علیہ السلام کے خطبے میں ''وَاِنْ کَانَ مُقِلًّا فِی الْمَال '' یعنی ''اگرچہ مال میں تنگ دست ہیں'' سے ظاہر ہے کہ آنحضرتؐ ظاہری طور پر فکرِ معاش سے آزاد نہیں تھے، لیکن حضرتِ خدیجہؑ کے ساتھ شادی کی برکت سے آپؐ کلّی طور پر فکرِ معاش سے فارغ ہوگئے اور یکسوئی کے ساتھ روحانی ترقی کی طرف توجہ مبذول فرمائی، یہاں تک کہ ناطقِ ششم کے مرتبۂ عالیہ پر فائز ہوگئے۔ حضرتِ خدیجۃ الکبریٰؑ کی بیدریغ مالی قربانیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حضرتِ ربّ العزّت فرماتے ہیں: ''وَوَجَدَکَ عَآئِلًا فَاَغْنٰی'' (۹۳:۸)، یعنی کیا ہم نے تم کو تنگدست پا کر غنی نہیں بنایا؟

آنحضرتؐ جب مرتبۂ ناطق پر فائز ہوئے تو خدا کی طرف سے آپؐ کو دعوتِ حق کا حکم ہوا، آنحضرتؐ نے جب دعوت کا آغاز کیا تو سب سے پہلے حضرتِ خدیجۃ الکبریٰ علیہا السلام نے قبول کیا اور آنحضرتؐ پر ایمان لایا اور آپؐ کی ہرگونہ حمایت فرمائی۔

یہاں پر حضرتِ خدیجۃ الکبریٰؑ، دوسرے حدودِ دین اور مومنین کے ایمان لانے کے سلسلے میں ایک مغالطے کے اصلاح کی ضرورت محسوس ہوتی ہے، عام طور پر یہ غلط تأثر پایا جاتا ہے کہ آنحضرتؐ کی بعثت سے پہلے جزیرۂ عرب میں صرف بُت پرستی تھی اور اس لئے اُس عہد کو عہدِ جاہلیت کہا جاتا ہے، لیکن جس طرح کتبِ دعوت کے علاوہ دوسری کتابوں کے حوالوں سے بھی سطورِ بالا میں ثابت کیا ہے کہ ملّتِ ابراہیمی یا دینِ حنیف کے نام سے مستقر اماموں کی زیرِ ہدایت دعوتِ حق کا کام جاری تھا، اسلئے جاہلیت کی اصطلاح محض کثرت کے لحاظ سے ہے نہ کہ کُلّی طور پر جزیرۂ عرب اہلِ ایمان سے خالی تھا، جس طرح امام جعفر صادقؑ کے فرمان کے مطابق بعثت کے بعد بھی ایک جاہلیت جاری ہے، دونوں میں فرق اتنا بتایا کہ بعثت سے پہلے کفر کی جاہلیت تھی اور بعثت کے بعد کی جاہلیت ضلالت و گمراہی کی۔ اس صورت میں ایک نئے پیغمبر پر ایمان لانے والوں کے دو گروہ ہوئے، ایک وہ جو نئے پیغمبر کو نورِ معرفت کی روشنی میں بعثت سے پہلے ہی اپنے بچوں کی طرح پہچانتا ہے، دوسرا وہ جو پہلے توحید و نبوت کا منکر اور بُت پرست تھا اور بعد میں ایمان لاتا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ ان دو قسم کے ایمان لانے والوں میں زمین آسمان کا فرق ہے، اس صورت میں کوئی حضرتِ خدیجۃ الکبریٰؑ، مولانا ابو طالبؑ، اور مولانا علیؑ کے ایمان لانے کو گروہِ دوم کے صف میں کھڑا کر دے تو یقیناً اس میں بہت بڑا ظلم اور بہت بڑی گمراہی ہوگی، الغرض گروہِ اول کے ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ وہ نئے پیغمبر کی تصدیق اور حمایت کریں، اور حضرتِ خدیجۃ الکبریٰؑ کے ایمان لانے کا تعلق یقیناً اس گروہِ اوّل سے تھا۔

حضرتِ خدیجۃ الکبریٰؑ روحانی اور جسمانی ہر لحاظ سے آنحضرتؐ کے لئے باعثِ سکون و شادمانی تھیں، اور آپ نے مثالی طور پر حقِ رفاقت کو نبھایا، حضرتِ خدیجۃ الکبریٰؑ کے عُلّوِ مرتبت کا اندازہ ان کئی ایک احادیث سے ہوتا ہے جو آنحضرتؐ نے آپؑ کے بارے میں فرمایا ہے، مثلاً ایک حدیث میں فرماتے ہیں: ''تمام دنیا کی خواتین میں چار افضل ترین ہیں، خدیجہؑ بنت خویلد، فاطمہؑ بنتِ محمدؐ، مریمؑ بنتِ

عمران، اور آسیہؑ بنتِ مُزاحم زوجۂ فرعون۔'' ایک اور حدیث میں فرماتے ہیں: ''حمد ہے اُس خدا کی جس نے مجھے خمیر (کی روٹی) کھلائی، ریشم کا لباس پہنایا اور خدیجہ سے میری شادی کرا دی، جن کا مَیں عاشق تھا۔'' آنحضرتؐ کے دل میں حضرتِ خدیجۃ الکبریٰؑ کے لئے جو مثالی احترام اور محبت تھی، اس کے پیشِ نظر ان کے حینِ حیات آپؐ نے دوسری کوئی شادی نہیں کی۔

حضرتِ خدیجۃ الکبریٰؑ کی اولاد: آنحضرتؐ سے شادی کے وقت آپؑ بیوہ تھیں، اس سے پہلے آپؑ کی عتیق بن عائذہ المخزومی اور ابوہالہ بن منذر الاسدی سے یکے بعد دیگرے شادی ہوئی تھی، اور ان سے بالترتیب جاریہ اور ہند دو لڑکیاں تھیں، آنحضرتؐ سے آپؑ کی اولاد کے بارے میں مؤرخین میں اختلاف ہے، لیکن حضرتِ قاسمؑ اور حضرتِ فاطمہؑ کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں، حضرتِ قاسمؑ آنحضرتؐ سے آپؑ کی پہلی نرینہ اولاد تھی، جن کے نام پر آنحضرتؐ نے اپنی کنیت ابوالقاسم اختیار کیا تھا، لیکن آپؑ صغیر سنی میں وفات پاگئے۔ حضرتِ فاطمہؑ آپؑ کی سب سے چھوٹی اولاد تھی، جو آنحضرتؐ کے وصال کے بعد زندہ رہیں۔

آنحضرتؐ کی اولاد میں سے جو سیادت و عظمتِ دوام حضرتِ فاطمۃ الزہراءؑ کو حاصل ہوئی ہے وہ دوسرے کسی کو نصیب نہیں ہوئی۔ آپؑ کو آنحضرتؐ نے جسمانی اہلِ بیت ہونے کے ساتھ روحانی اور نورانی اہلِ بیت میں شامل کیا، جن کی ہر گونہ تطہیر کا قرآنِ کریم سورۂ احزاب کی آیت ۳۳ میں اعلان کرتا ہے۔ حضرتِ فاطمۃ الزہراءؑ کا اس سے بھی بڑا مرتبہ یہ ہے کہ آپؑ کے رحمِ پاک اور مولانا علی علیہ السلام کے صلبِ مبارک سے ختمِ نبوت کے بعد سلسلۂ نورِ امامت کا آغاز ہوا۔

حضرتِ فاطمۃ الزہراءؑ کے اس عظیم مرتبے کے سلسلے میں عارفِ کامل حضرتِ استادِ معظم (علاّمہ نصیرالدّین نصؔیر ہونزائی) قرآنی آیت (۳۳:۴۰) ''مَاکَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِکُمْ وَلٰکِنْ رَّسُوْلَ اللّٰہِ وَ خَاتَمَ النَّبِیّٖنَ– وَکَانَ اللّٰہُ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمًا ''۔ یعنی ''(لوگو!) محمدؐ تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں، مگر وہ اللہ کے رسول اور خاتم النبین ہیں، اور اللہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے۔'' کی تاویل کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''یہاں یہ حقیقت اظہر مِنَ الشّمس ہے کہ آنحضرت پر نُبُوّت تو ختم ہوگئی، مگر حضرتِ علی اور حضرتِ فاطمہ علیہا السّلام سے نورِ امامت کا آغاز ہُوا۔

آنحضرت کا دستور تھا کہ جب فاطمہ علیہا السّلام آتیں تو آپ کھڑے ہو جاتے اور ہاتھ پکڑ کر جبینِ مبارک پر بوسہ دیتے اور اپنے مقام پر بٹھاتے، کیا اس میں آلِ محمّدؐ وَ اَولادِ علیؑ کی امامت و خلافت کا واضح اشارہ نہیں ہے؟'' (خواتینِ قرآن، قسط ۲۷)۔

ایک اور جگہ اسی آیت کی مزید وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ''یہ ایک واضح اور روشن حکیمانہ اِشارہ ہے کہ آنحضرت کا نورِ اقدس حضرتِ فاطمہ علیہا السلام اور حضرتِ علی علیہ السّلام میں منتقل ہوا تھا، جبکہ آلِ ابراہیم اور آلِ محمّد میں خداوندِ تعالیٰ کی طرف سے آسمانی کتاب، حکمت، اور عظیم شاہنشاہی قیامت تک عطا ہوئی ہے (۴:۵۴)۔'' (زندہ حوضِ کوثر، قسط ۲۳۵)۔

حضرتِ فاطمۃ الزہراءؑ کی اس عظیم روحانی و دینی عظمت کے پیشِ نظر جب اولادِ فاطمہؑ ائمۂ اطہار کو ظاہری حکومت کرنے کا موقع ملا تو اس ظاہری حکومت کا نام انہوں نے خلافتِ فاطمیہ رکھا۔ حضرتِ خدیجۃ الکبریٰؑ کی دینِ حق میں اپنے عُلّوِ مرتبت کے ساتھ ساتھ حضرتِ فاطمۃ الزہراءؑ اور انکی اولادِ اطہار یعنی امامانِ برحق کی عظمت و جلالت اور ان کے سماوی و ارضی کارناموں سے بھی آپ بزرگی و سیادت پر روشنی پڑ رہی ہے، اس لئے کہ اس عظیم سلسلۂ انوارِ امامت کا تعلق آپ کے بطنِ مبارک سے ہے۔

حضرتِ خدیجۃ الکبریٰ علیہا السلام کا وصال: ۶۱۹ عیسوی میں حضرتِ مولانا ابو طالب علیہ السلام اور حضرتِ خدیجۃ الکبریٰ علیہا السلام یکے بعد دیگرے رفیقِ اعلیٰ سے ملے، دونوں عظیم ہستیاں روحانی اور جسمانی ہر لحاظ سے آپؐ کی محافظ اور مددگار تھیں، ان کی رحلت سے آپؐ کو بہت صدمہ ہوا اور اس سال کا نام عام الحزن (یعنی غم کا سال) رکھا۔ ان کے وصال کے بعد منکرینِ مکہ نے آپؐ کو بہت اذیت دی اور قتل کرنے کی کوشش کی، لیکن خدائی پروگرام کے مطابق آنحضرتؐ نے یثرب ہجرت فرمائی، یثرب اس کے بعد مدینۃ النبی کے نام سے مشہور ہوگیا اور وہاں سے اسلام کی ترقی شروع ہوئی اور اسلام ایک عالمگیر دین بن گیا، جس کی مولانا ابو طالبؑ نے خطبۃ النکاح میں بشارت دی تھی، آنحضرتؐ بقیہ عمر شریف میں مولانا ابو طالبؑ اور حضرتِ خدیجۃ الکبریٰؑ کو یاد کرتے رہے۔

فقیر محمد ہونزائی

مرکزِ علم و حکمت، لندن

ترجمۂ اقتباس

(از کتاب سرائر واسرارُالنطقاء، ص ۱۱۵-۱۱۶)

رسول اللہ سے مروی ہے: ''معراج کے لئے مجھے جب چوتھے آسمان پر لے جایا گیا تو میں نے علی کو کرسیٔ کرامت (بزرگی کی کرسی) پر بیٹھے ہوئے دیکھا اور فرشتے اُن کے گرد گھیرا ڈالے اُن کی تعظیم، عبادت، تسبیح اور تقدیس کر رہے ہیں، میں نے کہا: میرے دوست جبرائیل! میرے بھائی علی اس مقام تک مجھ سے پہلے پہنچ گئے ہیں۔ جبرائیل نے مجھ سے کہا: یامحمدؐ! فرشتوں نے علی کی بلندی اور بزرگی کو جانتے ہوئے اُن کے (دیدار کے) لئے اپنی شدّتِ شوق کا خدا کے سامنے اظہار کیا اور اُن کو دیکھنے کی درخواست کی۔ تو خدا نے (اُن کی درخواست پر) علی کی صورت پر اس فرشتے کو پیدا کیا اور اُن کی طاعت اُن (فرشتوں) پر لازم کر دیا۔ پس جب اُن کو علی کے دیدار کا شوق ہوتا ہے تو اس فرشتے کی طرف دیکھتے ہیں اور اس کی عبادت، تسبیح اور تقدیس کرتے ہیں۔'' اسی معنی میں خدای عزّ و جلّ فرماتا ہے: ''وَهُوَالَّذِىْ فِى السَّمَآءِ اِلٰهٌ وَّ فِى الْاَرْضِ اِلٰهٌ وَهُوَالْحَكِيْمُ الْعَلِيْمُ'' (۸۴:۴۳)، یعنی وہ (خدا) وہی ہے جو آسمان میں بھی اِلٰہ (معبود) ہے اور زمین میں بھی اِلٰہ (معبود) ہے اور وہ حکمت اور علم والا ہے۔ اور رسول اللہ نے فرمایا: ''علی کے چہرے کی طرف دیکھنا عبادت ہے۔'' اور فرمایا: ''علی کی دوستی ایسی نیکی ہے کہ اس کے ہوتے ہوئے کوئی بدی ضرر نہیں پہنچاتی۔'' پس کونسی عبادت (اُن کی) طاعت سے بڑی ہے اور کونسی طاعت اُن کی طاعت کے بغیر پوری ہوتی ہے۔ اس لئے (خدا کے خالص) بندوں نے ان کی طرف رخ کیا ہے۔

فقیر محمد ہونزائی

مرکزِ علم و حکمت، لندن

ترجمۂ اقتباس

(از کتابِ سرائر واسرار النطقاء، ص ۲۰۰)

توراۃ اور احادیثِ نبوی میں آیا ہے کہ حضرتِ آدم علیہ السلام سے حضرتِ قائم علینا سلامہٗ تک حضرتِ آدم کی اولاد سے خدا کے ایک لاکھ چوبیس ہزار نبی ہوئے ہیں، ان میں سے جن پر خدا کی طرف سے کتاب، قوت، اور تائید نازل ہوئی ہے، وہ کُلّ دس ہیں، جن میں سے پانچ سِریانی اور پانچ عرب ہیں، سِریانی انبیاء میں آدم، شیث، ادریس، نوح، اور ابراہیم علیہم السلام ہوئے ہیں، اور عرب انبیاء میں ہود، صالح، اسماعیل، شعیب، اور محمد علیہم السلام ہوئے ہیں، نبوت کی ابتداء سِریانی انبیاء سے ہوئی اور ختم عرب انبیاء پر ہوئی....

جہاں تک ان کے زمانوں کی مدت [کے تعین] کا تعلق ہے، اس کے بارے میں توراۃ نے جو کچھ بتایا ہے اور جس کی تاریخ نے وضاحت کی ہے، اس کے مطابق حضرتِ آدم علیہ السلام اپنے فرزندِ حضرتِ شیث علیہ السلام کی جانشینی تک نو سو تیس سال زندہ رہے۔ اس کے بعد حضرتِ شیث علیہ السّلام ان کے جانشین ہوئے جن کی دعوت حضرتِ ادریس علیہ السلام کے ظہور تک نو سو سال قائم رہی۔ حضرتِ ادریس کی دعوت تین سو بارہ سال تک قائم رہی، پس یہ سب [ملا کر] دو ہزار ایک سو بیالیس سال ہوئے۔ اور حضرتِ نوح علیہ السلام کی دعوت پچاس کم ایک ہزار سال قائم رہی اور انہوں نے اپنی [مدت] پوری ہونے سے پچاس سال پہلے [حضرتِ سام علیہ السلام کو] ایک داعی

کے طور پر مقرر کیا۔ حضرتِ سام علیہ السلام کی دعوت حضرتِ نوح علیہ السلام کی شریعت کے باطن (تاویل) کی طرف ایک ہزار دو سو بیانوے سال قائم رہی۔ حضرتِ ابراہیم علیہ السلام اور ان کے دَور کے اماموں اور اصحابِ فترت کی دعوت حضرتِ موسیٰ علیہ السلام کے ظہور تک ایک ہزار ایک سو سال اور چار مہینے قائم رہی۔ اور حضرتِ موسیٰ اور ان کے دَور کے اماموں اور اصحابِ فترت کی دعوت ایک ہزار ایک سو اَسی سال، نو مہینے اور اٹھارہ دن قائم رہی۔

فقیر محمد ہونزائی

مرکزِ علم و حکمت، لندن

۱۲، دسمبر ۲۰۰۷ء

ترجمۂ اقتباس

از سرائر واَسرارُالنطقاء، ص ۱۱۶-۱۱۷

اسد الھجری سے مروی ہے کہ اس نے کہا: میں نے امیر المؤمنین علی بن ابی طالب صلوات اللہ علیہ و علی الائمہ من وُلدہ (یعنی ان پر اور ان کی آل سے اماموں پر خدا کا درود ہو) کو اپنے شیعہ اور اصحاب کے ایک محضر میں کہتے ہوئے سنا: ''جس نے میری ولایت کا اقرار نہیں کیا اور میری کما حقہ طاعت نہیں کی، اس نے نہ تو خدا پر ایمان لایا نہ اس کے رسول کی نبوت کا اقرار کیا۔ سلیمان بن داؤد نے خدا سے درخواست کی کہ وہ اس کو ایک ایسا ملک دے کہ وہ اس کے بعد کسی کے شایان نہ ہو، خدا نے اس کی درخواست قبول فرمائی، جنّ و انس اس کے مطیع ہوگئے، اور اس کو پرندوں کی بولی سکھائی گئی اور ہر چیز عطا کی گئی۔ سلیمان اپنے ملک اور جو کچھ اس کو دیا گیا تھا اس کا دلدادہ ہوگیا۔ پس میں نے اس کو اپنی ولایت پیش کی تو اس نے میری ولایت [کے قبول کرنے] میں دیر کی تو خدا نے اس سے اس کا ملک چھین لیا اور ایک جسد کو اس کی کرسی پر ڈال کر اس کا امتحان لیا اور چالیس دن تک اس کی نبوت نہ رہی۔ یہاں تک کہ اس نے مجھ پر ایمان لایا اور میری ولایت کا اقرار کیا تو خدا نے جو کچھ اس سے چھین لیا تھا اس کو واپس کر دیا اور جس بلاء سے اس کا امتحان لیا تھا اس کو دُور کردیا۔

اسی طرح داؤد کو لوگوں کے درمیان فیصلہ کرنے کے لئے فرمایا گیا اور اس نے ایسا کیا اور وہ بھی دلدادہ ہوا اس کا جو اس کے نصیب میں آیا، پس میں نے اس کو بھی اپنی ولایت پیش کی تو اس نے بھی اس کو قبول کرنے میں دیر کی تو خدا نے اس کو بھی اس کے دل میں وسوسہ ڈال کر آزمایا یہاں تک کہ اس نے میری ولایت کا اقرار کیا اور میری طاعت کی طرف لوٹا، رجوع کیا، اور توبہ کی۔

اسی طرح ایوب کے لئے میں نے اپنی ولایت پیش کی اس نے بھی اس کو قبول کرنے میں دیر

کی تو خدا نے اس کو بھی آزمایا اُس بلاء کے ذریعے جس کا اس نے ذکر کیا ہے اور اس سے بہت بڑا امتحان لیا اور اس امتحان پر اس کو صابر پایا، یہاں تک کہ اس نے میری ولایت کا اقرار کیا، پس خدا نے اس بلاء سے اس کو صحت و عافیت عطا فرمائی جس میں اس کو مبتلا کیا تھا اور اس کے ضرّر اور نقصان کو دُور کیا۔

اور اسی طرح یونس کو میں نے اپنی ولایت پیش کی تو اس نے بھی اس کو قبول کرنے میں دیر کی تو خدا نے اس سے مچھلی کے ذریعے امتحان لیا جس نے اس کو نگل لیا، جس طرح خدائے عزّ وجلّ نے فرمایا ہے: ''فَلَوْ لَآ اَنَّهُ كَانَ مِنَ الْمُسَبِّحِيْنَ لَلَبِثَ فِيْ بَطْنِهٖٓ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ''۔ ترجمہ: اب اگر وہ تسبیح کرنے والوں میں سے نہ ہوتا تو روزِ قیامت تک اُسی مچھلی کے پیٹ میں رہتا (۳۷:۱۴۳-۱۴۴)۔ جب اس نے میری ولایت کا اقرار کیا اور میری شناخت کی تو خدا نے اسے اس بلاء سے نجات دی جس میں اس کو مبتلا کیا تھا۔

پس کوئی نبی ایسا نہیں جس کے لئے میں نے اپنی ولایت پیش نہیں کی۔ جس نے اس کے قبول کرنے میں جلدی کی وہ مرسلین میں سے ہوگیا اور جس نے اس کے قبول کرنے اور میرا اقرار کرنے میں دیر کی تو غیر مرسل ہوگیا۔ خبردار رہو کہ میری ولایت ہی خدا کی ولایت ہے اور یہ خدا کے اس قول سے ثابت ہے: ''هُنَالِكَ الْوَلَايَةُ لِلّٰهِ الْحَقِّ ''۔ ترجمہ: اس وقت معلوم ہوا کہ ولایت خدائے برحق ہی کے لئے ہے (۱۸:۴۴)۔ پس یہی میری ولایت ہے، جس نے اس کا اقرار کیا تو یقیناً اس نے خدا کا اقرار کیا اور اس کی وحدانیت کا اعتراف کیا اور محمدؐ کا نبوت کے ساتھ اقرار کیا، اور جس نے انکار کیا تو یقیناً اس نے خدا کا انکار کیا اور اس کو نہ مانا اور اس کے رسول کا انکار کیا اور اس پر ایمان نہیں لایا۔''

ابو ذر جندب بن جنادہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اس نے کہا کہ میں نے امیر المومنین علی بن ابی طالب صلوات اللہ علیہ کو یہ کہتے سنا: ''میں بلاشبہ (حقًّا) خدا کا دین ہوں، میں بلاشبہ خدا کی خوشنودی ہوں، میں بلاشبہ خدا کی توحید ہوں، اور بلاشبہ میں خدا کا نفس ہوں جس کو میرے سوا کوئی نہیں کہتا اور نہ سوائے ایک جھوٹے مدعی کے کوئی اس کا دعویٰ کرتا ہے، اور میں وہ ہوں جس کی خدا

نے تعظیم کی اور اپنی قسم میں فرمایا: ''فَلَآ اُقْسِمُ بِمَوٰقِعِ النُّجُوْمِ وَاِنَّهٗ لَقَسَمٌ لَّوْ تَعْلَمُوْنَ عَظِيْمٌ ''۔ ترجمہ: پس نہیں، مَیں قسم کھاتا ہوں تاروں کے مواقع کی اور اگر تم سمجھو تو یہ بہت بڑی قسم ہے (۵۶:۷۵-۷۶)۔ اور میں اَلعَلِیُّ الکَبِیر (۶۲:۲۲) ہوں، میں خدا کا کان ہوں جس کا ذکر خدا نے کیا اور فرمایا: ''وَتَعِيَهَآ اُذُنٌ وَّاعِيَةٌ ''۔ ترجمہ: اور یاد رکھنے والے کان اس کو یاد رکھے (۱۲:۶۹)۔ اور میں خدا کا پہلو ہوں جس کا ذکر خدا نے کیا اور فرمایا: ''اَنْ تَقُوْلَ نَفْسٌ يّٰحَسْرَتٰى عَلٰى مَا فَرَّطْتُّ فِيْ جَنْبِ اللّٰهِ ''۔ ترجمہ: کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی شخص یہ کہہ دے کہ ہائے افسوس اس کمی کی جو میں نے خدا کے پہلو کے بارے میں کی (۵۶:۳۹)۔ اور میں خدا کا چہرہ ہوں جس کا ذکر خدا نے کیا اور فرمایا: ''فَاَيْنَمَا تُوَلُّوا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ ''۔ ترجمہ: جس طرف بھی تم رُخ کرو گے اُسی طرف اللہ کا چہرہ ہے (۲:۱۱۵)۔ میرا نام قرآن میں''حَکِیْمًا''، تورات میں ''کُلًّا''، انجیل میں ''حَتمًا''، زبور میں ''بَشراً''، اور صحفِ ابراہیم میں ''اولاً و آخراً '' ہے، اور میں غیب سے باخبر ہوں اور جو کچھ ہونے والا ہے اس کو جانتا ہوں، اور عالم میں قدیم ہوں، اور آسمانوں میں بَصِیْر اور زمینوں میں عارف ہوں۔''

پس اے سننے والے مومنو! سوچو! جب معبود کی حقیقت دکھانے والے حدود کی معرفت کے ذریعے حکمتِ بالغہ کا تم پر احسان کیا تو جو کچھ تم سنتے ہو اس پر سوچو اور اس کو یاد کرو اور حفظ کرو، تاکہ شاہد اور مشہود کے قیام سے تمہاری توحید درست ہو جائے اور تم کو ہمیشہ رہنے والے گھر میں داخل کرے۔ اور اولیا کو دوستی کی حقیقت کے ساتھ پہچان لو اور لے پالک اضداد سے بیزاری اختیار کرو تاکہ تم سعادتمندوں میں سے ہو جاؤ۔ پس ولی کی دوستی اس وقت تک کبھی درست نہیں ہو سکتی ہے جب تک اس کے دشمن سے بیزاری اختیار نہ کی جائے۔ پس [ولی کے] اضداد اور دشمنوں سے بیزاری کے بارے میں خدا فرماتا ہے: ''لَاتَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَلَوْكَانُوْآ اٰبَآءَ هُمْ اَوْاَبْنَآءَ هُمْ اَوْ اِخْوَانَهُمْ اَوْ عَشِيْرَتَهُمْ ط اُولٰٓئِكَ كَتَبَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْاِيْمَانَ وَاَيَّدَهُمْ بِرُوْحٍ مِّنْهُ ''۔ ترجمہ: تم کبھی یہ نہ پاؤ گے کہ جو لوگ اللہ اور آخرت پر ایمان رکھنے والے ہیں وہ اُن لوگوں سے محبت کرتے ہوں جنہوں نے اللہ اور اس کے رسولؐ کی مخالفت کی ہے، خواہ وہ ان کے باپ ہوں، یا ان کے بیٹے، یا ان کے بھائی، یا اُن کے اہلِ خاندان۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں میں اللہ نے ایمان ثبت کر

دیا ہے اور اپنی طرف سے ایک روح عطا کرکے ان کی تائید کی ہے (۲۲:۵۸)۔ پس ان کا ایمان قریبی رشتہ داروں سے بیزاری اور دُور کے دشمنوں سے گریز کے بغیر ثابت نہیں ہوتا۔ پس جب ان سے بیزاری ثابت ہو جائے تو خدا ان کی اس روح سے تائید کرے گا جو محبت و دوستی (ولاء) کی حقیقت ہے۔ اور روح کا ذکر اس سے پہلے ہو چکا ہے کہ تأویل کی حقیقت میں وہ کیا ہے۔

فقیر محمد ہونزائی

مرکزِ علم و حکمت، لندن

ترجمۂ اقتباس

از سرائر واسرارُالنُطقاء، صص ۱۰۰-۱۰۳

رسول اللہؐ سے مروی ہے کہ آپؐ نے فرمایا: ''میں بنی عبد المطلّبؑ میں ظاہر ہوا، اور پاکیزہ اصلاب سے پاک ارحام میں منتقل ہوتا رہا، یہاں تک کہ پاکیزہ ترین پودگھر (مَـغْـرِس) اور شریف ترین نسل میں ظاہر ہوا، اور میرے مقابلے میں شیطنت، فرعنت (خود پسندی، تکبر) اور ضدّیت بنی عبد شمس میں ناپاک ترین جائے پیدائش (مَنْبِتْ) اور شریر ترین پودگھر میں ظاہر ہوئی۔'' یعنی پاک و ناپاک دو شاخیں ایک ہی جڑ سے پیدا ہوئیں۔ جیسا کہ آدمؑ کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ پاک و ناپاک دو [قسم کے] گاروں کی آمیزش سے پیدا ہوا تھا، جو ان کے بیٹوں ہابیلؑ اور قابیل [کی صورت میں] جدا ہوئے اور اس جدائی کا سبب حسد تھا۔ چنانچہ عبد العزی (ابولہب) بن عبد المطلّبؑ میں قابیل، عبداللہ بن عبد المطلّبؑ میں ہابیلؑ اور عبد مناف (ابوطالبؑ) بن عبدالمطلّبؑ میں شیثؑ کا ظہور ہوا۔ اور یہ ہر عصر و زمان میں الگ الگ صورتوں اور فطرتوں میں منتقل ہوتے رہتے ہیں، جس طرح ایک شخص اپنی پوشاک میں کپڑے بدلتا رہتا ہے۔ چنانچہ مرتبۂ امامت ایک ہی حال ہے جو اماموں میں ایک کے بعد دوسرے امام میں منتقل ہوتی رہتی ہے۔ زمانوں میں ان کی الگ الگ صورتیں اور نقل و حرکت مختلف رنگوں کے کپڑوں کی طرح ہے، لیکن ان کا پہننے والا ایک ہی ہے۔ یہی حال فرعنت، ضدّیت، شیطنت، اور ابلیسیت کا بھی ہے۔

امامت کی طرح ضدّیت بھی آنحضرتؐ کے ظہور کے وقت تک [مختلف] عصروں اور زمانوں میں منتقل ہوتی آئی ہے۔ رسولؐ کے ظہور کے وقت امامت آپؐ اور آپؐ کے وصیؑ میں ایک حتمی کام کی تکمیل کے لئے تقسیم ہوگئی اور پھر حسینؑ میں اکٹھی ہوگئی اور آپؑ کے بعد کبھی تقسیم نہیں ہوگی، اس لئے کہ یہ آپؑ کی اولاد میں ہمیشہ رہنے والا کلمہ (كَلِمَةً بَاقِيَةً فِي عَقِبِهٖ ۴۳:۲۸) ہے۔ اسی طرح ضدّیت بھی عبد العزی اور عمرو بن ہشام (ابوجہل) میں تقسیم ہوگئی اور عباس بن عبد المطلّبؑ کی اولاد میں اکٹھی

ہوئی، جن سے وہ کبھی جدا نہیں ہوگی۔

پس ہر فرعون اور ضدّ جو کسی ناطق کے عصر یا کسی امام کے زمانے میں حدِّ قوت میں کھڑا ہوگیا اور پھر حدِّ فعل میں ظاہر ہوا تو وہ عبد شمس سے ہے۔ اور ہر امام جو کسی ناطق کے عصر اور دور میں حدِّ قوت سے حدِّ فعل میں آیا تو وہ عبد منافؑ سے ہے۔ یہ حالت قائم، علینا سلامہٗ، کے ظہور کے وقت تک لازمی طور پر قائم رہتی ہے، [ظہورِ قائم، علینا سلامہٗ، کے وقت کے حالات کے بارے میں خدای تعالیٰ فرماتا ہے:] ''هُنَالِکَ تَبْلُوْا کُلُّ نَفْسٍ مَّآ اَسْلَفَتْ وَرُدُّوْآ اِلَی اللّٰهِ مَوْلٰهُمُ الْحَقِّ ۔ اَلَا لَهُ الْحُکْمُ وَهُوَ اَسْرَعُ الْحٰسِبِیْنَ'' (۱۰:۳۰ ؛ ۶:۶۲)۔ ترجمہ: ''وہاں ہر شخص جو کچھ اُس نے پہلے کیا ہے، جانچ لے گا اور وہ سب کے سب اپنے حقیقی مالک کی طرف لوٹا دیئے جائیں گے۔ جان لو کہ حکم کرنا خاص اُسی کے لئے ہے وہ سب سے جلدی حساب کرنے والا ہے۔'' اس وقت ضدّ اور فرعون ہلاک ہو جائے گا اور اس کے آثار آہستہ آہستہ مٹ کر ختم ہو جائیں گے اور ناپاک زائل ہوگا اور پاک باقی رہے گا، جیسا کہ خدائے تعالیٰ نے فرمایا ہے: ''وَیَکُوْنَ الدِّیْنُ کُلُّهٗ لِلّٰهِ'' (۸:۳۹)۔ ترجمہ: ''اور دین سب کا سب اللہ ہی کا ہو جائے۔'' یعنی اس وقت کُلّی اطاعت اس امام کے لئے ہوگی جو جزا اور ثواب و عذاب کا مالک ہے۔ رسولؐ [کی رسالت] کی ابتداء اور اضداد کی بالادستی ''اور جو مکاری وہ کرتے ہیں'' (وَمَا یَمْکُرُوْن ، ۶:۱۲۴) کے بارے میں خدا فرماتا ہے: ''هُنَالِکَ ابْتُلِیَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَزُلْزِلُوْا زِلْزَالًا شَدِیْدًا'' (۳۳:۱۱)۔ ترجمہ: ''وہاں مومنین کی آزمائش کی گئی اور سخت جھنجھوڑے گئے۔''

نیز ظہورِ قائم، زوالِ باطل اور تعطیلِ شرائع کے وقت کے بارے میں فرماتا ہے: ''هُنَالِکَ تَبْلُوْا کُلُّ نَفْسٍ مَّآ اَسْلَفَت'' (۱۰:۳۰)۔ ترجمہ: ''وہاں ہر شخص جو کچھ اُس نے پہلے کیا ہے، جانچ لے گا۔'' یعنی وہ اپنے گزشتہ اعمال کی جانچ پڑتال کریں گے، یعنی ان کے گزشتہ اعمال کے مطابق ان کو بدلہ دیا جائے گا، جیسا کہ خدائے تعالیٰ فرماتا ہے: ''یَوْمَ یَاْتِیْ بَعْضُ اٰیٰتِ رَبِّکَ لَایَنْفَعُ نَفْسًا اِیْمَانُهَالَمْ تَکُنْ اٰمَنَتْ مِنْ قَبْلُ اَوْ کَسَبَتْ فِیْٓ اِیْمَانِهَا خَیْرًا'' (۶:۱۵۸)۔ ترجمہ: ''جس روز تمہارے پروردگار کی بعض آیتیں آ جائیں گی اس روز اس شخص کا ایمان لانا جو اس سے پہلے ایمان نہ لایا ہوگا یا اس نے کوئی نیک عمل نہ کیا ہوگا، اس کو کوئی فائدہ نہیں پہنچائے گا۔'' پس خدای عزّ و جلّ نے بتا دیا کہ اس کے اولیاء اس

کے بندوں سے جو فرمانبردار اور نافرمان، توبہ کرنے والا اور خطاکار، مؤمن اور کافر اور نکوکار اور بدکار ہیں، ان کے اعمال کو دیکھتے، ان کے افعال کو جانتے، ان کے آثار پر ان کو ابھارتے اور ان کے دل کے بھیدوں سے ان کو آگاہ کرتے ہیں۔ کیونکہ وہ (اولیاء) ان پر گواہ، ان کے لئے خدا کے امر کے ستون، اس کی رحمت کے ابواب اور اس کی ناراضگی و سزا کا سبب ہیں۔ جو ان کو چاہتے اور ان سے معافی مانگتے ہیں تو ان کے لئے مغفرت طلب کرتے ہیں اور جو ان سے دشمنی رکھتے اور ان کا انکار کرتے ہیں ان کے لئے وہ عذابِ واقع (ہونے والا عذاب، ۷۰:۱) ہیں۔ جس پر وہ رحمت کریں تو وہ مرحوم (رحمت رسیدہ) ہے اور جس پر لعنت کریں وہ ملعون ہے۔ کیا خدا نے نہیں فرمایا ہے؟: ''اَلَّذِیْنَ یَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ وَمَنْ حَوْلَهٗ یُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَیُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَیَسْتَغْفِرُوْنَ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَا وَسِعْتَ كُلَّ شَیْءٍ رَّحْمَةً وَّ عِلْمًا فَاغْفِرْ لِلَّذِیْنَ تَابُوْا وَاتَّبَعُوْا سَبِیْلَكَ وَقِهِمْ عَذَابَ الْجَحِیْمِ – رَبَّنَا وَاَدْخِلْهُمْ جَنّٰتِ عَدْنِ الَّتِیْ وَعَدْتَّهُمْ وَمَنْ صَلَحَ مِنْ اٰبَآئِهِمْ وَاَزْوَاجِهِمْ وَذُرِّیّٰتِهِمْ ط اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ – وَقِهِمُ السَّیِّاٰتِ ط وَمَنْ تَقِ السَّیِّاٰتِ یَوْمَئِذٍ فَقَدْ رَحِمْتَهٗ ط وَذٰلِكَ هُوَالْفَوْزُ الْعَظِیْمُ'' (۴۰:۷-۹)۔ ترجمہ: ''جو فرشتے عرش کو اُٹھائے ہوئے ہیں اور وہ جو اس کے ارد گرد ہیں، وہ اپنے پروردگار کی حمد کے ذریعے تسبیح کرتے ہیں، اس پر ایمان رکھتے ہیں اور مومنوں کے لئے استغفار کرتے ہیں (اور یہ کہتے ہوئے) پروردگارا! تیری رحمت اور علم سب چیزوں پر حاوی ہیں، تو ان لوگوں کی مغفرت فرما جنہوں نے توبہ کی اور تیرے راستے پر چلے اور تو انہیں جہنم کے عذاب سے محفوظ فرما۔ پروردگارا! تو انہیں بہشتِ عدن کے باغوں میں داخل فرما جن کا تو نے اُن سے وعدہ کیا تھا اور اسی طرح ان کے آبا و اجداد، ازواج و اولاد سے جو لوگ نیک ہیں ان کو بھی (بخش دے)۔ بیشک تو ہی زبردست (اور) حکمت والا ہے۔ اور انہیں برائیوں سے بچا۔ اور جسے تو نے اس دن کی برائیوں سے بچا لیا تو اُسے اپنی رحمت میں شامل فرما لیا، اور یہی تو عظیم کامیابی ہے۔'' یعنی حاملانِ عرش اور جو اس کے گردا گرد ہیں، ان سے خدا کی مراد اس کے پاک اولیاء ہیں۔ اور خدا نے ان کا ذکر کیا ہے، جس طرح ان لوگوں کا ذکر کیا ہے جن پر اس کی سزا اور لعنت اتری ہے۔ چنانچہ فرمایا ہے: ''قُلْ اَرَءَیْتُمْ اِنْ كَانَ مِنْ عِنْدِاللّٰهِ ثُمَّ كَفَرْتُمْ بِهٖ مَنْ اَضَلُّ مِمَّنْ هُوَفِیْ شِقَاقٍ بَعِیْدٍ'' (۴۱:۵۲)۔ ترجمہ: ''کہہ دو: مجھے بتاؤ اگر یہ (قرآن) اللہ کی طرف سے ہو اور تم اس کا انکار کرو تو

اس شخص سے بڑھ کر کون گمراہ ہوگا جو دُور کی مخالفت میں پڑا ہوا ہے۔'' نیز فرمایا ہے: ''وَلَوْ تَرآی اِذْوُقِفُوْا عَلَی النَّارِ فَقَالُوْا یٰلَیْتَنَا نُرَدُّ وَلَانُکَذِّبُ بِاٰیٰتِ رَبِّنَا وَنَکُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ '' (۲۷:۶)۔ ترجمہ: ''اگر تم (ان کی حالت) دیکھو جس وقت آگ کے سامنے کھڑے ہوئے کہتے ہیں کہ کاش ہم (دوبارہ دنیا میں) لوٹا دیئے جاتے اور اپنے پروردگار کی آیتوں کی تکذیب نہ کرتے اور مومنین میں سے ہو جاتے۔'' انہوں نے دنیا میں واپس آنے کو طلب کیا جبکہ وہ اولیاء کو جھٹلاتے رہے تو نہ تو ان کی دعا سنی گئی اور نہ ان کی آواز کو قبول کیا گیا بلکہ ان کو عذاب میں ذلیل کیا گیا اور ان پر لعنت بھیجی گئی۔

پس زمانوں کے شروع سے آخر تک جزا اور خوشی کے ساتھ ظہورِ [قائم] کے وقت تک خدا کی یہ سنت رہی ہے، چنانچہ خدا فرماتا ہے: ''قُلْ ھَلْ نُنَبِّئُکُمْ بِالْاَخْسَرِیْنَ اَعْمَالًا – اَلَّذِیْنَ ضَلَّ سَعْیُھُمْ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَ ھُمْ یَحْسَبُوْنَ اَنَّھُمْ یُحْسِنُوْنَ صُنْعًا – اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا بِاٰیٰتِ رَبِّھِمْ وَلِقَآئِہٖ فَحَبِطَتْ اَعْمَالُھُمْ فَلَانُقِیْمُ لَھُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ وَزْنًا'' (۱۸:۱۰۳-۱۰۵)۔ ترجمہ: ''کہہ دو: کیا ہم تمہیں خبر دیں کہ سخت زیادہ خسارے میں کون لوگ ہیں؟ وہ لوگ جن کی ساری کوششیں دنیوی زندگی میں بھٹک کر رہ گئی ہیں اور اس کے باوجود وہ سمجھتے ہیں کہ وہ اچھے کام انجام دے رہے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے پروردگار کی آیات اور اس کی ملاقات کا انکار کیا ہے، اسی بناء پر ان کے سارے اعمال اکارت ہوگئے ہیں، لہٰذا قیامت کے دن ان کے لئے ہم میزانِ حساب قائم نہیں کریں گے۔'' پس خدا نے بتایا کہ اعمال کے خسارے [کا سبب] اماموں کا انکار ہے۔

نیز فرماتا ہے: ''فَلَمَّا جَآءَ تْھُمْ اٰیٰتُنَا مُبْصِرَۃً قَالُوْا ھٰذَا سِحْرٌ مُّبِیْنٌ – وَجَحَدُوْا بِھَا وَاسْتَیْقَنَتْھَآ اَنْفُسُھُمْ ظُلْمًا وَّ عُلُوًّا ط فَانْظُرْ کَیْفَ کَانَ عَاقِبَۃُ الْمُفْسِدِیْنَ '' (۲۷:۱۳-۱۴)۔ ترجمہ: ''اور جب ہماری آنکھیں کھول دینے والی آیات ان کے پاس آئیں تو انہوں نے کہا: یہ تو کھلا جادو ہے۔ اور انہوں نے ان آیات کا ظلم و تکبر سے انکار کیا باوجودیکہ ان کو ان آیات کا یقین تھا۔ دیکھئے مفسد لوگوں کا کیا انجام ہوا۔'' پس آیاتِ مبصرہ سے مراد امیر المؤمنین علیؑ، وصیٔ رسول اللہ، اور اساسِ دین ہیں، جن کو انہوں نے ''سِحْرٌ مُّبِیْنٌ'' (کھلا جادو) قرار دیا، یہ مراد لیتے ہوئے کہ جادو باطل ہوتا ہے اور اپنا وجود برقرار نہیں رکھ سکتا، اور ان کا انکار کیا، ان کی امامت کو تسلیم نہیں کیا، ان کے مرتبے کو غصب کیا، اور ان

کی منزلت کا دعویٰ کیا۔ پس انہوں نے جو کچھ کیا اس کی وجہ سے وہ ظالمین تھے۔

رسول اللہؐ سے مروی ہے کہ آپؐ نے فرمایا: ''اِذَا ثُبِتَ الحَسَدُ وَالْحِقْدُ فِی سَوَادِ الْقَلْبِ مَحَیَا عَنْہُ رُسُومَ الرَّحمَۃِ والْاِیمانِ وَ مَلِئَاہ غَدْرًا و کُفْرًا '' ترجمہ: ''جب دل کے نقطۂ سیاہ میں حسد اور کینہ جم جائیں تو وہ دونوں وہاں سے رحمت اور ایمان کے نشانات مٹاتے ہیں اور اس کو غدر اور کفر سے بھر دیا جاتا ہے۔''

جب امیر المومنینؑ سے ان کے شیعہ کے بارے میں پوچھا گیا کہ عرصۂ قیامت میں ان کا کیا حال ہے تو آپؑ ہنسے اور فرمایا: ''اِذَا کَانَ یَوْمُ الْقِیَامَۃِ جَآءَ شِیْعَتُنَا وَمُحِبُّونَا صَفًّا صَفًّا کَمَا یَجِیُٔ الطَّیْرُ اِلَی اَعْشَا شِھَا وَ مَعَھُمْ لِوَاءٌ یُعْرَفُونَ بِہِ یَدْخُلُوا الْجَنَّۃَ بِلَا وُقُوفٍ وَلَا حِسَابٍ''۔ ترجمہ: ''جب قیامت کا دن ہوگا تو ہمارے شیعہ اور دوستدار قطار کے قطار آئیں گے، جس طرح پرندے اپنے گھونسلوں کی طرف آتے ہیں اور ان کے ساتھ ایک علم ہوگا جس کے ذریعے وہ پہچانے جائیں گے، یہاں تک کہ کسی روک ٹوک اور حساب کے بغیر بہشت میں داخل ہوں گے۔'' اس وقت اُمّتیں پوچھیں گی کہ کون ہیں یہ لوگ جن کو خدا نے اپنی رحمت سے ڈھانپ دیا ہے اور عزت کے ساتھ ان کی طرف توجہ دی ہے۔ اس وقت کہا جائے گا کہ یہ علیؑ اور ان کی اولاد سے اماموں کے شیعہ ہیں، تو اسوقت وہ کہیں گے: اے کاش! ہم خاک ہوتے، یعنی علی پر ایمان لانے والے ہوتے، جس طرح انہوں نے آپؑ پر ایمان لایا ہے۔ بخدا! یہ کہنا بعینہٖ وہی ہے جو خدا فرماتا ہے: ''وَیَقُولُ الْکٰفِرُ یٰلَیْتَنِیْ کُنْتُ تُرٰبًا '' (۷۸:۴۰)۔ ترجمہ: ''اور کافر کہتا ہے کہ اے کاش میں خاک ہوتا۔''

فقیر ہونزائی

مرکزِ علم و حکمت، لندن

۱۴، جنوری ۲۰۰۸ء

بزرگانِ دین کی دستیاب کُتب کی فہرست

سیّدنا منصور الیمن

۱ ۔ کتاب العالم والغلام
۲ ۔ کتاب الرشد والهداية

سیدنا جعفر بن منصور الیمن

۱ ۔ کتاب الکشف
۲ ۔ اسرارُالنُّطقاء
۳۔ سرائر النُّطقاء
۴۔ الشواهد والبيان
۵ ۔ تأويل الزّكوٰة
۶ ۔ الفَتَرات و القِرانات
۷۔ الفرائض و الحدود
۸۔ الرّضاع فی الباطن
۹ ۔ تأويل الحروف المعجمة
۱۰ ۔ تاويل سورة النساء

ابوحاتِم الرّازی

۱ ۔ اعلام النّبوة
۲ ۔ کتاب الزّينة
۳۔ کتاب الاصلاح

ابویعقوب السجستانی

۱ ۔ اثبات النّبوة
۲ ۔ کتاب الموازين
۳۔ تحفة المستجيبين
۴۔ کتاب الافتخار
۵ ۔ سُلّم النجاة
۶ ۔ الينابيع
۷۔ المقاليد الملكوتيّة
۸۔ المبداء والمعاد

٩ ـ مُسلِية الاحزان
١٠ ـ كتاب الواعظ
١١ ـ الرّسالة الباهرة
١٢ ـ الكتاب الغريب فى معنى الاكسير
١٣ ـ مؤنس القلوب
١٤ ـ رسالة فى تأليف القلوب
١٥ ـ رسالة الامن من الحيرة
١٦ ـ كشف المحجوب
١٧ ـ تثبيت الامامة لمولانا علىٍّ
١٨ ـ الوصيّة

قاضى نعمان

١ ـ دعائم الاسلام
٢ ـ مختصر الآثار
٣ ـ تأويل الدعائم
٤ ـ الينبوع
٥ ـ كتاب الاخبار
٦ ـ الاقتصار
٧ ـ القصيدة المنتخبة
٨ ـ كتاب يوم وليلة
٩ ـ كتاب الطهارة
١٠ ـ اختلاف اصول المذاهب
١١ ـ اساس التأويل
١٢ ـ افتتاح الدعوة
١٣ ـ المناقب والمثالب
١٤ ـ شرح الاخبار
١٥ ـ المجالس و المسايرات
١٦ ـ الهمّة فى آداب اَتباع الأئمّة
١٧ ـ مفاتيح النعمة
١٨ ـ تأويل الرؤيا
١٩ ـ الايضاح
٢٠ ـ اختصار الايضاح
٢١ ـ الاتفاق و الافتراق
٢٢ ـ المقتصر
٢٣ ـ كيفيّة الصّلاة
٢٤ ـ منهاج الفرائض
٢٥ ـ نهج السّبيل الى معرفة علم التّاويل
٢٦ ـ حدود المعرفة فى تفسير القرآن والتنبيه على التأويل
٢٧ ـ كتاب فى الامامة
٢٨ ـ التعاقب / التعقب والانتقاد
٢٩ ـ كتاب الدّعاء

٣٠ـ كتاب الحُلى و الثياب

٣١ـ كتاب الشُّروط

٣٢ـ ذات المنن

٣٣ـ معالم المهدى

٣٤ـ منامات الائمّة

٣٥ـ الرّسالة الىٰ المرشد الدّاعى بمصر فى تربية المؤمنين

ابن هانئ الاندلسى

١ ـ ديوان

الامير تميم بن معدّ

١ ـ ديوان

المنصور الجوذرى

١ ـ سيرة استاذ جوذر

يعقوب الوزير بن يوسف بن كِلّس

١ ـ منسک الحج الاکبر

٢ ـ كتاب الفقّه

محمّد بن زيد

١ ـ كتاب البلاغ

حسن/محسن بن محمّد المهيدى

١ ـ رسالة الىٰ جماعة اهلِ رَىّ

سیّدنا احمد بن ابراهیم النیسا بوری

١ ـ اثبات الامامة

٢ ـ استتار الامام عبد الله بن محمّدٌ

٣ـ الظّاهرة فی معرفة الدّار الآخرة

۴ـ الموجزة الکافیة فی آداب / شروط الدعوة والحدود

ابوالفوارس احمد بن یعقوب

١ ـ الرّسالة الامامة

٢ ـ دیوان

٣ـ ارجوزة

سیّدنا حمید الدّین احمد الکرمانی

١ ـ راحة العقل

٢ ـ المصابیح فی اثبات الامامة

٣ـ معاصم الهدی

۴ـ تنبیه الهادی والمستهدی

۵ـ الاقوال الذهبیّة

٦ ـ معالم الدّین / الرسالة الوضیّة

٧ـ الرّیاض

٨ـ الدریّة فی معرفة التوحید

٩ ـ رسالة النظم فی مقابَلة العوالم

١٠ ـ خزائن الاولّة / کتاب الخزائن

١١ ـ اللّازمة فی صوم شهر رمضان

١٢ ـ الرّوضة فی الازل

١٣ ـ الزّاهرة

١۴ ـ الحاویة فی اللّیل وَالنّهار

١۵ ـ مباسم البشارات

١٦ ـ الرّسالة الواعظة

١٧ ـ الکافیة فی الرّد علی الهارونی الحسنی

١٨ ـ الرسالة الرضیّة فی الامر و الآمر و المأمور

ابوعبدالله محمّد القضاعی

١ ـ کتاب الشهاب النبوی / شهاب الاخبار فی الحکم

٢ ـ دستور معالم الحکم

سیّدنا المؤیّد فی الدّین ابو نصرهبة الله الشیرازی

۱۔ المجالس المؤیّدیّة
۲۔ دیوان
۳۔ سیرة المؤیّد فی الدّین
۴۔ شرح المعاد
۵۔ تأویل الارواح
۶۔ الاسکندریّة
۷۔ نهج العبادة / نهج الهدایة للمؤمنین
۸۔ الایضاح والتبصیر فی فضل یوم الغدیر
۹۔ الابتداء والنتهاء
۱۰۔ بنیاد تأویل

سیّدنا ناصر خسرو علوی

۱۔ وجه الدّین
۲۔ زاد المسافرین
۳۔ جامع الحکمتین
۴۔ خوان الاِخوان
۵۔ گشایش و رهایش
۶۔ شش فصل
۷۔ سفرنامه
۸۔ دیوانِ اشعار
۹۔ روشنائی نامه
۱۰۔ رساله در جواب نود ویک فقره

رئیس حسن

۱۔ دیوانِ قائمیّات
۲۔ هفت باب بابا سیّدنا

خواجه نصیرالدّین طُوسی

۱۔ روضۂ تسلیم
۲۔ سیروسلوک
۳۔ رساله در تولی و تبرّا
۴۔ مطلوب المؤمنین

حکیم نزاری قهستانی

۱ ـ دیوان
۲ ـ ادب نامه
۳ـ مثنوی
۴ـ سفرنامه
۵ـ دستورنامه
۶ ـ ازهر و مُزهر
۷ـ رباعیّات

ابواسحاق قهستانی

۱ ـ هفت باب

سیّد سهراب ولی بدخشانی

۱ ـ صحیفة الناظرین

خیر خواه هرّاتی

۱ ـ کلام پیر / هفت باب شاه سیّد ناصر
۲ ـ رسالهٔ خیرخواه
۳ـ قطعات
۴ـ دیوان غریبی
۵ـ فصل دربیانِ شناختِ امام

امام قلی خاکی خراسانی

۱ ـ دیوان
۲ ـ نگارستان
۳ـ ترجیع مند
۴ـ بهارستان
۵ـ طلوع الشّمس

علی قلی رقّامی دیزبادی

۱ ۔ دیوان

۲ ۔ قصیدۂ ذریّۃ

پیر شہاب الدّین شاہ الحسینی

۱ ۔ خطاباتِ عالیہ

۲ ۔ رسالۂ درحقیقت دین

۳۔ نصائح سرکار پیر

تیار کردہ:

فقیر ہونزائی

مرکزِ علم و حکمت، لندن

۱۶، جنوری ۲۰۰۸ء

دربارهٔ "دهر"

دهر چیست؟ جواب فلسفی: دهر بقاءِ مطلق است مر ارواحِ مجرّد را کآن بزیر اجسام نیست، ومرآن را فساد و فنا نیست. ونیز گفتند که دهر بقاء زنده دارندهٔ ذات خویش است. یعنی آنچه زندگی [او] از ذات او باشد نمیرد وبقاء آنچه نمیرد دهر است. وگفتند که زمان دهرِ متحیّز است وآن بقاء اجساد است.

جواب اهل تائید یعنی امامان برحق که حکماءِ دین حق اند: دهر بقاء جوهر سرمدی است و جوهرِ سرمدئ اوّلی عقلِ کُلّی است، وبقاء او دهر است. وچنانک دهر اندر افق عقل است، زمان اندر افق نفسِ کُلّی است، اعنی علّت دهر عقل است، چنانک علّت زمان نفس است.

وبرهان برآنکه دهر بقاء بی مرگ است آن است که زمان روز بروز می گذرد [که] بقاء زندهٔ میرنده است. وچون بقاء زندهٔ میرنده زمان گذرنده باشد، واجب آید که بقاء زندهٔ نامیرنده که آن نفس است و عقل، بقاء سرمدی باشد ناگذرنده، ونام آن دهر است.

وقولی مختصر بر اظهار دهر و زمان و تفصیل ایشان از یکدیگر آنست که گوییم: زمان از دهر بحرکات فلک پیموده است که نام آن روز و شب وماه وسال وجز آنست، ودهر زمان ناپیموده که مر اورا آغاز وانجام نیست، بل دهر زمانِ درنک وبقاءِ مطلق است. وامّا برهان برآنک جوهر نفس میرنده نیست وبقاءِ او دهر است، وبقاءِ مطلق است أزلی و أبدی، آنست که گوییم: جسد مازنده است روزکاری، وباز زندگی ازو همی بشود. پس دانستیم که زندگی جسد ما عرضیست، آنکه گوییم: هر معنیی که آن بعرض اندر چیزی پدید آید، آن معنی اندر چیزی دیگر جوهری باشد، وآن چیز که آن معنی مر اورا جوهری باشد، پیش از آن چیز باشد بوجود، از آن چیز که آن معنی اندرو بعرض پدید آید،

چـنـانـکـ هـمی بینیم که گرمی عرضی اندر آهن پدید همی آید از آتش، وچو آتش ازو جدا نشـود گـرمـی عـرضـی ازو پـدیـد هـمـی آید، آن آتش را گرمی جوهریست؛ وتا آتش بآهن پیـوستـه اسـت گـرمـی عـرضـی از آهن زایل نشود. وچو آتش جدا شود گرمی عرضی ازو زایـل شـود. وچو ظاهر کردیم که معنی عرضی اندر چیزی از چیزی آید که آن معنی اندرو جـوهـری بـاشد، وجسد مارا زندگی عرضی بوَد، نتیجه ازین مقدّمات برهانی آن آید که آن چیـز کـه جسـد مـا ازو بـزنـدگـی عـرضـی زنـده بوَد، زندگی او جوهریست. وآنچ زندگی او جـوهـری بـاشـد مـر اورا مـرگـ نباشد. پس نفس که زندگی جسد ما بدوست بجوهر و ذات خـویـش زنـده اسـت نـه بـچیـزی دیـگـر. و چـو بجوهر خویش زنده است، هرگز نمی میرد، وجـوهـر کـه نـمیـرد بـقـاءِ او دهـر اسـت، چـنـانـکـ بقاءِ جسد - که زندگی او عاریتی است- زمـانـست؛ لا جرم نفس بوجود پیش از جسمست، چنانکـ آتش بوجود پیش از آهن است. وگفتند که عقل بادهر معاً است، یعنی پیشی و سپسی نیست مر عقل را بادهر.

[سیـدنـا حـکیـم پیـر نـاصـر خسرو، جامِعُ الحِکمَتین، صص، ۱۱۲-۱۱۳، ۱۱۸-۱۱۹؛ رسالهٔ حکمتی، صص، ۵۲۳-۵۲۵].

”دھر“ کے بارے میں

دہر کیا ہے؟ فلسفیوں کا جواب: دہر بقائے مطلق ہے اُن مجرّد روحوں کا جو اجسام کے نیچے نہیں اور نہ اُن کے لئے فساد اور فنا ہے۔ نیز انہوں نے کہا: دہر اپنی ذات کو زندہ رکھنے والے کی بقا ہے، یعنی وہ جس کی زندگی اپنی ذات سے ہو، وہ نہیں مرتا اور اس کی بقا جو نہیں مرتا ہے، دہر ہے۔ نیز انہوں نے کہا کہ زمان دہر متحیّز ہے اور وہ اجسام کی بقا ہے۔

اہلِ تائید یعنی امامانِ برحق جو حکمای دینِ حق ہیں، کا جواب: دہر جوہرِ سرمدی کی بقا ہے اور اوّلین جوہرِ سرمدی عقلِ کُلّی ہے اور اُس کی بقا دہر ہے، اور جس طرح دہر عقل کے اُفق میں ہے، اسی طرح زمان نفسِ کُلّی کے افق میں ہے، یعنی دہر کی علّت عقل ہے جس طرح زمان کی علّت نفس ہے۔

اور اس بات کی برہان کہ دہر بغیر موت کی بقا ہے، یہ ہے کہ زمان دن بدن گزرتا جاتا ہے جو زندۂ میرندہ کی بقا ہے، اور جب زندۂ میرندہ کی بقا زمانِ گزرندہ ہے تو لازم آتا ہے کہ زندۂ نامیرندہ جو کہ نفس اور عقل ہیں، کی بقا سرمدی اور ناگذرندہ ہو، اور بقائے سرمدی کا نام دہر ہے۔

دہر اور زمان کی حقیقت اور ان کے آپس میں جو فرق ہے اُس کو ظاہر کرنے کے لئے مختصر بیان یہ ہے کہ زمان دہر کا (وہ حصہ) ہے جس کو آسمان کی حرکتوں سے ناپا گیا ہے، جس کا نام دن، رات، ماہ، سال وغیرہ ہے، جبکہ دہر وہ زمان ہے جس کو ناپا نہیں گیا ہے اور اس کا کوئی آغاز و انجام نہیں بلکہ وہ ابدی (درنگ) زمان اور بقائے مطلق ہے۔

اس حقیقت کی برہان کہ جوہرِ نفس میرندہ نہیں بلکہ اس کی بقا دہر اور بقائے مطلق ہے جو ازلی و ابدی ہے، یہ ہے کہ ہمارا جسم کچھ وقت کے لئے زندہ رہتا ہے، پھر زندگی اس سے چلی جاتی ہے، اس سے ہمیں یہ معلوم ہوا کہ ہمارے جسم کی زندگی عرضی ہے اور ہر وہ معنی جو ایک چیز میں عرضی طور پر پیدا ہو جائے دوسری ایک چیز میں جوہری طور پر ہوتی ہے اور وہ چیز جس میں یہ معنی جوہری ہو، اس سے پہلے موجود ہوتی ہے، جس میں یہ عرضی ہو، جس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ آگ سے لوہے میں عرضی

گرمی پیدا ہوتی ہے اور جب تک آگ اس لوہے سے ملا ہوا ہے عرضی گرمی اس سے زایل نہیں ہوتی، اور جب آگ کو اس سے الگ کیا جائے تو عرضی گرمی اس سے زایل ہوتی ہے۔ جب ہم نے یہ ظاہر کر دیا کہ عرضی معنی ایک چیز میں اس چیز سے پیدا ہوتی ہے جس میں یہ جوہری ہو، اور ہمارے جسم کی زندگی عرضی ہے تو ان برہانی مقدمات سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اس چیز کی زندگی جس سے ہمارا جسم عرضی زندگی سے زندہ ہے، جوہری ہے، اور جس چیز کی زندگی جوہری ہو اس کو موت نہیں۔ پس نفس جس سے ہمارے جسم کی زندگی ہے، اپنے جوہر اور ذات سے ہے نہ کسی اور چیز سے، اور چونکہ یہ اپنے جوہر سے زندہ ہے اس لئے اس کو ہرگز موت نہیں اور جو جوہر کبھی نہیں مرتا اس کی بقا دہر ہے، جس طرح جسم کی بقا جو عاریتی زندگی ہے، زمان ہے، پس لازماً نفس وجود میں جسم سے پہلے ہے، جس طرح آگ وجود میں لوہے سے پہلے ہے۔ نیز فرمایا گیا ہے کہ عقل دہر کے ساتھ ہے یعنی عقل اور دہر میں پیشی و پسی نہیں۔ [سیدنا حکیم پیر ناصر خسرو، جامع الحکمتین، صص، ۱۱۲-۱۱۳، ۱۱۸-۱۱۹؛ رسالۂ حکمتی، صص، ۵۶۳-۵۶۵]۔

مشکل الفاظ کے معانی:

آغاز = ابتدا	علّت = سبب
انجام = انتہا	فساد = تباہی، خرابی، بگاڑ
برہان = وہ دلیل جس میں شک نہ ہو	فنا = نیستی، موت
بقا = زندگی	گذرندہ = گزرنے والا
جوہر = وہ چیز جو بذاتِ خود قائم ہو	متحیّز = گھرا ہوا، محدود
درنگ = ابدی، دائمی	مجرّد = غیر مادی وہ شی جو مادہ سے پاک ہو
زایل = دُور یا الگ ہونے والا	مطلق = آزاد، بالکل
سرمدی = ناگذرندہ	میرندہ = مرنے والا
عرض = وہ چیز جو دوسری چیز کی وجہ سے قائم ہو	ناگذرندہ = نہ گزرنے والا

پنساری اور طوطے کے تیل گرانے کی کہانی

ایک پنساری تھا اور اس کا ایک خوبصورت اور خوشگو طوطا تھا، جو اُس کی غیر موجودگی میں دُکان کی حفاظت کرتا اور گاہکوں سے میٹھی میٹھی باتیں کرتا تھا۔ ایک دن پنساری گھر گیا تھا اور یہ دُکان پر اکیلا تھا کہ ایک بلّی نے ایک چوہے کی خاطر چھلانگ لگائی تو اس نے بھی اپنی جان کے خوف سے بھاگنے کے لئے چھلانگ لگائی، اس سے وہ تیل کی بوتلوں سے ٹکرا گیا جس سے بوتلیں گر گئیں اور ان سے تیل بہہ گیا۔

اتنے میں پنساری گھر سے آیا، دیکھا کہ دُکان میں تیل گرا ہوا ہے تو اس نے طوطے کے سر پر دے مارا تو اس سے اس کا سر گنجا ہوگیا۔ اس سے طوطے نے بولنا بند کردیا اور پنساری کی بہت کوششوں کے باوجود نہیں بولا۔

تین دن کے بعد پنساری دُکان پر بیٹھا ہوا تھا کہ وہاں سے ایک گنجا قلندر گزرا۔ گنجے قلندر کو دیکھ کر طوطے نے چیخ کر کہا: ''اے گنجے! کس سبب سے تو گنجوں میں شامل ہوا؟ شاید تو نے بھی بوتلوں سے تیل گرایا ہوگا۔'' طوطے کے اس قیاس سے لوگوں کو ہنسی آئی کہ اس نے گنجا ہونے کی مشابہت کی وجہ سے قلندر کو اپنا جیسا سمجھا حالانکہ ایک انسان اور ایک پرندے میں زمین آسمان کا فرق پایا جاتا ہے۔

اس تمثیلی کہانی میں مولای رومی لوگوں کو آگاہ کرتے ہیں کہ جس طرح طوطے نے اپنے اور قلندر کے گنجا ہونے کی ایک صفت کو دیکھ کر قلندر کو اپنا جیسا سمجھا، اسی طرح دنیا کے بہت سے لوگ انبیا، اولیا، اور عارفانِ حق کو جسمانی شکل و شباہت اور کھانے پینے کی صفات کو دیکھ اپنے جیسے سمجھتے ہیں۔ اس خطرے سے حقیقت کی تلاش کرنے والوں کو بچانے کے لئے آپ نے کئی مثالوں سے ثابت کر دکھایا ہے کہ ظاہر اور باطن میں کتنا فرق ہے۔ انسانوں میں جو فرق پایا جاتا ہے وہ ظاہر کی وجہ سے نہیں بلکہ باطن کی وجہ سے ہے جس کی کئی مثالیں یہاں پر دی گئی ہیں۔ اس فرق کو سمجھنے

کے لئے کم سے کم علم الیقین کی روشنی کی سخت ضرورت ہے۔ مثالیں اشعار کی صورت میں ملاحظہ ہوں:

؎ کارِ پاکان را قیاس از خود مگیر + گرچه ماند در نبشتن شیر وشیر

پاک لوگوں کے کام کو اپنے پر قیاس نہ کرو اگرچہ شیر اور شِیر (دودھ) لکھنے میں ایک جیسے لگتے ہیں۔

؎ جمله عالم زین سبب گمراه شد + کم کسی ز ابدالِ حق آگاه شد

اس وجہ سے تمام جہان گمراہ ہوگیا اور بہت کم لوگ خدا کے ابدال (یعنی اولیا) سے آگاہ ہوئے۔

؎ هَمسری با انبیا برداشتند + اولیارا همچو خود پِنداشتند

انہوں نے انبیا کے ساتھ برابری کی اور اولیا کو اپنا جیسا سمجھا۔

؎ گفته اِینَک مابشرایشان بشر + ما وایشان بستهٔ خوابیم و خور

انہوں نے کہا دیکھو ہم بھی بشر ہیں اور یہ بھی بشر، ہم اور یہ دونوں سونے اور کھانے سے بندھے ہوئے ہیں۔

اس شعر میں ان آیات کی طرف اشارہ ہے: ''اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا ـ'' یعنی نہیں ہو تم سوائے ہمارے جیسے بشر (۱۴:۱۰)، اور: ''مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَأْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِيْ فِي الْاَسْوَاقِ ـ'' یعنی یہ کیسا رسول ہے جو کھانا کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے (۲۵:۷)۔

؎ این ندانستند ایشان از عَمَیٰ + هست فرقی درمیان بے مُنتہیٰ

[مگر] انہوں نے اپنی کور باطنی (باطنی اندھاپن) سے یہ نہ سمجھا کہ دونوں [گروہوں] میں بہت بڑا فرق ہے۔

؎ هردو گون زنبور خور دند از محل + لیک شد زان نیش و زین دیگر عسل

دونوں قسم کی زنبوروں (یعنی بھڑ اور شہد کی مکھی) نے ایک ہی جگہ سے کھایا لیکن اِس سے ڈنگ پیداہوا اور اُس سے شہد۔

؎ هر دو گون آهو گیاه خوردند و آب + زین یکی سَرگین شد و زان مُشکِ ناب

دونوں قسم کے ہرنوں نے گھاس چری اور پانی پیا، لیکن اس سے میگنیاں بن گئیں اور اُس سے

خالص کستوری۔

ے هر دو نے خوردند از یک آبخور + این یکی خالی و آن پُر از شکر

دونوں [قسم کے] نے نے ایک ہی گھاٹ سے پانی پیا، لیکن یہ ایک خالی ہے اور وہ دوسری شکر سے بھری ہوئی۔

ے صد هزار ین این چنین اَشباه بین + فرقشان هفتاد ساله راه بین

اس قسم کی لاکھوں مثالیں دیکھو [گے] جن میں ستر برس کی راہ کا فرق پاؤ [گے]

ے این خورد گردد پلیدی زوجدا + آن خورد گردد همه نورِ خدا

یہ کھاتا ہے تو اس سے پلیدی نکلتی ہے اور وہ کھاتا ہے تو سب کا سب خدا کا نور بن جاتا ہے۔

مرکزِ علم و حکمت، لندن

جِنّ کی شناخت

جِـــنّ کا مضمون قرآنِ حکیم کے اساسی مضامین میں سے ایک ہے، اس لئے ائمۂ طاہرین اور ان کے حدودِدین کی تعلیمات کی روشنی میں اس کی صحیح شناخت نہایت ہی ضروری ہے ہر چند کہ لفظی طور پر جِـنّ کا ذکر قرآنِ حکیم میں اپنے مادّہ اور اشتقاقات کے ساتھ (جَـنَّ ایکدفعہ، جِـنّ ۲۲ دفعہ، جـانّ ۷ دفعہ اور جِنّة ۱۰ دفعہ) صرف چالیس (۴۰) دفعہ آیا ہے، لیکن معنوی لحاظ سے اس کا ذکر انسان کے ساتھ پورے قرآن میں پھیلا ہوا ہے، اس لئے کہ ان دونوں کا تعلق خصوصی طور پر عبادت و معرفتِ الٰہی کے ساتھ ہے جو کہ اس (قرآن) کا اصل مضمون ہے۔ چنانچہ حضرتِ ربّ العزت فرماتا ہے: ''وَمَـا خَـلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ '' (۵۶:۵۱)۔ ''میں نے جِنّ اور انسان کو پیدا نہیں کیا سوائے اس کے کہ وہ میری عبادت کریں۔'' حضرتِ ربّ العزت نے عروسُ القرآن یعنی سورۂ رحمان میں جِنّ و انسان دونوں کو ''ثَـقَـلان'' (دو بھاری چیزیں، ۳۱:۵۵) کے نام سے یاد فرمایا ہے، اور اسی سورے میں دونوں پر اپنی بے پایان اور گونا گون نعمتوں کو جتلاتے ہوئے ۳۱ بار فرماتا ہے ''فَبِـاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّـکُـمَـا تُکَذِّبَـان''۔ ''پس تم دونوں اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے۔''

لغوی لحاظ سے لفظ جِـنّ جَـنَّ یَـجُـنّ (جُـنُـون) کے مادّے سے نکلا ہے جس کے معنی ڈھانپنے اور چھپانے کے ہیں، جیسا کہ قرآنِ حکیم میں آیا ہے: ''فَـلَـمَّـا جَنَّ عَلَيْهِ الَّيْلُ '' (۷۶:۶)۔[1] ''جب رات نے اسکو ڈھانپ لیا۔'' یعنی اس پر رات کی تاریکی چھا گئی۔ اصطلاحی اعتبار سے جِـنّ سے مراد ایک ایسی مخلوق ہے جو جسمِ لطیف کی حامل ہونے کی وجہ سے عموماً پوشیدہ رہتی ہے، ہر چند کہ چاہے تو مختلف صورتوں میں ظاہر بھی ہو سکتی ہے۔ جِـنّ کا فارسی ترجمہ ''پری'' ہے یعنی ''اُڑنے کے قابل مخلوق'' جو مصدر پریدن (اڑنا) سے نکلا ہے۔ جسمِ لطیف کی حامل اس مخلوق کی وجہِ تسمیہ میں عربی میں اس کی پوشیدگی کی صفت پر زور دیا گیا ہے اور فارسی میں پرواز کی صفت پر، جس کی وجہ سے عوام نے اس کو دو الگ

الگ مخلوق سمجھا ہے، جبکہ دونوں صفات اسی ایک ہی مخلوق میں پائی جاتی ہیں۔[۲]

آیۂ مذکورۂ بالا اور دوسری بہت سی جگہوں پر جِـنّ کو بظاہر ''اِنس'' کے مقابلے میں استعمال کیا گیا ہے جو اَنِـسَ یَأْنَسُ / اَنُسَ یَأْنُسُ (اِیناس) سے نکلا ہے جس کے معنی دیکھنے اور دکھائی دینے کے ہیں، جیسا کہ قرآن میں آیا ہے: ''اٰنَـسَ مِنْ جَـانِبِ الطُّوْرِ نَـارًا'' (۲۹:۲۸)۔ ''کوہِ طور کی طرف سے ایک آگ دکھائی دی۔'' نیز ''اِنّـِیْ اٰنَسْـتُ نَـارًا'' (۲۹:۲۸)۔ ''میں نے ایک آگ دیکھی ہے۔'' اس اعتبار سے انس یا انسان کے معنی دکھائی دینے والی مخلوق کے لئے جاتے ہیں۔[۳] مختصراً جِـنّ کے معنی پوشیدہ اور انس کے معنی آشکارا مخلوق کے لئے جاتے ہیں جو باطن اور ظاہر کی طرح استعمال ہوتے ہیں۔

جِـــنّ کی شناخت کے بارے میں عوام میں بڑے غلط تصورات پائے جاتے ہیں۔ اوّل تو انکے ہاں جِنّ و انس میں کوئی قدرِ مشترک نہیں پایا جاتا۔ دوم جِنّ کے فارسی ترجمے ''پری'' کو اس سے ایک الگ مخلوق سمجھا گیا ہے۔ اس پر مستزاد شرّ اور بدصورتی کو اوّل الذّکر اور خیر اور حُسن و جمال کو آخرالذّکر سے منسوب کیا گیا ہے۔ ان جیسے تصورات سے جِـــنّ کی شناخت میں اہلِ تحقیق کے لئے بڑی رُکاوٹیں پیدا ہوئی ہیں اور بہت بڑا علمی و عرفانی نقصان ہوا ہے۔[۴]

اس کے برعکس ائمۂ طاہرین اور ان کے حدودِ دین کی تاویلی تعلیمات کی روشنی میں قرآنی حقائق کو سمجھنے کی کوشش کی جائے تو معلوم ہوگا کہ جِـنّ و انس کے درمیان نہایت گہرا رشتہ ہے بلکہ دونوں ایک ہی حقیقت کے دو پہلو ہیں۔ جِـنّ انسان کی لطیف شکل ہے اور انسان جِـنّ کی کثیف شکل۔ چنانچہ یہ اس کے بغیر اور وہ اس کے بغیر مکمل نہیں۔ یہ دونوں ابتدائی مرحلوں میں الگ الگ دکھائی دیتے ہیں لیکن علم و عمل میں ترقی کے تناسب سے دونوں میں وحدت کا شعور بڑھتا رہتا ہے یہاں تک کہ حدِّ کمال میں دونوں کی وحدت کا علم ہو جاتا ہے۔ ان پہلوؤں کے پیشِ نظر بزرگانِ دین نے جِنّ و انس کو تین قسموں میں تقسیم کیا ہے: یعنی بعض جِـنّات صرف جِـنّات ہوتے ہیں اور بعض انسان صرف انسان، لیکن انسانانِ کامل جسمِ کثیف سے بشر اور جسمِ لطیف سے جِنّ (یعنی فرشتہ) ہوتے ہیں۔[۵]

جِـــنّ و انس کی اس اساسی وحدت کے بارے میں یہ سوال اُٹھتا ہے کہ جِـــنّ کو جوہرِ آتش اور انسان کو جوہرِ خاک سے پیدا کرنے کے باوجود کس طرح یہ دونوں مخلوق ایک ہو سکتے ہیں؟ اس سلسلے

میں داعیٔ قیامت حضرتِ استادِ بزرگوار علامہ نصیرالدّین نصیر صاحب ہونزائی فرماتے ہیں: انسانی جسم اگرچہ بظاہر صرف انسان ہی کے لئے مخصوص لگتا ہے، لیکن حقیقت میں اس میں جمادات و نباتات سے لے کر شیطان اور فرشتہ سب کچھ جمع ہے، جمادات و نباتات انسان میں ترقی اور فنا کی شکل میں ہیں، اخلاقی اور مذہبی طور پر گرا ہوا آدمی حیوان (۷:۱۷۹ ؛ ۲۵:۴۴)، لوگوں کو گمراہ کردینے والا شیطان (۲:۱۴) اور خدا کا کوئی برگزیدہ بندہ فرشتہ ہے (۶:۹ ؛ ۱۷:۹۵)۔[۶]

جہاں تک جِـنّ کے ساتھ شرّ یا بدی کی نسبت کا تعلق ہے فرماتے ہیں: لفظِ جِـنّ پر بذاتہٖ بُرائی اور اچھائی کا اطلاق نہیں ہوتا، جس طرح شیطان اور فرشتہ پر ہوتا ہے اور یہی صورتِ حال انس کا بھی ہے۔[۷]

جِـنّ و انس کی تخلیق کا مقصد عبادت و معرفت ہے جو خیر ہی خیر ہے، جِـنّ و انس دونوں کو بزرگانِ دین نے فرشتگانِ بالقوۃ قرار دیا ہے، یعنی خدائے تعالیٰ نے ان کو اس لئے پیدا کیا ہے کہ اس سے فرشتگانِ بالفعل بن جائیں، اور اس مقصد کے لئے خداوندِ متعال نے ان کو امکانی ترقی کے جملہ وسائل سے نوازا ہے، جیسا کہ فرماتا ہے: ''**وَاٰتٰکُمْ مِّنْ کُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْہُ ط وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰہِ لَا تُحْصُوْھَا**'' (۱۴:۳۴)۔ ''اور ہر وہ چیز جو تم نے اس سے مانگا اس نے تم کو دیا، اور اگر تم خدا کی نعمتوں کو شمار کرنا چاہو تو ہرگز شمار نہیں کر سکتے۔'' عروسُ القرآن یعنی سورۂ رحمان میں ربّ العزت انہی بیشمار نعمتوں کو جو اس نے ان کو عطا فرمائی ہیں جتلاتے ہوئے فرماتا ہے: ''**فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰن**''۔ ''پس تم اپنے ربّ کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے۔''

فرشتگانِ بالقوہ کا مطلب یہ ہے کہ ربّ العزت نے ان کو جو بے پناہ قوتیں عطا فرمائی ہیں ان کو صحیح طور پر استعمال کیا جائے تو وہ فرشتگانِ بالفعل بن سکتے ہیں لیکن خدانخواستہ ان کو دانستہ یا نادانستہ غلط استعمال کیا جائے تو نہ صرف فرشتگان بالفعل بننے سے محروم ہو جاتے ہیں بلکہ موجودہ ترقی کرنے کی جو صلاحیت ہے وہ بھی باقی نہیں رہتی اور اس مرتبے سے گر جاتے ہیں۔ اور فرشتگانِ بالفعل کی جگہ وہ شیاطین بالفعل بن جاتے ہیں۔[۸] جس طرح مرغی کے ایک انڈے میں حدِّ قوت میں ایک چوزہ بننے کی صلاحیت موجود ہے اور اگر اس کو ضروری شرائط کے ساتھ سینا جائے تو اس سے ایک بالفعل چوزہ پیدا

ہوگا، اگر شرائط کا لحاظ نہ رکھا جائے تو اس انڈے سے نہ صرف چوزہ پیدا نہیں ہوگا بلکہ وہ خود بھی خراب ہوگا۔

فرشتگانِ بالقوہ اور انڈوں میں یہ فرق ہے کہ انڈوں میں اختیار نہیں اور فعل میں آنے کے لئے کسی اور کے فعل کے محتاج ہیں، لیکن فرشتگانِ بالقوہ میں اختیار ہے اس لئے وہ کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے میں آزاد ہیں اور اس اختیار کے مطابق ان کے کاموں کے اچھے یا بُرے نتائج مرتب ہوں گے، جیسا کہ قرآن مجید میں ہے: ''وَهَدَيْنَاهُ النَّجْدَيْنِ (۹۰:۱۰)۔ ''اور ہم نے اس کو دونوں راہیں دکھا دیں۔'' دوسری جگہ فرماتا ہے: ''اِنَّا هَدَيْنَاهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّ اِمَّا كَفُوْرًا'' (۷۶:۳)۔ ''اور ہم نے اس کو راستہ دکھا دیا خواہ شکرگزار ہو یا ناشکرا۔'' یہ ہدایت خدا نے فرشتگانِ بالقوہ کے لئے اپنے ایک فرشتۂ بالفعل کے ذریعے پہنچائی اور اس کو اپنا خلیفہ بناکر اس کی اطاعت کو اپنی اطاعت اور اس کی معصیت کو اپنی معصیت قرار دیا۔ جِنّ و انس پر اچھائی اور بُرائی کا اطلاق اس امتحان کے بعد ہوگا۔ چنانچہ حضرتِ آدم علیہ السلام سے قبل مولانا ہنید خلیفۂ خدا تھا، آپ نے فرشتگانِ بالقوہ یا جِنّات سے آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے کے لئے فرمایا، تو سب نے سجدہ کیا، سوائے ابلیس کے۔ یہاں پر صاف روشن ہے کہ ابلیس فرشتگانِ بالقوہ میں سے تھا لیکن آدم کو سجدہ کرنے سے انکار سے پہلے لفظ ابلیس کا وجود نہ تھا۔ دوسری جگہ پر ابلیس کے بارے میں فرماتا ہے: 'اِلَّآ اِبْلِيْسَ ط كَانَ مِنَ الْجِنِّ ف.فَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ'' (۱۸:۵۰)۔ ''ابلیس جِنّات میں سے تھا پھر اس نے اپنے پروردگار کے حکم کی سرتابی کی۔'' ان آیات سے ایک طرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ ملائکہ اور جِنّ ایکدوسرے کے مترادف ہیں اور دوسری طرف سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ابلیس اور شیطان جیسے الفاظ کا مستقل وجود نہیں بلکہ عارضی طور سے جِنّ و انس کی معصیت سے پیدا ہوتے ہیں۔[۹]

خلاصۂ مطلب یہ ہے کہ خدا نے کوئی ایسی چیز پیدا نہیں کی ہے جو مستقلاً بُری ہو، اس لئے جِنّ و انس میں سے کسی کے ساتھ بھی شرّ اور بُرائی کو منسوب کرنا جہالت و نادانی کی وجہ سے ہے، جِنّ و انس میں سے کسی کا شریر یا بُرا ہونا خلیفۂ خدا کی معصیت کی وجہ سے ہے جو ہر زمانے میں پیغمبر یا امام کی صورت میں دونوں کی ہدایت کے لئے حاضر اور موجود ہے۔ جیسا کہ سورۂ جِنّ کی ابتدائی آیتوں سے

ظاہر ہے کہ جِنّ بھی قرآنِ حکیم سننے کے لئے آنحضرت صلعم کے حضور میں حاضری دیتے اور ایمان و ہدایت سے فیضیاب ہوتے تھے: ''قُلْ اُوْحِیَ اِلَیَّ اَنَّهُ اسْتَمَعَ نَفَرٌ مِّنَ الْجِنِّ فَقَالُوْا اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا – یَّهْدِیْ اِلَی الرُّشْدِ فَاٰمَنَّا بِهٖ'' (۷۲:۱-۲)۔ ''(اے رسول!) آپ کہہ دیجئے کہ میری طرف وحی کی گئی ہے کہ جنّوں کی ایک جماعت نے کان لگاکر قرآن کو سنا تو کہا ہم نے ایک عجیب قرآن سنا ہے۔ جو نیکی کی ہدایت کرتا ہے تو ہم اس پر ایمان لے آئے ہیں۔''[۱۰] اور پیغمبر صلعم خود اس بارے میں فرماتے ہیں: ''بُعِثْتُ اِلَی الْاَحْمَرِ وَالْاَسْوَدِ''۔ ''مَیں سرخ و سیاہ دونوں کی طرف بھیجا گیا ہوں۔'' سرخ سے مراد انس اور سیاہ سے مراد جنّ۔[۱۱] پیغمبر اور امام نہ صرف جنّ و انس کی ہدایت کرتے ہیں بلکہ ان شیاطین کی بھی جو جنّ و انس میں سے اپنی معصیت کی وجہ سے بن گئے ہیں۔ اگر شیاطین اپنی معصیت سے باز آئیں اور انبیا و ائمہ علیہم السلام کی ہدایات پر عمل کرتے ہوئے توبہ کریں تو پھر سے وہ پاک ہو سکتے ہیں، جیسا کہ رسول صلعم نے فرمایا: ''اَلتَّائِبُ مِنُ الذَّنْبِ کَمَنْ لَا ذَنْبَ لَهٗ۔'' یعنی اپنے گناہ سے توبہ کرنے والا اس شخص کی طرح ہے جس نے کبھی گناہ کیا ہی نہیں۔[۱۲] حجتِ خراسان و بدخشان سیدنا ناصر خسرو (قدس اللہ سرہٗ) اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

جَدِّ شان رہبرِ دیو و پری و مردم بود + سوی رضوانِ خدای و پسران زان گہرند

یعنی (فاطمی) اماموں کا جدِّ امجد شیاطین، جنات اور انسانوں کا خدا کی خوشنودی کی طرف رہبر تھا اور ائمّۂ طاہرین اسی خاندانِ عالی سے ہیں۔[۱۳]

جنّات میں سے جو ایمان کے درجاتِ عالیہ پر پہنچتے ہیں ان کے بارے میں قرآن حکیم خود جنّات کے قول کو نقل کرتے ہوئے فرماتا ہے: ''وَاَنَّا مِنَّا الصّٰلِحُوْنَ وَمِنَّا دُوْنَ ذٰلِکَ ط کُنَّا طَرَآئِقَ قِدَدًا'' (۷۲:۱۱)۔ ''اور یہ کہ ہم میں سے کچھ لوگ نیکوکار (صالحون) اور کچھ اور طرح کے ہیں۔ ہم لوگوں کے بھی کئی طرح کے فرقے ہیں۔'' جنّات کے روحانی مرتبے کا اندازہ کرنے کے لئے لفظِ ''صالحون'' کافی ہے اس لئے کہ یہ حضراتِ انبیا کے لئے استعمال ہوا۔ چنانچہ ربّ العزت بہت سے انبیا علیہم السلام کے نام لینے کے بعد فرماتا ہے: ''کُلٌّ مِّنَ الصّٰلِحِیْنَ'' (۶:۸۵)۔ ''یہ تمام پیغمبر صالحین میں سے ہیں۔''[۱۴] نیز پیر ناصر (قدس اللہ سرہٗ) انسانِ کامل میں انسان اور جنّ دونوں کا حدِ فعل ہونے کے سلسلے میں

فرماتے ہیں:

مرا گفت این خداوندِ زمان است + که بگزیدش خدای از انس واز جان

[یعنی سیّدنا المؤید نے امامِ زمان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) مجھے بتایا کہ یہ زمانے کا خداوند ہے جس کو خدا نے انس و جنّ میں سے برگزیدہ کیا ہے۔[15]

جـــنّ و انس میں الگ الگ فرقوں کا سبب ہادئ برحق یا خلیفۂ خدا سے ان کی محبت و عداوت اور اطاعت و معصیت کے مراتب ہیں اور ان کے تناسب سے درجات و درکات مرتب ہوتے ہیں، جیسا کہ سورۂ فاتحہ میں ہدایتِ الٰہی کے سلسلے میں چار بڑے گروہ کا ذکر آیا ہے: پہلا گروہ خود ہدایت یافتہ ہے اور دوسروں کو صراطِ مستقیم کی ہدایت کرتا ہے۔ دوسرا گروہ صراطِ مستقیم پر چلنے کی اہلیت رکھتا ہے اور اس کے لئے ہمیشہ دعا کرتا ہے۔ تیسرا گروہ ان کا ہے جن پر خدا کا غضب نازل ہوا ہے اور جو راستہ انہوں نے اختیار کیا ہے وہ اس قابل نہیں کہ صراطِ مستقیم سے جا ملے۔ اور چوتھا گروہ اُن کا ہے جو صراطِ مستقیم سے گم گئے ہیں۔ اور اب وہ جس راستے پر چل رہے ہیں اس قابل نہیں کہ منزلِ مقصود تک پہنچ جائے۔[16]

اس کوشش کے بعد کہ جنّ و انس میں باہمی تضاد کی بجائے اندرونی وحدت ہے اور جو اختلافات دکھائی دے رہے ہیں ان کا وجود مستقل نہیں بلکہ عارضی ہے۔ اس مضمون کے دوسرے حصے میں اس حقیقت کو سمجھنے کی مزید کوشش کی جائے گی۔ (جاری ہے)

حوالہ جات:

۱۔ سیدنا ابو حاتم رازی، کتاب الزینة، تصحیح حسین الھدانی (قاھرة، ۱۹۵۷)، ص ۱۷۷

۲۔ سیدنا ناصر خسرو، جامع الحکمتین، تصحیح ہنری کربین و محمد معین (تہران/پیرس، ۱۹۵۳)، صص ۱۳۵-۱۴۴

۳۔ کتاب الزینة، صص ۱۷۷-۱۷۸

۴۔ علامہ نصیرالدین نصیر ہونزائی، معرفت کے موتی (کراچی، ۱۹۸۳)، صص ۴۶-۴۷

۵۔ علامہ نصیرالدین نصیر ہونزائی، قرآنی مینار (کراچی، ۱۹۹۰)، ص ۲۹۲

۶۔ معرفت کے موتی، ص ۴۵

۷۔ ایضاً، ص ۴۷

۸۔ علامہ نصیرالدین نصیر ہونزائی، دعا مغزِ عبادت (کراچی، ۱۹۹۴)، صص ۷۲-۷۳

۹۔ جامع الحکمتین، صص ۱۳۹-۱۴۱

۱۰۔ ایضاً، صص ۱۴۱-۱۴۲

۱۱۔ سیدنا ابو یعقوب سجستانی، تصحیح عارف تامر (بیروت، ۱۹۸۶)، ص ۱۸۲

۱۲۔ سیدنا ناصر خسرو، خوان الاخوان، تصحیح ع۔قویم (تہران، ۱۹۵۹)، صص ۲۷۹-۲۸۰

۱۳۔ سیدنا ناصر خسرو، دیوان، تصحیح سید نصراللہ تقوی (تہران، ۱۹۸۸)، ص ۱۰۱

۱۴۔ معرفت کے موتی، ص ۴۷

۱۵۔ دیوان، ص ۳۱۴

۱۶۔ دعا مغزِ عبادت، صص ۷۳-۷۴

فقیر حقیر

مرکزِ علم و حکمت، لندن

۱۳، نومبر ۲۰۰۹ء

شہادت کے فضائل اور اس کا دائرہ

شہادت کے دو بنیادی معنی ہیں۔ ایک کسی واقعے کو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر یا کسی قابلِ اعتبار شخص سے اس کے بارے میں سُن کر گواہی دینا۔ دوسرا معنی ہے راہِ خدا میں قتل ہو جانا۔ اس مختصر سے مضمون میں اس دوسرے معنی کی حقیقت اور اس کی وضاحت کی کوشش کی جاتی ہے۔ تاکہ اس وقت وطنِ عزیز جس امتحان و ابتلا سے گزر رہا ہے، خاص کر حالیہ ہوائی حادثہ اور اس کے بعد کے حادثات کا جو سلسلہ جاری ہے، اُن میں پوشیدہ خداوندی حکمتوں کو سمجھنے میں مدد مل سکے۔

مؤمنین و مسلمین پر چھوٹے بڑے نقصانات کی صورت میں جو مصائب نازل ہوتی ہیں، ان کے بارے میں یہ جاننا ضروری ہے کہ آیا یہ مصائب ربّ العزّت کی طرف سے جو رحمٰن و رحیم ہے اور جس کی رحمت نے اس کے غضب پر سبقت لی ہے، اپنے بندوں پر ایک سزا ہے؟ یا ان کی حالتِ زار پر رحم فرما کر اپنی خصوصی اور پُرحکمت عنایات سے ان کو نوازنا چاہتا ہے؟ اس پر غور و فکر کرنا ضروری ہے جو ربّ العزّت کی ایک خاص عبادت ہے۔

اس سلسلے میں سب سے پہلے قرآن حکیم کی تعلیم کی روشنی میں نفع و نقصان کے معیار کو جاننا ضروری ہے۔ چنانچہ اس مبارک تعلیم کی روشنی میں انسان کا اصل نقصان کفر ہے یعنی ربّ العزّت کی ذاتِ اقدس سے انکار اور اس کی اطاعت سے رُوگردانی۔ اور جو شخص اس عظیم مرضِ روحانی میں مبتلا ہے وہ اطمینانِ قلب کی لازوال روحانی دولت سے محروم ہے اور اس روحانی مرض کی موجودگی میں دنیوی مال و متاع، عزّت و اقتدار جو کچھ بھی ہو وہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ کیونکہ ایسے لوگوں کے بارے میں قرآن کا فیصلہ ہے: ''اَمۡوَاتٌ غَيۡرُ اَحۡيَآءٍ'' (۲۱:۱۶)۔ یعنی ''ایسے لوگ مردہ ہیں زندہ نہیں۔'' کسی بزرگ نے کیا خوب فرمایا ہے:

ے بصورتِ زندہ امّا جان ندارند + اگر دارند جان جانان ندارند

یعنی ایسے لوگ دیکھنے میں تو زندہ ہیں لیکن ان میں جان نہیں، اگر ان میں روحِ [حیوانی] ہے تو

بھی، وہ جانان [یعنی روح الایمان] سے خالی ہیں۔

اس کے مقابلے میں انسان کے اصل نفع اور تمام دنیوی اور اُخروی سعادتوں کا باعث ایمان ہے۔ یعنی جس کو ربّ العزّت کی ذاتِ اقدس پر کامل یقین ہو اور ساتھ ساتھ اس کی اطاعت کرے تو ایسے انسان کے لئے ظاہری نفع تو نفع ہی ہے ظاہری نقصان بھی نفع اور فائدے سے خالی نہیں کیونکہ ظاہری آفات و بلائیں بھی اس کی پُرحکمت رحمت سے خالی نہیں ہوتی ہیں۔ کیونکہ یہی آفات و بلائیں، بشرطیکہ صبر و استقامت کے ساتھ برداشت کی جائیں، رفعِ درجات اور کفّارۂ سیّئآت کا وسیلہ بن جاتی ہیں۔ چنانچہ یہ حقیقت واشگاف الفاظ میں ان آیات میں پائی جاتی ہے: ''وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَیْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ط وَبَشِّرِ الصّٰبِرِیْنَ – الَّذِیْنَ اِذَآ اَصَابَتْھُمْ مُّصِیْبَةٌ قَالُوْآ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ – اُولٰٓئِکَ عَلَیْھِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّھِمْ وَ رَحْمَةٌ وَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُھْتَدُوْنَ '' (۲:۱۵۵-۱۵۷)۔ ''اور ہم ضرور تم کو آزمائیں گے کچھ خوف اور بھوک سے اور کچھ مال، جان اور پھلوں کے نقصان سے۔ اور آپ صابرین کو بشارت دیجئے کہ جب ان پر کوئی مصیبت آ پڑتی ہے تو وہ کہتے ہیں: بیشک ہم اللہ ہی کے ہیں اور بیشک اسی کی طرف رجوع کرنے والے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جن پر ان کے پروردگار کی طرف سے صلوات اور رحمت ہے اور یہی وہ لوگ ہیں جو ہدایت یافتہ ہیں۔'' اسی معنی میں قرآن حکیم میں اور جگہ فرمایا گیا ہے کہ مؤمنین کو دو نیکیوں میں سے ایک نیکی ضرور ملتی ہے۔ ''اِحْدَی الْحُسْنَیَیْنِ '' (۹:۵۲)۔ یہ ارشاد بظاہر جہادِ ظاہر کے بارے میں ہے کہ مؤمنین کو یا تو فتح و نصرت نصیب ہوگی یا شہادت کا مرتبۂ عظمیٰ، لیکن اس کا اطلاق مؤمنین کی دوسری حالتوں پر بھی یقیناً ہو سکتا ہے۔ الغرض حقیقی مؤمن کا کوئی بھی کام کبھی بھی خسارے اور نقصان میں نہیں جاتا۔ ایمان کی برکت سے اس کے ہر کام میں کامیابی ہے۔

قرآنِ حکیم کی تعلیم کی روشنی میں اصل نفع و نقصان کے معیار کی وضاحت کے بعد اب شہادت کے مذکورۂ بالا معنی کی وضاحت کی کوشش کی جاتی ہے۔ جیسا کہ اس مضمون کے شروع میں ذکر ہؤا ہے کہ شہادت کے دوسرے معنی راہِ خدا میں قتل ہونا ہے۔ راہِ خدا میں قتل ہونے کا تعلق جہاد سے ہے اور جس طرح جہاد ظاہری اور باطنی دو طرح کا ہے اسی طرح شہادت بھی دو قسم کی ہے۔ ظاہری

جہاد کا مطلب دین کے ظاہری دشمنوں کے خلاف لڑنا ہے اور باطنی جہاد کا تعلق دین کے باطنی دشمن سے لڑنا ہے جو نفسِ امّارہ ہے۔ نفسِ امّارہ انسان کے اندر ہمیشہ شیطان کے نمایندے کی حیثیت میں پوشیدہ بیٹھا ہے۔

چونکہ نفسِ امّارہ شیطانِ رجیم کا نمایندہ ہے اور یہ ہمیشہ حدیثِ نبوی: ''اَعْدَی عَدُوِّکَ نَفْسُکَ بَیْنَ جَنْبَیْکَ''۔ ''تیرا سب سے بڑا دشمن تیرا وہ نفس ہے جو تیرے دو پہلوؤں کے درمیان ہے'' کے مطابق راہِ خدا میں سب سے بڑا دشمن ہے۔ اس لئے اس کے خلاف جہاد کو پیغمبرؐ نے جہادِ اکبر قرار دیا ہے اور اس کے خلاف جہاد کے بارے میں فرمایا ہے: ''مُوْتُوْا قَبْلَ اَنْ تَمُوْتُوْا''۔ یعنی ''[جسمانی طور پر] مرنے سے پہلے [نفسانی طور پر] مرو۔'' اور جو بندۂ مومن اپنے نفسِ امّارہ کی خواہشات کے خلاف جہاد جاری رکھتا ہے وہ بتدریج نفسِ لوّامہ سے ترقی کرکے نفسِ مطمئنہ تک پہنچ کر خواہشاتِ نفسانی سے کلّی طور پر نجات پاتا ہے۔ اس جہاد میں انسان کا اپنا نفس قتل ہوتا ہے۔ اور یہ دشمن پوشیدہ ہوتا ہے اس لئے اس کا نام باطنی شہادت ہے۔ اس باطنی شہادت کی فضیلت کے بارے میں مولائے رُوم فرماتے ہیں:

؎ قتل کُن فرعونِ نفسِ خویش را + در زمان موسی عمرانت کنم

یعنی تو اپنے نفسِ امّارہ کے فرعون کو قتل کر دو تو فوراً ہی تجھے موسیٰ عمرانؑ بنا دوں گا۔

الغرض شہادت باطنی ہو یا ظاہری، اس کے فضائل اور برکات کے بارے میں خود ربّ العزّت فرماتے ہیں: ''وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ قُتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اَمْوَاتًا ط بَلْ اَحْیَآءٌ عِنْدَ رَبِّھِمْ یُرْزَقُوْنَ – فَرِحِیْنَ بِمَآ اٰتٰھُمُ اللّٰہُ مِنْ فَضْلِہٖ وَیَسْتَبْشِرُوْنَ بِالَّذِیْنَ لَمْ یَلْحَقُوْا بِھِمْ مِّنْ خَلْفِھِمْ اَلَّا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَاھُمْ یَحْزَنُوْنَ – یَسْتَبْشِرُوْنَ بِنِعْمَۃٍ مِّنَ اللّٰہِ وَفَضْلٍ وَّاَنَّ اللّٰہَ لَا یُضِیْعُ اَجْرَالْمُؤْمِنِیْنَ'' (۳:۱۶۹-۱۷۱)۔ ''اور جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل ہوئے ہیں انہیں مردہ مت سمجھو، وہ تو حقیقت میں زندہ ہیں، اپنے ربّ کے پاس رزق پا رہے ہیں۔ جو کچھ اللہ نے اپنے فضل سے انہیں دیا ہے اس پر خوش و خرّم ہیں اور مطمئن ہیں کہ جو اہلِ ایمان ان کے پیچھے دنیا میں رہ گئے اور ابھی وہاں نہیں پہنچے ہیں ان کے لئے بھی کسی خوف و رنج کا موقع نہیں ہے۔ وہ اللہ کے انعام اور اس کے فضل پر شادان و فرحان ہیں اور ان کو معلوم ہو چکا ہے کہ اللہ مؤمنین کے اجر کو ضایع نہیں کرتا۔''

شہادت کے ان عظیم فضائل کے معلوم ہونے کے بعد سؤال پیدا ہوتا ہے کہ آیا یہ فضائل صرف شہیدانِ باطن اور شہیدانِ ظاہر تک محدود ہیں یا فضائلِ شہادت کے اس دائرے میں دوسرے مؤمنین کو بھی شامل ہونے کی کوئی اُمید ہے؟ اس سلسلے میں جس طرح رحمتِ ایزدی نے نہ صرف مؤمنین بلکہ جملہ اشیاء کو اپنے گھیرے میں گھیر لیا ہے، اسی طرح دوسرے تمام مؤمنین کو بھی اس میں شامل ہونے کی بشارت ہے۔ چنانچہ ربّ العزّت کمالِ مرحمت سے فرماتا ہے: ''**وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰہِ وَرُسُلِہٖٓ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الصِّدِّیْقُوْنَ وَالشُّھَدَآءُ عِنْدَ رَبِّھِمْ ط لَھُمْ اَجْرُھُمْ وَنُوْرُھُمْ ط**'' (۱۹:۵۷)۔ ''اور وہ لوگ جو اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لے آئے ہیں وہ اپنے پروردگار کے ہاں صدیقین اور شہداء ہیں۔ ان کے لئے ان کا اجر اور ان کا نور ہے۔'' **الحمدللہ!** اس مبارک ارشاد کی روشنی میں اہلِ ایمان میں سے کوئی بھی اس دائرے سے باہر نہیں رہے گا۔ ہر ایک فضائلِ شہادت کے مراتب میں سے کسی نہ کسی مرتبے پر فائز ہوگا۔ جیسا کہ امام علی علیہ السلام سے مروی ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا: ''**اَلْمَرِیْضُ فِیْ سِجْنِ اللّٰہِ، مَالَمْ یَشْکُ اِلَی عُوَّادِہٖ تُمْحَی سَیِّئَآتُہُ، وَاَیُّ مُؤْمِنٌ مَاتَ مَرِیْضًا مَاتَ شَھِیْدًا، وَکُلُّ مُؤْمِنٍ شَھِیْدٌ، وَکُلُّ مُؤْمِنَۃٍ حَوْراء، وَاَیُّ مِیْتَۃٍ مَاتَ بِھَا الْمُؤْمِنُ فَھُوَ شَھِیْدٌ**''۔ ''بیمار خدا کے قید خانے میں ہوتا ہے جب تک وہ اپنی عیادت کرنے والوں سے کوئی شکایت نہیں کرتا اس کے گناہ مٹائے جاتے ہیں۔ اور جو مؤمن بندہ بیماری کی حالت میں انتقال کر جاتا ہے وہ شہید ہوتا ہے۔ اور [یوں تو] ہر مؤمن شہید ہے اور ہر مؤمنہ حُور، مؤمن جس موت سے بھی مرے وہ شہید ہے۔'' اور پھر آنحضرت نے مذکورہ آیت کی تلاوت فرمائی۔

نیز آپؑ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلعم نے فرمایا: ''**اِذَا ابْتَلَی اللّٰہُ عَبْدًا اَسْقَطَ عنہ مِنَ الذُّنُوبِ بِقَدْرِ عِلَّتِہٖ**''۔ ''جب خدا کسی بندے کو کسی مرض میں مبتلا فرماتا ہے تو اس کی بیماری کے مطابق اس کی خطائیں معاف کر دیتا ہے۔''

اَلْحَمْدُللہ! قرآنِ کریم کی حکیمانہ تعلیم اور پیغمبر صلعم کے نورانی بیان سے ثابت ہؤا کہ مؤمنین و مسلمین پر جو مصائب و آلام نازل ہوتے ہیں وہ در پردہ ان کے لئے رفعِ درجات اور **کفّارۂ سیّئات** کا وسیلہ ہیں۔ اس لئے ایسے موقعوں پر ہمیں چاہئے کہ جزع و فزع کی جگہ صبر و استقامت کے ساتھ ان کو برداشت کریں اور سعادتِ دارین حاصل کریں۔ مرحومین کے لئے مغفرت اور رفعِ درجات کے لئے

دعا کریں اور جو ہم پیچھے رہ گئے اپنے لئے نفسِ امّارہ اور شیطانِ رجیم کے وسوسوں سے پناہ اور صراطِ مستقیم پر ثابت قدمی طلب کریں اور جن پر تکالیف ہیں ان کی حتی الوسع امداد کریں۔ اور عاجزانہ بارگاہِ ایزدی میں دعا کریں کہ بارِ خدایا! ہماری گزشتہ خطاؤں کو معاف فرما! اور آیندہ ہمیں شیطان کے شرّ سے اپنی پناہ میں رکھ! اور اپنی عبادت و اطاعت میں ہمیں ثابت قدم رکھ! آمین! یاربّ العالمین!!

ڈاکٹر فقیر محمد ہونزائی، کراچی

قیامت اور حضرتِ عیسیٰ کا نزول

حضرتِ عیسیٰؑ دینِ حق یا دعوتِ حق کی تاریخ میں اس دورِ کبیر کے پانچویں ناطق ہیں۔ آپؑ کا ربُّ العزت کی طرف اُٹھایا جانا اور پھر قیامت میں آپؑ کا نزول دعوتِ حق کی تاریخ میں آنحضرت صلعم کی معراج کی طرح عظیم واقعات میں سے ہیں۔ جن کے سمجھنے میں اہلِ ظاہر اور اہلِ تاویل کا اپنا اپنا انداز ہے۔ حضرتِ عیسیٰؑ کے رفع و نزل کے واقعات کی اہمیت کا اندازہ لگانے کے لئے آپ کی مبارک زندگی کے ضروری پہلوؤں کا کچھ علم ضروری ہے اس لئے ان پر ذیل میں مختصراً روشنی ڈالنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

حضرتِ عیسیٰؑ کا ذکر قرآنِ حکیم کی تنزیلی زبان میں حضرتِ مریمؑ کے فرزندِ دلبند کے طور پر آیا ہے۔ حضرتِ مریمؑ حضرتِ عمرانؑ اور حضرتِ حَنہؑ کی بابرکت بیٹی تھیں۔ اور آپ دونوں حضرتِ داؤدؑ کی نسل سے تھے۔ حضرتِ حنہؑ جب حاملہ ہوئی تو آپ نے مَنت مان لی تھی کہ بچہ جب پیدا ہوگا تو اس کو مقدس ہیکل کی خدمت کے لئے نذر کر دے گی۔ کہتے ہیں کہ حضرتِ حنہؑ ابھی حاملہ ہی تھیں کہ حضرتِ عمرانؑ کا انتقال ہوا۔ جب بچے کی ولادت ہوئی تو معلوم ہوا کہ لڑکی ہے تو آپ کو افسوس ہوا کہ آپ نے جو نذر مانگی تھی وہ پوری نہ ہو سکے گی۔ کیونکہ اُس زمانے میں لڑکیوں کا مقدس ہیکل کی خدمت کرنے کا دستور نہیں تھا۔ لیکن ربُّ العزّت نے آپ کی لڑکی کو مقدس ہیکل کی خدمت کے لئے قبول فرمایا۔ جیسا کہ قرآن میں آیا ہے: ''**فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُوْلٍ حَسَنٍ**'' (۳:۳۷)۔ ''پھر اس کے پروردگار نے اسے اچھی قبولیت کے ساتھ قبول کیا۔''

حضرتِ حنہ نے بچی کا نام مریم رکھا جس کے معنی سُریانی میں خادمہ کے ہوتے ہیں۔ حضرتِ مریم جب سِنِ شعور کو پہنچی اور مقدس ہیکل کی خدمت کے لئے وقف کی گئی تو آپ کی کَفالت کے لئے ایک قسم کا مقابلہ ہوا۔ اس لئے کہ اس کے مجاوروں میں سے ہر ایک آپ کا کفیل بننے کی خواہش

رکھتا تھا۔ چنانچہ اس سلسلے میں قرعہ اندازی ہوئی اور قرعہ حضرتِ زکریاؑ کے نام نکلا اور آپؑ حضرتِ مریمؑ کے کفیل بن گئے۔ قرعہ اندازی کے لئے یہ طے ہوا کہ وہ اپنے قلموں کو پانی میں ڈالیں، جس کا قلم پانی کی سطح پر تیرتا رہ جائے، وہی آپؑ کے کفیل ہوں گے (۴۴:۳)۔

حضرتِ زکریاؑ حضرتِ ایشاع جو بعض روایات کے مطابق حضرتِ مریمؑ کی ہمشیرہ اور بعض کے مطابق آپ کی خالہ تھیں، کے شوہر تھے۔ حضرتِ زکریاؑ جو امامِ مستودع اور پیغمبر تھے، کی کفالت میں حضرتِ مریمؑ کی اعلیٰ پیمانے پر ہرگونہ جسمانی، اخلاقی، دینی اور روحانی پرورش ہوتی رہی۔ جس کی طرف قرآنِ حکیم نے آیہ (۳۷:۳) میں اشارہ کیا ہے: ''وَاَنْۢبَتَهَا نَبَاتاً حَسَناً '' (۳۷:۳)۔ ''اور اس کو ایک اچھے پودے کی طرح پروان چڑھایا۔'' تفسیر المتقین میں بحوالۂ تفسیر عیاشی امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے کہ: ''جناب مریمؑ نہایت خوبصورت تھیں۔ جب آپ محراب عبادت میں نماز کے لئے کھڑی ہوتی تھیں تو آپ کے چہرے سے نور چھن چھن کر تمام محراب کو نورانی کر دیتا تھا۔''[۲] آپ کی روحانی ترقی یہاں تک آگے بڑھی کہ فرشتے وحی لے کر آپ پر نازل ہونے لگے۔ چنانچہ ارشاد ہے: ''وَاِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يَامَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفَاكِ وَطَهَّرَكِ وَاصْطَفَاكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعَالَمِيْنَ '' (۴۲:۳)۔ ''اور جن فرشتوں نے کہا: اے مریم بیشک اللہ تعالیٰ نے تجھے برگزیدہ کیا ہے اور تجھے پاک کیا ہے اور تجھے (اپنے زمانے کی) کُلّ جہانوں کی عورتوں پر برگزیدہ کیا ہے۔'' نہ صرف یہ بلکہ سورۂ مومنون (۵۱:۲۳) میں ربُّ العزت نے آپ کو انبیا اور رسولوں میں شامل کیا ہے۔

حضرتِ مریمؑ جب سِنِّ بلوغ کو پہنچیں تو اہلِ تاویل کے ہاں آپ کی حضرتِ یوسفِ نجّار[۳] یا حبیب نجّار[۴] کے ساتھ مکمل شادی ہوئی تھی۔ آپ بھی حضرتِ داوٗدؑ کی نسل سے تھے اور حضرتِ عیسیٰؑ کی جسمانی ولادت آپ سے ہوئی تھی۔[۵] قرآنِ حکیم میں حضرتِ مریمؑ کے حمل اور حضرتِ عیسیٰؑ کی ولادت سے متعلق جو آیات ہیں ان کا تعلق روحانی اور عقلانی حمل اور ولادت سے ہے۔ دورِ ستر اور دورِ کشف دونوں ادوار میں ان آیات کی تاویلات پر کتابیں لکھی گئی ہیں۔ دورِ کشف میں ان کی تاویل کے لئے استادِ کامل و مکمّل حضرتِ علامہ نصیرالدین نصیر صاحب ہونزائی کی کتابوں کو دیکھا

جائے، خصوصاً معرفت کے موتی حصۂ دوم[6] اور کارنامۂ زرین حصۂ سوم[7]۔

چنانچہ اس روحانی ترقی کے نتیجے میں ولادتِ روحانی و عقلانی سے متعلق ایک دن حضرتِ مریم پر فرشتوں کا نزول ہوا اور آپؑ سے کہا: اے مریم! یقیناً اللہ تعالیٰ تجھے اپنے کلمہ مسیح عیسیٰ بنِ مریم کی بشارت دیتا ہے جو دنیا اور آخرت میں وجیہ اور مقربین میں سے ہوگا اور وہ لوگوں سے گہوارے اور ادھیڑ عمر میں بھی باتیں کرے گا اور وہ صالحین میں سے ہوگا۔ وہ کہنے لگی: اے میرے پروردگار! مجھے کوئی لڑکا کس طرح ہوگا جب کہ مجھ کو کسی بشر نے چھوا بھی نہیں۔ فرمایا: اسی طرح خدا جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے۔ جب وہ کسی کام کا فیصلہ کرتا ہے تو کہتا ہے کہ ہوجا اور وہ ہو جاتا ہے۔ اور وہی اسے کتاب اور حکمت اور توریت اور انجیل کی تعلیم دے گا۔ اور اسے بنی اسرائیل کی طرف رسول بنائے گا۔ (۳:۴۵-۴۹)۔

چنانچہ [ایک دن] جب وہ اپنے لوگوں سے الگ مشرقی سمت کی طرف چلی گئی۔ پھر اس نے ان سے پردہ کرلیا۔ تو ہم نے اس کی طرف اپنی روح کو بھیجا۔ پس وہ اس کے لئے ایک کامل انسان کی شکل میں نمودار ہوئی۔ وہ بولی کہ اگر تو پرہیزگار ہے تو میں تجھ سے رحمٰن کی پناہ مانگتی ہوں۔ اس نے کہا کہ مَیں تیرے ربّ کا رسول ہوں کہ آپ کو ایک پاکیزہ لڑکا عطا کروں۔ وہ بولی: میرا لڑکا کس طرح ہوگا جب کہ کسی بشر نے مجھے چھوا ہی نہیں اور نہ ہی میں بدکار ہوں۔ اس نے کہا: ایسا ہی ہوگا تیرے پروردگار نے کہا ہے کہ وہ مجھ پر آسان ہے اور اس لئے کہ مَیں اسے لوگوں کے لئے نشانی بنا دوں گا اور اپنی طرف سے رحمت قرار دے دوں گا اور یہ بات طے شدہ ہے۔ پھر وہ حاملہ ہوگئی اور لوگوں سے دُور ایک جگہ چلی گئی۔ پھر دردِ زہ اسے کھجور کے تنے کی طرف لے آیا۔ وہ بولی: اے کاش! میں اس سے پہلے ہی مرگئی ہوتی اور بھولی بسری ہو جاتی۔ پس اس کے نیچے سے آواز آئی کہ تو غم نہ کر! یقیناً تیرے پروردگار نے تیرے نیچے ایک چشمہ بنا دیا ہے اور تو کھجور کے تنے کو اپنی طرف ہلا۔ وہ تجھ پر تازہ خرمے گرائے گا۔ پس تو کھا اور پی اور اپنی آنکھ ٹھنڈی کر۔ پھر اگر تو کسی آدمی کو دیکھے تو کہہ کہ یقیناً میں نے رحمٰن کے لئے روزہ نذر مانا ہے۔ پس مَیں آج کے دن کسی انسان

سے کلام نہیں کروں گی۔ پھر وہ اس کو اٹھائے ہوئے اپنی قوم کے پاس لائی۔ وہ لوگ کہنے لگے: اے مریم! بیشک تو ایک عجیب چیز لائی ہے۔ اے ہارون کی بہن! تیرا باپ بُرا آدمی نہ تھا اور نہ ہی تیری ماں بدکار تھی۔ پس اس نے اس کی طرف اشارہ کردیا۔ وہ بولے کہ ہم اس سے کیسے کلام کریں جو گہوارے میں بچہ ہے۔ وہ بولا: یقیناً مَیں خدا کا بندہ ہوں۔ اس نے مجھے کتاب دی ہے اور نبی بنایا ہے۔ اور مَیں جہاں کہیں بھی ہوں مجھے برکت والا قرار دیا۔ اور جس دن مروں گا اور جس دن دوبارہ زندہ اٹھایا جاؤں گا۔ (۱۹:۲۷-۳۲)۔

الغرض حضرتِ عیسیٰؑ کی جسمانی پیدائش بیت لحم میں ہوئی۔ لفظ عیسیٰ عبرانی لفظ یشوع کا معرب ہے جسکے معنی فَـرَجَ یعنی مصیبت کے بعد راحت یا غم کے بعد خوشی کے ہیں۔ آپ کا دوسرا نام مسیح یا مسیحا ہے جو عبرانی ماشیح کا معرب ہے جس کے معنی مسح شدہ یا مسح کرنے والے کے ہیں۔[۸] آپ بچپن ہی سے صاحبِ معجزات تھے۔ آپ کی پیدائش کے وقت ھِیــرُوْدُس (Herod) کی حکومت تھی جو قیصرِ روم اُغسطس (Augustus) کی طرف سے یہودیہ (Judea) پر حکومت کرتا تھا اور بیت المقدس میں رہتا تھا۔ اُس وقت اٹلی اور تمام یوروپی ممالک کے ساتھ مصر، شام، یونان اور ارمنستان بھی اُغسطس کے زیرِ فرمان تھے۔

متی کی انجیل کے مطابق جب حضرتِ عیسیٰؑ کی ولادت ہوئی تو مشرق سے کچھ حکماء بیش قیمت تحائف کے ساتھ بیت المقدس پہنچے اور پوچھا: وہ بچّہ کہاں ہے جو بنی اسرائیل کے بادشاہ کی حیثیت میں پیدا ہوا ہے۔ ہم نے مشرق میں اس کا ستارہ دیکھا اور ہم اس کی پرستش کے لئے آئے ہیں۔ اس کی خبر ھِیـرُوْدُس کو دی گئی تو وہ پریشان ہوگیا۔ ھِیـرُوْدُس نے انکو دربار میں بلایا اور انکو حضرتِ عیسیٰؑ کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی اجازت دی اور کہا: اگر آپ کو اس کا پتہ لگ جائے تو مجھے بھی اطلاع دیں تاکہ مَیں بھی جاکر اُن کی پرستش کروں۔ حکماء بیت لحم آئے، حضرتِ مریمؑ کے گھر کے اوپر حضرتِ عیسیٰؑ کے ستارے کو دیکھا تو انہوں نے آپ کا دیدار کیا اور اُن کے سامنے سجدہ ریز ہوگئے اور وہ تحائف جو اپنے ساتھ لائے تھے اُن کے حضور پیش کئے۔

بیت لحم میں اُن کے قیام کے دوران خواب میں اُن کو فرشتے نے بتایا کہ ھِیــــرُوْدُس کی نیت اچھی نہیں اس لئے اس بارے میں اس کو کچھ بتائے بغیر واپس اپنے ملک چلے جائیں۔ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ جب ھِیــرُوْدُس کو اس کا علم ہوا تو وہ بہت غضبناک ہوا اور حکم دیا کہ بیت لحم اور اس کے گرد و نواح میں دو سال اور اس سے کم عمر کے تمام بچوں کو قتل کیا جائے۔ اسی دوران حضرتِ یوسف کو بھی خواب میں فرشتے نے بتایا کہ وہ حضرتِ مریمؑ اور حضرتِ عیسیٰؑ کو لے کر مصر چلا جائے۔ حضرتِ یوسف اُن کو لیکر مصر چلا گیا اور وہاں بغیر کسی خطرے کے اُن کی پرورش جاری رہی۔

جب ھِیــــرُوْدُس کا انتقال ہوا تو حضرتِ عیسیٰؑ کو واپس ارضِ اسرائیل جانے کا حکم ہوا۔ واپسی پر جب معلوم ہوا کہ اَرْخیــلاوس (Archelaus) اپنے باپ کی جگہ یہودیہ پر حکومت کر رہا ہے تو آپؑ کو اندیشہ ہوا اس لئے اُدھر جانے کے بجائے جلیل کے ایک گاؤں ناصرہ میں رہنے لگے۔ ناصرہ کی نسبت سے آپ کو عیسیٰ/یسوع ناصری کہا جاتا ہے۔ ناصرہ کو نصران بھی کہا جاتا ہے جس کی نسبت سے آپ کے پیرو نصاریٰ کہلاتے ہیں جو نصرانی کی جمع ہے۔

ناصرہ میں سکونت کے دوران معلوم ہوا کہ حضرتِ یحیٰ یہودیہ کے صحرا میں لوگوں کو وعظ و نصیحت کرتے اور بپتسمٰہ دیا کرتے تھے۔ اور لوگوں سے فرماتے تھے آج مَیں تمہیں پانی سے بپتسمٰہ دیتا ہوں میرے بعد جو آئے گا وہ تمہیں روح القدس اور آگ سے بپتسمٰہ دے گا۔ اسوقت حضرتِ عیسیٰؑ بھی بپتسمٰہ کے لئے ناصرہ سے اُردن گئے۔ حضرتِ یحیٰ نے آپ کو بھی بپتسمٰہ دیا اور اس کے بعد آپ صحرا میں عبادت وریاضت کے لئے گئے اور چالیس دن رات روزہ رکھا۔ اس دوران معلوم ہوا کہ ھِیرُوْدُس نے حضرتِ یحیٰ کو قید کیا ہے تو ناصرہ کو چھوڑ کر کَفَرنَاحُوم جو زَبُولُون اور نَفْتَالیم کے علاقے میں واقع جھیل کے کنارے ہے، سکونت اختیار کی اور یہیں سے دعوت کا آغاز کیا۔

دعوتِ حق کے سلسلے میں یہ ذکر کرنا ضروری ہے کہ اس زمانے میں بنی اسرائیل اخلاقی اور مذہبی لحاظ سے بہت گرے ہوئے تھے۔ اخلاقی اور مذہبی اصولوں کی پامالی اور حدود سے تجاوز کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ وہ انبیاء علیہم السلام کو قتل کرنے کے عادی ہوگئے تھے۔ اس پس منظر میں حضرتِ

عیسیٰؑ نے دعوت کا آغاز کیا اور فرمانے لگے: ''اے قوم! خدا کی طرف لوٹو کہ آسمانی سلطنت نزدیک ہے اور میری باتوں پر یقین کرو۔ مجھ سے پہلے تورات جو نازل ہوئی ہے اس کی تصدیق کرتا ہوں اور آپ کے لئے کچھ چیزیں جو حرام قرار دی گئی ہیں ان کو حلال قرار دیتا ہوں۔ مَیں تورات کی تکمیل کے لئے آیا ہوں نہ ابطال کے لئے۔'' آپ کی دعوت نہایت مؤثر تھی۔ لوگ آپ کے گرویدہ ہوگئے۔ آپ سے بہت سے معجزات کا ظہور ہوا مثلاً مُردوں کا زندہ کرنا، مادر زاد نابیناؤں کو بینا کر دینا، کوڑھی کو شفا دینا وغیرہ۔

چنانچہ اس ناموافق پس منظر کے باوجود معاشرے میں جو لوگ صاحبانِ معرفت، نیک طینت اور عاجز تھے انہوں نے آپ کی دعوت پر لبیک کہا اور اس کی نصرت پر کمربستہ ہوگئے۔ حضرتِ عیسیٰؑ نے دعوتِ حق کی منظّم اشاعت کے لئے اپنے پیروؤں سے بارہ کا انتخاب کیا اور ان کو حواری کا ٹائٹل دیا، جس کے معنی ناصر اور مددگار کے ہوتے ہیں، جن کے اسمائے گرامی انجیل متی کے مطابق درجِ ذیل ہیں:

(۱) سِمْعَان بِطْرُس/بُطْرُس (شمعون الصَّفَا) (۲) اَنْدَرَاوُس (برادرِ سِمْعَان)

(۳) یَعْقُوب بن زَبْدِی (۴) یُوحَنَّا (برادرِ یَعْقُوب)

(۵) فِیْلِبُّس/فِیْلُبُّس (۶) بَرْثُوْلَمَاوُس

(۷) تُوْمَا (۸) مَتَّی الْعَشَّار

(۹) یَعْقُوب بن حَلْفَی (۱۰) لَبَّاوُس مُلَقَّب به تَدَّاوُس

(۱۱) سِمْعَانُ الْقَانَوِیّ (۱۲) یَهُودَا الْاِسْخَرِیُوطِیّ

حضرتِ عیسیٰؑ کی علمی اور روحانی تربیت سے حواری اس قابل ہوگئے تھے کہ خود ان سے بھی کرامات و معجزات واقع ہوتے تھے مثلاً مُردوں کو زندہ کرنا، مادر زاد نابیناؤں کو بینا کرنا، ارواحِ خبیثہ پر قابو پانا وغیرہ۔ ان بارہ حواریوں میں سے آپ نے حضرتِ شمعون الصّفا کو اپنا اساس مقرر کیا اور دوسرے حواریوں کو حکم دیا کہ وہ ان کی اطاعت کریں۔

حضرتِ عیسیٰؑ اور آپ کے حواریوں کی انتھک کوششوں کے باوجود بنی اسرائیل سب نے دعوتِ حق

قبول نہیں کیا بلکہ صرف بامعرفت، پاک طینت اور عاجز لوگوں نے قبول کیا، جیسا کہ قرآن میں آیا ہے: ''فَاٰمَنَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ بَنِیٓ اِسْرَآءِیْلَ وَکَفَرَتْ طَّآئِفَةٌ'' (۱۴:۶۱)۔ ''پس بنی اسرائیل سے ایک گروہ ایمان لے آیا اور ایک گروہ نے انکار کیا۔'' اور جس طرح ہر پیغمبر کے ساتھ جِنّی و انسی شیاطین اور مجرمین نے عداوت و دشمنی کی ہے (۱۱۲:۶ ؛ ۳۱:۲۵)۔ ان منکرین نے بھی آپ کے ساتھ ایسا سلوک شروع کیا۔ دعوتِ حق سے جس میں انسان کی دنیوی بھلائی اور اخروی نجات مقصود ہوتی ہے، ان کی خود پرستی اور دنیا پرستی میں رُکاوٹ بننے کا اندیشہ پیدا ہوا تو اس کی تبلیغ میں ہرگونہ رُکاوٹ ڈالنے کی کوشش کی۔ صاحبِ دعوت کے خلاف حکومت کو اُکسایا کہ یہ شخص نہ صرف ہمارے دین میں فساد برپا کرتا ہے بلکہ عوام کو حکومت کے خلاف بغاوت پر بھی اُکساتا ہے اس لئے اس کو خاطر خواہ سزا ملنی چاہیئے۔ اس قسم کی سازشوں کی طرف قرآنِ حکیم کی آیت (۳:۵۴) میں اشارہ کیا گیا ہے: ''وَمَکَرُوْا وَمَکَرَاللّٰہُ ط وَاللّٰہُ خَیْرُالْمٰکِرِیْنَ۔'' ''اور یہودیوں نے (عیسیٰؑ کے خلاف) خفیہ تدبیر کی اور اللہ نے بھی خفیہ تدبیر کی۔ اور اللہ تدبیر کرنے والوں میں سب سے بہترین ہے۔''

حق و باطل کی یہ کشمکش جاری تھی کہ ایکدن حضرتِ عیسیٰؑ کو وحی آئی: ''اِذْ قَالَ اللّٰہُ یٰعِیْسٰٓی اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ وَرَافِعُکَ اِلَیَّ وَمُطَھِّرُکَ مِنَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَجَاعِلُ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْکَ فَوْقَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْٓا اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَةِ'' (۳:۵۵)۔ ''جب اللہ نے کہا: اے عیسیٰ مَیں تجھے وفات دینے والا ہوں اور اپنی طرف اُٹھانے والا ہوں اور کافروں سے پاک کرنے والا ہوں اور جن لوگوں نے تیری پیروی کی ہے اُن کو قیامت تک کافروں پر برتری دینے والا ہوں۔'' اس خطابِ الٰہی کے بعد آپؑ نے حواریوں سے فرمایا کہ مَیں نے بیت المقدس جانے کا ارادہ کیا ہے۔ یوروشلم میں ''فرزندِ انسان'' کو قتل کریں گے اور اس کو پھانسی پر چڑھائیں گے۔ الغرض حضرتِ عیسیٰؑ بیت المقدس پہنچے اور وعظ و نصیحت کرنے لگے لیکن منکرین ہدایت پانے کی جگہ اور زیادہ عداوت پر اُتر آئے۔

روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب حضرتِ عیسیٰؑ کو اپنی طرف اُٹھانے سے آگاہ کیا تو آپؑ نے حواریوں کے لئے دعوت تیار کرائی اور اُن کو بلایا کہ آج رات میرے پاس آنا، مجھے تمہارے ساتھ

خصوصی کام ہے۔ جب وہ اکٹھے ہوئے تو اُن کو کھانا کھلایا اور بنفسِ نفیس اُن کی خدمت کرتے رہے۔ جب وہ کھانے سے فارغ ہوئے تو اُن کے ہاتھ دُھلائے اور اپنے ہاتھ کے ساتھ اُن کو وضو کرایا اور اپنے کپڑوں کے ساتھ اُن کے ہاتھ صاف کرتے رہے۔ انہوں نے اس طرزِ عمل کو بُرا اور ناپسند سمجھا۔ آپؑ نے فرمایا: آج جس نے مجھے خدمت سے روکا وہ مجھ سے نہیں اور میرا اُس کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ انہوں نے اس بات کو تسلیم کیا۔ جب آپ فارغ ہوئے تو فرمایا: مَیں نے آج کھانا کھلاکر تمہاری خدمت کی ہے اور تمہارے ہاتھ دُھلائے ہیں۔ لہٰذا میرا یہ کام تمہارے لئے نمونہ ہونا چاہیئے۔ تم جانتے ہو کہ مَیں تم سب سے اچھا ہوں۔ لہٰذا تم بھی ایکدوسرے پر بڑے بننے کی کوشش نہ کرو۔ ایکدوسرے کی خدمت کرنا، جیسے میں نے تمہاری خدمت کی ہے۔[۹]

چنانچہ یہودیوں کے سرداروں، فقیہوں، فریسیوں اور صدوقیون نے آپؑ کے خلاف سازش شروع کی اور یہ طے پایا کہ آپ کی دعوت کو روکنے کے لئے اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں کہ حکومت کو آپ کے خلاف اُکساکر ان کو دار پر چڑھا جائے۔ چنانچہ وہ **بِیْلَاطُسُ الْبُنْطِیّ** (Pontius Pilate) کے دربار میں گئے جو اس وقت قیصرِ روم کی طرف سے یہودیہ کا گورنر تھا۔ وہ کذب و افترا اور دروغگوئی سے **بِیْلَاطُس** کو قائل کرنے میں کامیاب ہوگئے کہ آپؑ دین اور حکومت دونوں کیلئے خطرناک ہیں۔ اس کے نتیجے میں **بِیْلَاطُس** نے ان کو اجازت دی کہ ان کو گرفتار کرکے دربار میں پیش کریں۔ وہ لوگوں کی آپ کے لئے بے پناہ محبت کی وجہ سے برملا آپ کو گرفتار نہیں کرسکتے تھے۔ اس لئے آپؑ کے شاگردوں میں سے ایک کو چاندی کے تیس سِکّے کی رشوت دے کر راضی کیا کہ وہ آپؑ کی جائے سکونت کی نشاندہی کرے۔ بالآخر اس نے آپؑ کے مکان کی نشاندہی کی۔ آپ کو گرفتار کیا گیا، مقدمہ چلایا گیا اور آپؑ کو سولی پر چڑھایا گیا اور آپؑ شہادتِ عظمیٰ پر فائز ہوگئے۔

حضرتِ عیسیٰؑ کو جسمانی اذیّت دے کر منکرینِ حق یہ سمجھنے سے قاصر رہے کہ ربُّ العزّت پیروانِ حق کو جسمانی موت کے باوجود زندۂ جاوید (۱۶۹:۳) اور پیروانِ باطل کو جسمانی طور پر زندہ ہونے کے باوجود ''**اَمۡـوَاتٌ غَیۡـرُ اَحۡیَـآءٍ**'' (۲۱:۱۶) ''وہ مُردے ہیں زندہ نہیں'' قرار دیتا ہے۔ انکی جسمانی شہادت

سے وہ یہ سمجھے کہ وہ اپنے مذموم مقصد میں کامیاب ہوگئے۔ لیکن خیر الماکرین نے جس طرح آپ سے وعدہ کیا تھا کہ: ''یٰعِیۡسٰۤی اِنِّیۡ مُتَوَفِّیۡکَ وَرَافِعُکَ اِلَیَّ وَمُطَهِّرُکَ مِنَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا وَجَاعِلُ الَّذِیۡنَ اتَّبَعُوۡکَ فَوۡقَ الَّـذِیۡـنَ کَفَرُوۡا اِلٰی یَوۡمِ الۡقِیٰمَةِ'' (۵۵:۳)۔ ''اے عیسیٰ میں تجھے وفات دینے والا ہوں اور اپنی طرف اُٹھانے والا ہوں اور کافروں سے پاک کرنے والا ہوں اور جن لوگوں نے تیری پیروی کی ہے اُن کو قیامت تک کافروں پر برتری دینے والا ہوں۔'' نیز ''وَقَـوۡلِهِـمۡ اِنَّـا قَتَـلۡنَا الۡمَسِیۡحَ عِیۡسَی ابۡنَ مَرۡیَمَ رَسُوۡلَ اللّٰهِ وَمَـا قَتَلُوۡهُ وَمَا صَلَبُوۡهُ وَلٰکِن شُبِّهَ لَهُمۡ ط وَاِنَّ الَّـذِیۡـنَ اخۡتَلَفُوۡا فِیۡهِ لَفِیۡ شَکٍّ مِّنۡهُ ط مَـا لَهُمۡ بِهٖ مِنۡ عِلۡمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الـظَّـنِّ وَمَـا قَتَلُوۡهُ یَقِیۡناً - بَلۡ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَیۡهِ ط'' (۱۵۷:۴-۱۵۸)۔ ''اور ان کے اس قول کے باعث کہ بیشک ہم نے اللہ کے رسول مسیح عیسیٰ ابنِ مریم کو قتل کر دیا۔ حالانکہ نہ انہوں نے اسے قتل کیا اور نہ ہی اسے سولی دی بلکہ معاملہ ان کے لئے مشتبہ کر دیا گیا۔ اور بیشک وہ لوگ جنہوں نے عیسیٰ کے بارے میں اختلاف کیا وہ البتہ اس کی طرف سے شک میں ہیں۔ انہیں اس کا علم ہی نہیں سوائے گمان کی پیروی کرنے کے۔ اور یقیناً انہوں نے اسے قتل نہیں کیا بلکہ اللہ نے اسے اپنی طرف اُٹھا لیا۔'' اپنے وعدے کے مطابق آپؑ کو جسمِ لطیف میں اپنی طرف بلند کیا، ہر چند کہ جسمِ کثیف کے ساتھ جو گستاخی کرنی تھی، کی گئی۔

جسمِ کثیف کے ساتھ گستاخی کرکے اور آپؑ کو پھانسی کی سزا دلا کر دشمن یہ سمجھے کہ اس سے حضرتِ عیسیٰؑ جو دعوتِ حق کا کام کرتے تھے اس کا خاتمہ ہوگا۔ لیکن ان کا مکر مکرِ ایزدی کے مقابلے میں باطل ہوگیا اور آپؑ کی دعوت میں روز افزوں ترقی ہوتی گئی۔

حضرتِ عیسیٰؑ کی جسمانی وفات کے بارے میں مسلمانوں اور اہلِ کتاب کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے اور پھر خود اہلِ کتاب اور مسلمانوں کے درمیان بھی اختلاف پایا جاتا ہے۔ عیسائیوں اور یہودیوں دونوں کے ہاں حضرتِ عیسیٰؑ کی وفات صلیب پر ہوئی۔ لیکن عیسائیوں کے ہاں قبر سے زندہ ہوکر جسمِ عنصری کے ساتھ آسمان پر چلے گئے اور یہودیوں کے ہاں ایک مجرم کی صورت میں اس کو سزا مل گئی اور آپؑ کے جسد کو آپؑ کے پیرو محافظوں کی بے خبری میں چُرا کر لے گئے۔

مسلمانوں میں سے اہلِ ظاہر کے ہاں حضرتِ عیسیٰؑ سرے سے صلیب پر گئے ہی نہیں بلکہ یہودا جس نے یہودی مذہبی لیڈروں سے رشوت لے کر آپ کی نشاندہی کے لئے اس مکان میں جس میں آپ روپوش تھے، داخل ہوا تھا، اس کی شکل حضرتِ عیسیٰ کی شکل میں بدل گئی اور اسی کو پکڑ کر سولی پر چڑھایا گیا اور جو بھی اہانت آمیز سلوک کیا گیا، اسی کے ساتھ کیا گیا جبکہ خود حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام کو اس مکان کے روزن کے راستے خدا کی طرف اُٹھایا گیا اور اس طرح حضرتِ عیسیٰؑ ہر لحاظ سے دشمنوں کے ہاتھوں بے حرمتی سے محفوظ رہے۔ اہلِ ظاہر کے نزدیک **شُبِّہَ لَهُم** کی تفسیر یہ ہے۔

اہلِ باطن کے نزدیک حضرتِ عیسیٰؑ کی جسمانی شہادت صلیب پر ہوئی جس کے ذریعے آپؑ نے دینِ حق کے لئے قربانی کی ایک عظیم مثال قائم کی۔ البتہ روحانی لحاظ سے جسمِ لطیف میں خدا نے آپؑ کو اپنی طرف بلند کیا۔ ہمارے زمانے میں اس سلسلے میں استادِ بزرگوار حضرتِ علامہ نصیرالدین نصیر صاحب ہونزائی اپنے ایک مقالے ''حضرتِ عیسیٰ روح ہیں یا جسم'' میں لکھتے ہیں کہ: ''حضرتِ عیسیٰؑ کی پاک روح کو اللہ تعالیٰ نے حسبِ وعدہ کافروں کے درمیان سے اُٹھا لیا اور ان کا مبارک جسم جو روح کے جامۂ فرسودہ کی حیثیت سے تھا کافروں کو دے دیا تاکہ وہ از روئے قانون انتہائی گنہگار قرار پائیں۔ اور **شُبِّـهَ لَهُم** کا مطلب یہ ہے کہ ہر انسان کی ظاہری شخصیت کے متعلق یہ گمان ہوتا ہے کہ آدمی یہی کچھ ہے۔ چنانچہ کافروں نے حضرتِ عیسیٰ کے جسم پر قابو پاکر یہ سمجھا تھا کہ عیسیٰ یہی کچھ ہے حالانکہ حقیقی اور روحانی عیسیٰؑ اور تھے، جس پر یہ لوگ ہرگز قابو نہیں پاسکے تھے۔''[۱۰]

حضرتِ عیسیٰؑ کا آسمان سے نزول اور اس کی حکمت: نزولِ عیسیٰؑ کے عقیدے پر تمام اسلامی فرقوں کا اتفاق ہے۔ ناطقانِ شش گانہ میں سے یہ حضرتِ عیسیٰؑ کی تخصیص ہے کہ آپ کا قیامت کے وقت دوبارہ اس دنیا میں نزول ہوگا۔ قرآنِ کریم میں آپ کو قیامت کی نشانیوں میں قرار دیا گیا ہے(۶۱:۴۳)۔

آپؑ کے نزول کے بارے میں یہ سوال اٹھایا گیا ہے کہ تمام ناطقوں میں سے دوبارہ نزول کے لئے صرف آپؑ کے انتخاب میں کیا حکمت ہے؟ اہلِ تاویل میں سے کچھ بزرگوں نے اس بارے میں فرمایا ہے کہ حسبِ فرمودۂ حضرتِ ربُّ العزت '' **كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِىْ** '' (۲۱:۵۸)۔ ''اللہ نے لکھ دیا ہے

کہ میں اور میرے رسول ہی غالب ہوکر رہیں گے۔'' تمام ناطقوں کو اپنے دشمنوں پر غالب آنا چاہئے۔ لیکن حضرتِ عیسیٰؑ کے بارے میں ہم دیکھتے ہیں کہ جسمانی اور ظاہری طور پر دشمنوں پر غالب ہونے کی جگہ خود ان سے مغلوب ہوگئے تھے۔ اس لئے قدرت کی طرف سے یہ فیصلہ ہوا کہ آپؑ حضرتِ قائم القیامت کے زمانے میں دوبارہ دنیا میں آئیں گے اور آپ علینا منہ السلام کی تائید سے اپنے دشمنوں پر غالب آئیں گے اور اُن سے انتقام لیں گے۔[11]

اس بارے میں کئی ایک احادیث مروی ہیں۔ چنانچہ بخاری اور مسلم دونوں میں حضرتِ ابوہریرہ سے روایت ہے: **قَالَ رَسُولُ اللہ صَلَّی اللہ علیہ [وآلہ] وسَلَّم: "وَالَّذِی نَفْسِی بِیَدِہٖ لَیُوشِکَنَّ اَنْ یَنْزِلَ فِیْکُمُ ابْنُ مریمَ حَکَمًا عَدَلًا فَیَکْسِرَا لصَّلِیْبَ وَیَقْتُلِ الخنزِیرَ وَیَضَعَ الجِزْیَۃَ وَیَفِیضَ المالُ حَتّٰی لَایَقْبَلَہُ اَحدٌ۔"**[12] رسول اللہؐ نے فرمایا: ''اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے! ضرور وہ وقت آنے والا ہے کہ تم میں عیسیٰؑ بن مریمؑ حاکم عادل بن کر نازل ہوں گے۔ وہ صلیب کو توڑیں گے اور خنزیز کو قتل کریں گے اور جزیہ اُٹھا دیں گے۔ اور مال کی اس درجہ کثرت ہوگی کہ کوئی اس کو قبول کرنے والا نہیں ملے گا۔'' اسی حدیث کو ترمذی نے بھی اپنی جامع میں بیان کیا ہے۔

نیز بخاری اور مسلم میں ابوہریرہ سے روایت ہے: **قَالَ رسولُ اللہِ صَلَّی اللہُ علیہ [وآلہ] وسلّم: "کَیفَ اَنْتُم اِذَا نَزَلَ ابنُ مریمَ فیکم و امامُکُم مِنْکُم۔"**[13] رسول اللہؐ نے فرمایا: ''اُس وقت تمہارا کیا حال ہوگا جب تم میں ابنِ مریمؑ اُتریں گے اور اس حالت میں اُتریں گے کہ تم میں سے ایک شخص تمہاری امامت کر رہا ہوگا۔'' اہلِ ظاہر کی کتابوں میں نزولِ عیسیٰؑ کے بارے میں ایسی بہت سی حدیثیں ہیں جن میں آپؑ کے حُلیے، لباس اور اُترنے کے مقام کے بارے میں بھی تفصیلات ہیں۔

اہلِ تاویل کا کہنا ہے کہ نزولِ عیسیٰؑ کا تعلق قیامت سے ہے اور قیامت ایک روحانی عمل ہے اس لئے اس کا ادراک حواسِ ظاہر سے نہیں ہوتا۔ اس لئے قرآنِ حکیم میں قیامت کے بارے میں عوام کے حوالے سے کئی مرتبہ ''وَھُمْ لَایَشْعُرُوْنَ'' (۱۲:۱۰۷ ؛ ۴۳:۶۶) آیا ہے۔ یعنی عوام کو قیامت کا علم نہیں ہوتا صرف صاحبانِ تاویل اور اہلِ معرفت کو اس کا علم ہوتا ہے۔ اس لئے جس طرح عوام کے

لئے حضرتِ قائم القیامت کی شناخت ممکن نہیں اسی طرح حضرتِ عیسیٰؑ کی شناخت بھی ظاہری حُلیے اور لباس سے ممکن نہیں بلکہ علم و معرفت کی روشنی میں آپؑ کی شناخت ممکن ہے۔

کتبِ تاویل سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب بھی کوئی قیامت برپا ہوتی ہے حضرتِ قائم کے ساتھ ایک عیسیٰؑ بھی نازل ہوتا ہے جو آپ علینا منہ السلام کے حدود میں سے ایک عظیم حد کی حیثیت میں کام کرتا ہے۔ جیسا کہ الموت میں جب قیامت برپا ہوئی تو سیدنا حسن صباح (قَدَّسَ اللهُ سِرَّهٗ) نے حضرتِ عیسیٰؑ کا کام کیا اور حضرتِ قائم کا کام حضرتِ مولانا حسن علیٰ ذکرہٖ السلام نے۔[14] کتبِ دعوت میں آیا ہے: ''اِذَا قَامَ الْقَائمُ نَزَلَ الْمَسِیْحُ مِنَ السَّماءِ فَیُصَلِّی خَلْفَهٗ۔''[15] ''جب قائم قیامت برپا کریں گے تو آسمان سے مسیح کا نزول ہوگا اور آپ کے پیچھے نماز پڑھے گا۔'' اس سے مراد یہ ہے کہ حضرتِ عیسیٰؑ دنیا میں آئیں گے اور حضرتِ قائم کی اطاعت کریں گے اور آپؑ کے حکم کے مطابق سرکش دشمنانِ دین سے انتقام لیکر اُن پر غالب آئیں گے۔ اس طرح خدا نے اپنے رسولوں سے جو وعدہ کیا ہے وہ مکمل ہوگا۔ اَلحَمْدُلِلّٰهِ عَلٰی مَنِّهٖ وَاِحْسَانِهٖ۔

فقیرِ حقیر
مرکزِ علم و حکمت، لندن

یادداشتہا:

(۱) مولانا محمد حفظ الرحمٰن سیوہاروی، قصص القرآن، جلدِ چہارم (لاہور، ۲۰۰۰ء)، ص،۱۹ ؛ سید امداد حسین، تفسیر المتقین (لاہور، تاریخ ندارد)، ص،۶۹ پر لکھتے ہیں: ''مریم یہودیوں کی لغت میں عابدہ کے معنوں میں آتا ہے''۔

(۲) تفسیر المتقین، ص،۶۹۔

(۳) میرزا محمد تقی سپہر، ناسخ التواریخ، حضرتِ عیسیٰؑ (تہران، ۱۳۵۲ شمسی)، ص،۳۔

(۴) سیدنا جعفر بن منصور الیمن، سرائر و اسرار النطقاء، تصحیح مصطفیٰ غالب (بیروت، ۱۹۸۴)، ص،۲۰۱۔

(۵) ایضاً، ص،۲۰۱۔

(۶) علامہ نصیرالدین نصیر ہونزائی، معرفت کے موتی، حصۂ دوم (کراچی، ۱۹۸۳)، صص،۶۰-۷۳۔

(۷) کارنامۂ زرین، حصۂ سوم (کراچی، ۱۹۹۶)، صص،۱۳۷-۱۴۰۔

(۸) ناسخ التواریخ، حضرتِ عیسیٰؑ ، ص،۷۔

(۹) ابنِ کثیر، قصص الانبیاء، ترجمۂ اردو محمد عبداللہ (لاہور، تاریخ ندارد)، ص،۷۲۹۔

(۱۰) علامہ نصیرالدین نصیر ہونزائی، پنج مقالہ نمبر ۲ (کراچی، ۱۹۷۷)، صص،۳۰-۳۷۔

(۱۱) سیدنا ابو یعقوب سجستانی، کشف المحجوب، تصحیح ہنری کربین (تہران، ۱۹۸۹)، صص،۷۹-۸۰۔

(۱۲) محمد بن اسماعیل البخاری، صحیح (ریاض، ۱۹۹۹)، ص،۳۵۴۔

(۱۳) ایضاً، ص،۵۸۱۔

(۱۴) خواجہ نصیرالدین طوسی، روضۂ تسلیم، تصحیح سید جلال بدخشانی (لندن، ۲۰۰۵)، صص،۱۹۵-۱۹۸۔

(۱۵) سرائر و اسرار النطقاء، ص،۲۲۷۔

اسماعیلی مذہب کی اشاعت میں میرانِ ہنزہ کی باقیاتِ صالحات

باقیاتِ صالحات سے عام طور پر وہ نیک اور دیرپا کام مراد لئے جاتے ہیں جو کسی نکوکار شخص کے دنیا سے جانے کے بعد بھی باقی رہتے ہیں اور لوگ ان سے استفادہ کرتے رہتے ہیں۔ ایسے اعمالِ صالحہ کی اہمیت کے بارے میں کیا شک ہو سکتا ہے۔ لیکن اس سلسلے میں یہ جاننا ضروری ہے کہ مادی دنیا کی شکست و ریخت سے یہاں کوئی بھی دیرپا سے دیرپا کام کا اثر ہمیشہ کیلئے نہیں رہ سکتا۔ اس لئے حقیقی معنوں میں وہ اعمالِ صالحہ جو دنیا کی شکست و ریخت سے محفوظ ہمیشہ کیلئے جاری و ساری رہ سکتے ہیں وہ وہ اعمالِ صالحہ ہیں جو دینِ حق سے وابستگی سے وجود میں آتے ہیں، ایسے کاموں کی وہ شان ہے کہ ان کی برکت سے دانستہ یا نادانستہ اگر کوئی برائیاں بھی سرزد ہوئی ہوں تو وہ بھی نیکیوں میں بدل جاتی ہیں۔

میرانِ ہنزہ کی یہ ابدی سعادت ہے کہ انہوں نے اسماعیلی مذہب کی صورت میں خود کو دینِ حق سے وابستہ کر دیا اور نہ صرف خود اس مقدس مذہب کو قبول کیا بلکہ ساتھ ساتھ اپنے شاہی اثر و نفوذ سے اپنی رعیت کو اس پاک مذہب کی علمی و عرفانی روشنی سے منور کر دیا۔ یقیناً ان کی ان باقیاتِ صالحات کا اجر اس دنیا سے بڑھ کر عالمِ روحانی میں یہاں کی شکست و ریخت سے آزاد روحانی بادشاہی، ابدی راحت اور سرمدی سرور و شادمانی کی صورت میں ہمیشہ ان کے ساتھ باقی رہے گا۔

اس مختصر مضمون میں میرانِ ہنزہ کے ان باقیاتِ صالحات یعنی حقیقی معنوں میں آخرت میں ہمیشہ باقی رہنے اور دنیا میں ہمیشہ علمی اور عرفانی فائدے پہنچانے والے کارناموں پر کچھ روشنی ڈالنے کی کوشش کی جائے گی جو انہوں نے اسماعیلی مذہب کی اشاعت کے سلسلے میں انجام دئے ہیں۔

دینِ اسلام دینِ فطرت کی حیثیت میں ایک آفاقی دین ہے۔ اس کی آفاقی تعلیمات کی اشاعت کے لئے زمان و مکان کے تقاضوں کے اعتبار سے الگ الگ وسائل استعمال ہوئے ہیں۔ دینِ اسلام کی گونا گون صورتوں میں سے ایک صورت اسماعیلی مذہب کی ہے۔ چنانچہ اس مذہب کی تبلیغ میں بھی ایسے ہی گونا گون وسائل استعمال ہوئے ہیں۔ کہیں اس کی تبلیغ نہایت پوشیدہ طریقے سے کی گئی ہے اور

کہیں اعلانیہ طور پر۔ اہالیانِ ہنزہ کی یہ بہت بڑی نیک بختی ہے کہ یہاں پر اس پاک مذہب کو قبول کرنے کی ابدی سعادت سب سے پہلے یہاں کے حکمرانوں کو نصیب ہوئی اور ان کے ایمان اور اعتقادِ محکم اور اثر و نفوذ کے ذریعے ان کی رعیت کو۔

<u>ہنزہ میں پہلی بار اسماعیلی شیعی مذہب کی آمد:</u> ہنزہ میں اسلام کب اور کس اسلامی صورت میں آیا، اس کے بارے میں ایک روایت یہ ہے کہ یہاں پر اسلام سب سے پہلے چودھویں صدی میں مولانا قاسم شاہ الحسینی، علیہ السلام (سنِ امامت ۱۲۹۰-۱۳۳۵ء) کی امامت کے دوران اسماعیلی مذہب کی صورت میں آیا۔ اس کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ گلگت کے تیرھویں راجہ ترا خان کے عہدِ حکومت (سنِ حکومت ۱۳۱۰-۱۳۳۵ء) میں اس کی اپنے چھوٹے سوتیلے بھائی شاہ رئیس خان کے ساتھ اَن بَن ہوئی، جس کے نتیجے میں شاہ رئیس خان اپنے حشم و خدم اور دوستوں کی ایک کثیر تعداد کے ساتھ بدخشان کی طرف چلا گیا۔ اس زمانے میں بدخشان میں تاج مغل کے نام سے ایک بادشاہ حکومت کر رہا تھا۔ جو نہ صرف ایک بادشاہ تھا بلکہ اسماعیلی شیعی امامی اسلام کا ایک داعی بھی تھا۔ بادشاہ نے شاہ رئیس خان کے ساتھ نہایت اچھا سلوک کیا، یہاں تک کہ اس کو اپنا داماد اور سپہ سالار بنایا۔ شاہ رئیس خان نے بادشاہ کے حُسنِ سلوک سے بہت متاثر ہوکر اپنے حشم و خدم اور دوستوں کے ساتھ نہ صرف خود اس مذہب کو اختیار کیا، بلکہ ساتھ ساتھ بادشاہ کو یہ مشورہ بھی دیا کہ اس پاک مذہب کو گرد و نواح میں بھی کیوں نہ پھیلا دیا جائے۔

چونکہ بادشاہ اپنے مذہب کا ایک داعی بھی تھا اور اس کی تبلیغ اس کا فرض تھا، اس لئے اس کو یہ مشورہ بہت پسند آیا اور اس اہم ترین فرض کو انجام دینے کیلئے ۱۳۲۰ء میں ایک لشکرِ جرّار تیار کیا اور چترال سے لیکر یاسین، کوہِ غِذر اور پُونیال تک کو فتح کرتے کرتے اور اسماعیلی مذہب پھیلاتے ہوئے گلگت تک پہنچ گیا، جہاں راجہ ترا خان (۱۳۱۰-۱۳۳۵ء) نے بھی اسی پاک اسماعیلی مذہب کو قبول کیا۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ راجہ ترا خان کے عہد سے راجہ مرزا خان (۱۵۶۵ء-۱۶۰۰ء) کے عہد تک ترا خانی خاندان اسماعیلی مذہب کے پیرو تھے۔ لیکن مرزا خان کے عہد میں جب چترال کے حکمران شاہ ناصر رئیس (۱۵۳۱-۱۵۵۴ء) کے سپہ سالار سنگین علی (متوفی ۱۵۸۵ء) نے گلگت پر حملہ کیا تو وہ اس کے حملے کے

تاب نہ لا سکا۔ وہ بھاگ کر بلتستان چلا گیا اور وہاں اثناعشری مذہب اختیار کیا۔

شاہ رئیس خان مؤلفِ تاریخِ گلگت کے بقول تاج مغل نے گلگت کے بعد ہنزہ میں بھی اسماعیلی مذہب کو پھیلایا اور چترال کے راستے واپس بدخشان چلا گیا۔ لیکن بقولِ حشمت اللہ خان مؤلفِ تاریخِ جموں اور غلام مرتضٰی مؤلفِ تاریخِ چترال، تاج مغل ہنزہ میں اسی مذہب کو پھیلاکر سریقول کے راستے کاشغر اور یارقند گیا اور وہاں بھی یہی مذہب پھیلایا۔

اگر تاج مغل کے اسماعیلی مذہب کو ہنزہ میں پھیلانے کی ان روایات کو تسلیم کیا جائے تو ایسا لگتا ہے کہ اس نے اسماعیلی مذہب کو جاری اور برقرار رکھنے کے لئے اس کی تعلیمات کو سکھانے اور سمجھانے کا کوئی معقول انتظام نہیں کیا، اس لئے لوگ یہ مذہب بھول گئے۔ لہٰذا اس دور میں اس پر عمل کرنے کے کوئی آثار باقی نہیں رہے ہیں۔

ہنزہ میں اثناعشری شیعی مذہب کی آمد: کہتے ہیں کہ ہونزہ میں جب مَیُوری تھم کا بیٹا عیاشوؒ دوم حکمران ہؤا تو اس نے اسکردو (بلتستان) کے حکمران ابدال خان (۱۶۳۳-۱۶۳۴ء) کی بیٹی شہ خاتون سے شادی کی۔ اسی رشتہ کی وجہ سے بلتستان سے ہنزہ میں اثناعشری شیعی مذہب بھی آیا اور دوسری بار اسماعیلی مذہب آنے تک یہاں کا مذہب رہا۔

ہنزہ میں دوسری بار اسماعیلی شیعی مذہب کی آمد: کہتے ہیں کہ میر شاہ سِلُم (سلیم) خان (متوفی ۱۸۲۳ء) جو عیاشوؒ خاندان کا انیسواں حکمران تھا، نے حضرتِ مولانا شاہ حسن علی الحسینی، علیہ السلام (سنِ امامت ۱۸۱۸-۱۸۸۱ء) کے عہدِ امامت میں ذاتی طور پر اسماعیلی مذہب کو قبول کیا۔

روایت ہے کہ انکے عہد کے اخیر میں حضرتِ شاہ اردبیل کا بدخشان سے ہنزہ میں ورود ہؤا اور اسماعیلی مذہب کے بارے میں میر موصوف کے ساتھ گفت و شنید ہوئی۔ چونکہ میر موصوف بدخشان میں اپنی جلا وطنی کے دوران اس پاک مذہب سے واقف ہو چکے تھے، اسلئے انہوں نے نہایت خوشی کے ساتھ ذاتی طور پر اس مذہب کو قبول کیا اور حضرتِ اردبیل کے بابرکت ہاتھ پر زمانے کے امامِ برحق مولانا شاہ حسن علی، علیہ السلام، کے لئے بیعت دی۔ لیکن رعیت میں دعوت دینے کے سلسلے میں یہ عُذر پیش کیا کہ سرِ دست اس عظیم کام کیلئے فرصت نہیں اور جیسے ہی فرصت میسر آئے گی آپ کو اس کام

کیلئے بُلا لیں گے۔ اس پر حضرتِ شاہ اردبیل میر موصوف سے رخصت لے کر واپس بدخشان چلے گئے۔

جب حضرتِ شاہ اردبیل واپس بدخشان جا رہے تھے اس وقت میر شاہ سِلُم خان نے آپ سے سوال کیا کہ اگر رعیت کے اسماعیلی مذہب قبول کرنے سے پہلے مجھے موت آ جائے تو میری تجہیز و تکفین وغیرہ کون کرے گا؟ پیر موصوف نے فرمایا کہ اِن شاء اللہ تعالیٰ اُس وقت اسماعیلی داعیوں میں سے کوئی ضرور آئے گا۔ چنانچہ جب میر موصوف کی وفات کا وقت قریب آیا تو آپ کو تجہیز و تکفین اور نمازِ جنازہ کی بڑی فکر لاحق ہوئی اور اس بات کا انتظار تھا کہ پیر کے وعدے کے مطابق آخری وقت میں کوئی آئے گا؟ لہٰذا آپ اپنے معتمدین سے کہتے رہتے تھے کہ دیکھو کیا کوئی مشرق کی طرف سے آ رہا ہے؟ آپ سے کہا گیا کہ ہاں دور میدان سے کوئی سوار اس طرف آ رہا ہے۔ یہ سوار حضرتِ پیر شاہ حسین ابنِ شاہ اردبیل تھے۔ میر شاہ سِلُم خان نے آپ کی آمد کا سُن کر دل میں جو راز تھا وہ فاش کر دیا کہ حضرتِ شاہ اردبیل نے جو فرمایا تھا کہ آخری وقت میں کوئی داعی آئے گا وہ درست نکلا۔ جب حضرتِ شاہ حسین آپ کے بالین پر پہنچے تو میر موصوف نے خدا کا شکر بجا لایا اور جان جان آفرین کے سپرد کیا۔ حضرتِ شاہ حسین نے غسل کا پانی تیار کرکے محرم شریف کو دیا اور اُس نے میر موصوف کو غسل دیا اور تکفین کے بعد بدخشان کے اسماعیلیوں کی روایت کے مطابق نمازِ جنازہ پڑھائی اور آپکے جسدِ خاکی کو جسمانی قبر میں دفن کیا گیا۔ تیسرے دن رسمِ چراغ روشن قائم کیا گیا۔ اشاعتِ دعوت کے پہلے دور یعنی تاج مغل کے دعوت پھیلانے کے کوئی آثار اس وقت باقی نہیں تھے، اشاعتِ دعوت کے دوسرے دور کے اعتبار سے اس کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ ہنزہ میں پہلی بار چراغ روشن کی رسم جاری ہوئی۔

میر سِلُم خان کی عمر کا صحیح علم نہیں۔ البتہ اتنا معلوم ہے کہ آپ نے ۳۳ سال حکومت کی اور ۱۲۳۹ھ/۱۸۲۳ء میں وفات پائی۔ آپ علاقۂ گوجال کے قریۂ گلمت میں مدفون ہیں۔

میر شاہ سِلُم خان کی وفات کے بعد آپ کی اولاد حصولِ جانشینی کے مسئلے میں اُلجھ گئی۔ اور پھر سے رعیت میں اسماعیلی مذہب کو پھیلانے کا موقع نہیں ملا اور حضرتِ شاہ حسین واپس بدخشان چلے گئے۔

عہدِ مبارک میر شاہ غضنفر خان اور اسماعیلی مذہب کی عمومی دعوت: کہتے ہیں کہ میر شاہ غضنفر خان

کی حکومت کو پندرہ سال ہوئے تو آپ کو حضرتِ شاہ حسین ابنِ شاہ اردبیل کو اسماعیلی مذہب کی اشاعت کے لئے بدخشان سے بلانے کا خیال آیا۔ چونکہ میر شاہ سِلُم خان کی وفات کے وقت اسماعیلی مذہب کو پھیلانے کے لئے ان کو بلانے کا وعدہ کیا تھا، اس لئے آپ نے وعدہ وفا کرنے کے لئے گنش کے حاجی تُراب ولد کویو کو بدخشان بھیج دیا اور اُس نے میر موصوف کی طرف سے حضرتِ شاہ حسین کو دعوت دی۔ آپ نے میر موصوف کی دعوت کو قبول فرمایا اور ہنزہ کی طرف روانہ ہوگئے۔ جب بروغیل اور ورشگوم کے راستے سے ہوتے ہوئے ھُنی (اب ناصرآباد) پہنچے تو میر موصوف نے ان کے استقبال کے لئے وزیر زادہ زینت شاہ ابنِ وزیر پُنو کے ساتھ چند معززین کو ادھر بھیج دیا۔ جب معززین ھُنی میں سید موصوف کی خدمت میں پہنچے تو وزیر زادہ زینت شاہ نے امامِ روزگار کے لئے آپ کے ہاتھ پر بیعت دی اور اسماعیلی مذہب کو قبول کیا۔ حاجی تُراب، جو سید موصوف کے ہمرکاب تھا، نے دوسرے معززین کو بیعت کرنے سے منع کیا اور کہا کہ جب تک حضرتِ سید شاہ حسین میر شاہ غضنفر خان سے ملاقات نہ کریں اور میر موصوف خود ان کی بیعت نہ کریں تب تک آپ انتظار کریں۔ جب وہ سب وہاں سے روانہ ہو کر میر موصوف کی خدمت میں پہنچے تو حاجی تُراب نے وزیر زادہ زینت شاہ کے خلاف شکایت کی اور کہا کہ وزیر زادہ زینت شاہ نے ھُنی میں حضرتِ پیر سید شاہ حسین کے ہاتھ پر بیعت کرکے اسماعیلی مذہب کو قبول کیا ہے۔ ساتھ ساتھ یہ بھی کہا ہے کہ آپ ہمارے پیر بھی ہوں گے اور میر بھی۔

میر شاہ غضنفر خان یہ سُن کر ناراض ہوگئے اور حضرتِ سید شاہ حسین کے ہاتھ پر بیعت نہیں دی اور اسماعیلی مذہب کو قبول کرنے سے رُک گئے۔ حضرتِ سید شاہ حسین کو میر موصوف نے رُخصت کیا اور آپ بغیر مقصد برآوری کے واپس بدخشان چلے گئے۔

اسی دوران حضرتِ سید یاقوت شاہ ابنِ سید شاہ عبدالرحیم اوّل جو کہ بدخشان کے علاقہ جات زیباک، شاخدرہ، اشکاشم وغیرہ کی اسماعیلی جماعت کے معلمین اور دعاۃ میں سے تھے، محلّات (ایران) میں امامِ زمان مولانا شاہ حسن علی علیہ السلام کے دیدارِ مقدس سے مشرف ہو کر ہرات اور خوقند کے راستے سریقول آکر وہاں سے ہنزہ میں وارد ہوئے۔ جب میر شاہ غضنفر خان کو ان کے ہنزہ آنے کی اطلاع

ملی تو میر موصوف نے آپ کے استقبال کیلئے اپنے اکابرین کو مسگار تک بھیجا تاکہ کمالِ احترام کے ساتھ آپ کو دارالحکومت تشریف لانے کی دعوت دیں۔ معلّم موصوف نے کمالِ شادمانی کے ساتھ دعوت قبول فرمائی اور دارالحکومت کی طرف روانہ ہوگئے۔ حضرتِ سید یاقوت شاہ کے دارالحکومت پہنچتے ہی کمالِ عقیدت کے ساتھ میر موصوف نے اُن کے مبارک ہاتھ پر امامِ روزگار مولانا شاہ حسن علی، علیہ السلام، کے لئے بیعت دی۔ آپ کے بعد وزیر پُنو نے بیعت دی اور آپ کے بعد بلتت اور التت کے باشندوں نے بیعت دی اور اس پاک مذہب کے فیوض و برکات سے سب مستفید اور مشرف ہوگئے۔

حضرتِ پیر یاقوت شاہ نے اسماعیلی مذہب کی تعلیم کی خاطر ہنزہ کے گِنے چُنے خواندہ لوگوں سے اپنے نائبوں یا خلیفوں کو مقرر فرمایا۔ ان کا فرضِ منصبی یہ تھا کہ وہ نکاح، نمازِ جنازہ اور چراغ روشن وغیرہ کو بدخشان کے اسماعیلیوں کے آئین کے مطابق جاری کریں اور جاری رکھیں۔

اُس وقت حضرتِ یاقوت شاہ نے جو تعلیم دی تھی وہ بہت مختصر مگر جامع تھی۔ اوّل: جو اسماعیلی مذہب میں داخل ہوتے ہیں وہ سب سے پہلے مولانا علی المرتضیٰؑ کی امامت و خلافت کا اقرار کریں۔ دوم: ہفت ارکانِ شریعت پر تأویل کی صورت میں عمل کریں۔ سوم: عبادت و بندگی دف و رباب کے ساتھ بجا لائیں۔ آپ نے ہنزہ میں پچیس دن قیام فرمایا۔

پچیس دن قیام کے بعد حضرتِ سید یاقوت شاہ نے میر شاہ غضنفر خان سے رخصت لیا اور جمادی الثانیہ ۱۲۵۴ھ / جولائی ۱۸۳۸ء کو بدخشان روانہ ہوگئے۔

<u>عہدِ میر محمد غزان خان اوّل: (سِنّ حکومت ۱۸۵۷-۱۸۸۶ء)</u>: میر محمد غزان خان اوّل اپنے والدِ گرامی میر شاہ غضنفر خان کی طرح راسخ العقیدت اسماعیلی تھے۔ ان کے مہرِ عدالت پر یہ شعر کندہ تھا:

چُوخسرو سلیم و غضنفر به فَر + غزان خان غلامِ شُبیر و شبر

(غزان خان خسرو کی طرح امن پسند ہے اور شان و شوکت میں غضنفر کی طرح ہے۔ اور وہ امام حسنؑ اور امام حسینؑ کا غلام ہے۔)

میر محمد غزان خان کا اسماعیلی مذہب کی اشاعت میں عظیم کارنامہ یہ ہے کہ آپ کے عہد میں حضرتِ سید شاہ عبد الحمید ورشگوم، مستوچ اور چترال میں سیاسی کشمکش کی وجہ سے ہنزہ تشریف لائے،

جہاں آپ کے جدّ امجد حضرتِ سید یاقوت شاہ کے مرید تھے، تو میر موصوف نے نہایت احترام اور کمالِ عقیدت کے ساتھ آپ کی پذیرائی کی۔ آپ تین سال تک ہنزہ میں مقیم رہے۔ اپنے تین سالہ قیام کے دوران پیر موصوف نے بھی جدِ امجد کی طرح اسماعیلی مذہب کی قابلِ قدر اور تاریخی خدمات انجام دیں۔ گنش اور سُنا کی (ھنی اور مایون) کے اہالیان جو ابھی تک اسماعیلی مذہب سے مشرّف نہیں ہوئے تھے، میر محمد غزان خان کے تعاون سے ان کو بھی اس پاک مذہب کی روشنی پہنچائی۔ گنش اور سُنا کی کے سب اہالیان نے آپ کے دستِ مبارک پر امامِ زمان حضرتِ مولانا سلطان محمد شاہ، علیہ السلام (سنّ امامت ۱۸۸۵-۱۹۵۷ء) کے لئے بیعت دی۔ میر محمد غزان خان کے زمانے میں اہالیانِ ہنزہ کلّی طور پر اسماعیلی مذہب میں داخل ہوگئے تھے۔ حضرتِ سید شاہ عبد الحمید اپنے دَور کے بہت بڑے عالمِ دین تھے اور ایک شیوا زبان اور قادر الکلام شاعر بھی۔ آپ کا ایک مخمّس اور ایک دیدارنامہ ملا ہے جن سے چند اقتباسات تبرکاً یہاں درج کئے جاتے ہیں، تاکہ یادگار رہیں:

مُخمّس در مدح و توصیف وخیر مقدمِ امامِ زمان
حضرتِ مولانا سُلطان محمد شاہ، علیه افضل التحیة والسّلام

اے آنکه گفته احمدِ مُرسَل تُرا ثنا　　ناموسِ اکبر از پی شاگردیت بپا
ارواحِ جنّ وانس بگِردِ سرت فدا　　قسّامِ نار و جنّت و سردارِ اولیا
اے نور هر دو دیدهٔ زهرا خوش آمدی
فرزندِ ارجمندِ رسولِ خدا تُوئی　　گلدسته ای ز گلشنِ آلِ عبا تُوئی
دارندهٔ زمین و زمان در هوا تُوئی　　محرابِ جمله حاجت وهرمدعا تُوئی
زینت فزای عرشِ مُعلّا خوش آمدی
اے لنگر زمین و ستونِ نُه آسمان　　مرآتِ حُسنِ یوسف و جمع پیمبران
نور و ضیاءِ مهرومه و جمله اختران　　بخشندهٔ کلاه و کمر بهر خسروان
روحِ روانِ آدم و حوّا خوش آمدی

نامت محمّد است و علی اسمِ بابِ پاك — مامِ تو شهریارِ عجم رُوحُنا فَدَاك
جدّت حسن ز نسلِ خلیل از عدو چه باك — اے سرورِ بهشتِ سمٰوات و بسطِ خاك
[اے تاجدارِ دنیا و عُقبا] خوش آمدی

[دیدار نامه]

گوش کن اے موالیٔ دیندار — حرف این خسته و ضعیف و نِزار
روزی از روزهای سعدونکو — رفت این بنده از پیٔ دیدار
موکیان و جماعه گی یکسر — صف کشیده ز مردم بسیار
شاهِ هر دو جهان امامِ زمن — شافعِ عاصیان به روز شمار
از سر مرحمت باین بنده — شد عنایت که هان! قدم بردار!
از کتابهای ناصر خسرو — زود بفرست نثر تا اشعار
تا بسازند چاپ هر جانب — برسانتد در یمین و یسار
که خدا دانی و حدودِ دین — خوش بیان کرده آن نکو کردار
صدر دین پیر هند را تصنیف — هست چندین کتابِ معنیٰ وار
سیّدا گفتگو مکرّر شُد
کن به بیدانشیٔ خود اقرار

جب ہنزہ میں اسماعیلی مذہب پھیلنے کا آوازہ بلند ہوا اور بدخشان کے دوسرے معلموں کو اس کا علم ہوا تو وہ حضرات بھی ہنزہ آنے لگے۔ چنانچہ ان میں سے ایک بزرگ حضرتِ سید غلام علی شاہ ابن سید شاہ حسین تھے۔ آپ کے ہنزہ میں پہلے سے مریدوں کا ایک حلقہ تھا۔ جب آپ کے والدِ ماجد حضرتِ سید شاہ حسین میر شاہ غضنفر خان کی دعوت پر ہونزہ آئے تھے اور وزیر زادہ زینت شاہ نے آپ

کے ہاتھ پر بیعت دے کر مرید بنا تھا تو اس وقت کچھ دوسرے اہالیانِ ہنزہ نے بھی بیعت دی تھی اور یہ حلقہ مریدانِ سید شاہ حسین کے نام سے مشہور ہؤا۔

اسی طرح سریقول سے حضرتِ خواجہ شاہ طالب، حضرتِ خواجہ شاہداد اور حضرتِ میرزا اسماعیل ہنزہ آکر اہالیانِ گوجال کو اپنی مریدی میں لایا۔ الغرض اہالیانِ ہنزہ میں سے بیشتر کو حضرتِ سید یاقوت شاہ اور آپ کے پوتے حضرت سید شاہ عبدالحمید نے اسماعیلی مذہب میں لایا۔ لیکن اس عظیم کام میں کچھ حصہ دوسرے بزرگوں کا بھی رہا ہے۔

فقیر ہونزائی

مرکزِ علم و حکمت، لندن

بَلُعَم بن باعور / بِلُعَمُ بن بیعور

بلعم بن باعور (**یا باعوراء**) کی زندگی اہلِ ایمان، خصوصاً اہلِ علم کے لئے نہایت عبرت ناک اور سبق آموز ہے کہ ایک شخص ایمان و علم کے مراتبِ عالیہ تک پہنچنے کے باوجود اگر شیطان کے مکر و فریب سے غافل رہے تو کس طرح علم و معرفت کی بلندی سے جہالت و ضلالت کی پستی میں گر جاتا ہے۔

کہتے ہیں کہ **بلعم** اپنے زمانے میں ایک بہت بڑے عالم اور **مستجاب الدعوات** کاہن تھا۔ اس کے نسب اور جائے سکونت دونوں کے بارے میں مختلف روایات ہیں جو زیادہ تحقیق کی متقاضی ہیں۔ سرِ دست ناسخ التواریخ سے یہاں پر ان کا ذکر کیا جاتا ہے۔ چنانچہ اس کا نسب یوں بتایا گیا ہے: **بلعم بن باعور بن سموم بن قرسم بن هاب بن لوط بن هاران** جو حضرتِ ابراہیم علیہ السلام کے بھائی تھے۔[1] وہ کنعان کا باشندہ تھا جو شام کے شہروں میں سے ایک شہر ہے۔[2]

بلعم علم و معرفت کی روشنی پانے کے بعد گمراہی کی تاریکی میں کس طرح گر گیا اس کے بارے میں بھی مختلف روایات ہیں لیکن ان سب کا مجموعی نتیجہ ایک ہی ہے۔ ایک روایت کے مطابق **بلعم بن باعور** کو اسمِ اعظم حاصل تھا وہ اس کے ذریعے جو بھی دعا کرتا تھا، مستجاب ہوتی تھی۔ اس دوران حضرتِ موسیٰؑ اور فرعون کی جنگ جاری تھی۔ فرعون دنیوی مال و متاع کے ذریعے اس کو خریدنا چاہتا تھا اور **بلعم** مالِ دنیا کی خاطر فرعون کے ہاتھ بک گیا اور حضرت موسیٰؑ اور آپؑ کی قوم کے لئے بددعا کرنے کے لئے تیار ہوا۔ فرعون نے **بلعم** سے استدعا کی کہ جب وہ موسیٰؑ اور آپؑ کی قوم کا تعاقب کرے تو وہ دعا کرے گا کہ خدا موسیٰؑ اور آپؑ کی قوم کو روک دے اور فرعون ان تک پہنچ جائے۔ چنانچہ **بلعم** اپنے گدھے پر سوار ہوا تاکہ موسیٰؑ کی قوم کے تعاقب میں فرعون کو لے جائے۔ لیکن ربّ العزّت کا کرنا یوں ہوا کہ اس کا گدھا چلنے سے رُک گیا۔ ہر چند اس نے اس کو مارا لیکن وہ آگے نہیں بڑھا۔ بالآخر خدائے تعالیٰ نے اس کو گویائی بخشی۔ گدھے نے **بلعم** سے کہا: وائے ہو

تجھ پر! تو مجھے کیوں مارتا ہے؟ کیا تو چاہتا ہے کہ میں تیرے ساتھ چلوں تا کہ تو پیغمبرِ خدا اور گروہِ مؤمنین پر نفرین کرے۔ **بلعم** نے اس سے کوئی سبق نہیں سیکھا بلکہ اور زیادہ مارا یہاں تک کہ وہ مر گیا۔ اور اس نے حضرتِ موسیٰ ؑ اور آپؑ کی قوم کے حق میں بدعا کی۔ اس کے نتیجے میں اسمِ اعظم اس سے جاتا رہا اور اس کے دل سے محو ہوگیا، جیسا کہ قرآنِ کریم (۷:۱۷۵-۱۷۶) میں اس واقعہ کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے۔[۳]

ایک اور روایت کے مطابق حضرت موسیٰؑ نے **بلعم ابنِ باعور** کے شہر، جس کے باشندے کافر تھے، پر حملہ کرنے کا ارادہ کیا تو شہر کے لوگوں نے اس سے درخواست کی کہ وہ حضرتِ موسیٰؑ اور اس کی قوم کو بددعا کرے۔ اس پر اس نے بددعا کرنے سے انکار کیا۔ لیکن انہوں نے اِصرار کیا اور بالآخر اس نے بددعا کی اور اس کی وجہ سے حضرتِ موسیٰ اور اس کی قوم تیہ (بیابان) میں سرگردان ہوگئے۔ حضرتِ موسیٰؑ نے بارگاہِ الٰہی میں عرض کی کہ بارِ خدایا! ہم کس گناہ کی وجہ سے تیہ میں پڑ گئے۔ ربُّ العزت نے فرمایا! **بلعم** کی بددعا کی وجہ سے۔ حضرتِ موسیٰ نے عرض کی کہ بارِ خدایا! جس طرح تو نے اس کی دعا میرے خلاف قبول فرمائی اسی طرح میری دعا بھی اس کے خلاف قبول فرما! حضرت موسیٰ نے اس کے خلاف دعا کی کہ اسمِ اعظم اور ایمان اس سے چھین لئے جائیں۔ خدائے بزرگ و برتر نے **بلعم** کو اسمِ اعظم اور ایمان کی فضیلت سے خالی کر دیا اور اس سے معرفت چھین لی۔[۴]

تفسیر مجمع البیان میں حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے منقول ہے کہ قرآنِ کریم کی مندرجہ ذیل آیات (۷:۱۷۵-۱۷۶) اصل میں **بلعم بن باعور** کے بارے میں ہیں۔ پھر مثال کے طور پر اہلِ قبلہ میں سے ہر اس شخص کے بارے میں بھی، جو خدا کی ہدایت کی جگہ اپنی خواہشِ نفسانی کی پیروی کرے۔[۵]

قولہ تعالیٰ: ''وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ الَّذِيْٓ اٰتَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا فَانْسَلَخَ مِنْهَا فَاَتْبَعَهُ الشَّيْطٰنُ فَكَانَ مِنَ الْغٰوِيْنَ – وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا وَلٰكِنَّهٗٓ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوٰهُ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ الْكَلْبِ اِنْ تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ اَوْ تَتْرُكْهُ يَلْهَثْ ط ذٰلِكَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ۔'' (۷:۱۷۵-۱۷۶)۔

ترجمہ: ''اور (اے رسول) انہیں اس کا احوال پڑھ کر سناؤ جسے ہم نے آیتیں دیں تو وہ ان سے

صاف نکل گیا تو شیطان اس کے پیچھے لگا اور گمراہوں میں ہوگیا۔ اور ہم چاہتے تو آیتوں کی بدولت بلند مرتبہ کردیتے مگر وہ تو زمین پکڑ گیا اور اپنی خواہش کا تابع ہوا تو اُس کی مثل اُس کُتے کی طرح ہے کہ اگر تُو اس پر حملہ کرے تو زبان نکالے رہے اور چھوڑ دے تو بھی زبان نکالے رہے، یہ حال ہے ان کا جنھوں نے ہماری آیتیں جھٹلائیں، تو (اے رسول) یہ قصّے ان لوگوں سے بیان کرو تاکہ یہ لوگ غور کریں۔''

کہتے ہیں کہ حضرت موسیٰ اور آپؑ کی قوم کو بددعا کرنے کے بعد بلعم کی زبان مثل کتّے کی زبان کے اس کے دہن سے لٹکتی تھی اور اس کے سینہ پر پہنچ جاتی تھی۔ اور وہ کہا کرتا تھا اب میری دنیا اور آخرت دونوں برباد ہوگئے ہیں اور مجھ میں سوائے مکر و حیلہ کے اور کچھ نہیں پایا جاتا ہے۔[6]

حضرت موسیٰؑ کی مخالفت کے بعد **بلعم ابن باعور** علم و معرفت کی بلندی پر پہنچنے کے بعد گمراہی کی پستی میں گرنے والوں میں ضرب المثل بن گئے۔ چنانچہ سیدنا پیر ناصر خسرو قُدِّسَ سِرُّہ اپنے دیوان میں فرماتے ہیں:

؎ پَیرَہنِ عصیان بِنداز اگر آیدت از بلعم باعور عار[7]

اگر آپ کو **بلعم باعور** (کا نام لینے) سے شرم آتی ہے تو آپ نافرمانی کے پیرہن کو پھینک دیجئے۔

حضرتِ ربُّ العزت اپنی بے پایان رحمت سے ہمیں معصیت و جہالت کی آتشِ جہنم سے بچائے اور اپنی اطاعت و علم کی دائمی بہشت میں شاد و آباد رکھے اور کبھی اس سے نہ نکالے۔ آمین! یاربّ العالمین!!

یادداشتہا:

۱۔ میرزا محمد تقی سپہر، ناسخ التواریخ، ھبوط (تہرانِ تاریخ ندارد)، II، ص ۸

۲۔ ایضاً

۳۔ محمد باقر مجلسی، حیات القلوب، ترجمہ از فارسی باردو بنام ''قصص الانبیاء'' از سید بشارت

حسین کامل مرزا پوری (مجلس علمی اسلامی، پاکستان، ۱۹۶۳)، صص ۵۴۷-۵۴۸۔

۴۔ فخر رازی، التفسیر الکبیر (تہران، تاریخ ندارد) XV، صص ۵۳-۵۴۔

۵۔ الشیخ الطبرسی، مجمع البیان (قم، ۱۴۰۳ ھجری قمری)، III، ص ۵۰۰

۶۔ ناسخ التواریخ، ھبوط، II، ص ۱۱؛ قصص الانبیاء، ص ۵۴۸

۷۔ سیدنا ناصر خسرو، دیوانِ اشعار، تصحیح نصراللہ تقوی (تہران، ۱۳۶۷ ہجری شمسی)، ص ۵۰۴

مرکزِ علم و حکمت، لندن

فقیر حقیر

۶، اپریل ۲۰۱۱ء

اَلۡاَسۡمَآءُ الۡحُسۡنیٰ

حق سبحانہ و تعالیٰ فرماتا ہے: ''وَلِلّٰہِ الۡاَسۡمَآءُ الۡحُسۡنٰی فَادۡعُوۡہُ بِھَا'' (۷:۱۸۰)۔ ترجمہ: اور اچھے نام خدا کے ہیں تو اسے انہیں ناموں سے پکارو۔ آنحضرتؐ نے فرمایا ہے: ''اِنَّ لِلّٰہِ تِسۡعَةً وَتِسۡعِیۡنَ اِسۡمًا، مِائَةً اِلَّا وَاحِدًا، مَنۡ اَحۡصَاھَا دَخَلَ الۡجَنَّةَ۔'' (بخاری، حدیث: ۲۷۳۶ ، ۷۳۹۲)۔ ترجمہ: یقیناً خدا کے ننانوے یعنی ایک کم سو نام ہیں جو ان کو گنے گا وہ جنّت میں داخل ہوگا۔ سیدنا جعفر بن منصور الیمن اپنی کتاب سرائر میں فرماتے ہیں کہ اگر اس حدیث کی کوئی تأویل نہ ہو اور صرف لغوی معنوں کو لیا جائے تو محال ہے کہ لوگ صرف اسماء (ناموں) کو گن کر جنّت میں داخل ہو جائیں۔ کیونکہ دنیا کے لوگوں میں مشرکین بھی شامل ہیں اور مشرکین کے لئے خدا نے جنّت حرام کر دی ہے۔ اَلۡحَمۡدُللّٰہ دینِ حق میں تأویل کا دروازہ ہمیشہ کے لئے کشادہ ہے اور خانۂ حکمت پر استادِ بزرگوار کے عظیم احسانات نورانی یا کشفی تاویلات کی صورت میں جاری و ساری ہیں۔ چونکہ تأویلات کا تعلق لغوی یا بنیادی معنوں سے ہوتا ہے اس لئے یہاں پر استادِ بزرگوار کی ہدایت کے مطابق اَسۡمَآءُ الحُسنیٰ کے لغوی معنی اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں دینے کی کوشش کی جاتی ہے تاکہ تأویلات کے سمجھنے میں آسانی ہو۔

عَلِیّ اللہ جَلَّ جَلَالُہٗ وَعَمَّ نَوالُہ

(۱) اَلرَّحۡمٰنُ = بخشندہ، بخشنے والا

(۲) اَلرَّحِیۡمُ = مہربان، رحم کرنے والا

(۳) اَلۡمَلِیۡکُ = شہنشاہ، بادشاہ بنانے والا

(۴) اَلۡقُدُّوۡسُ = پاک

(۵) اَلسَّلَامُ = سلامت

(۶) اَلْمُؤْمِنُ = امن دینے والا

(۷) اَلْمُهَيْمِنُ = محافظ، نگاہبان

(۸) اَلْعَزِيْزُ = زبردست

(۹) اَلْجَبَّارُ = شکستگی کو جوڑنے والا، جبر کرنے والا

(۱۰) اَلْمُتَكَبِّرُ = بزرگوار، بزرگی والا

(۱۱) اَلْخَالِقُ = آفریدگار، پیدا کرنے والا

(۱۲) اَلْبَارِئُ = ایجاد کرنے والا، نَوساز

(۱۳) اَلْمُصَوِّرُ = نگارندہ، صورتوں کا بنانے والا

(۱۴) اَلْغَفَّارُ = بہت معاف کرنے والا، آمرزندہ و پوشندہ

(۱۵) اَلْقَهَّارُ = سب پر غلبہ پانے والا

(۱۶) اَلْوَهَّابُ = بہت دینے والا

(۱۷) اَلرَّزَّاقُ = بہت رزق دینے والا، روزی دہ و روزی رسان

(۱۸) اَلْفَتَّاحُ = کشایندہ، کھولنے والا

(۱۹) اَلْعَلِيْمُ = جاننے والا، دانا

(۲۰) اَلْقَابِضُ = سمیٹنے والا، روکنے والا

(۲۱) اَلْبَاسِطُ = پھیلانے والا، دینے والا

(۲۲) اَلْخَافِضُ = پست کرنے والا

(۲۳) اَلرَّافِعُ = بلند کرنے والا

(۲۴) اَلْمُعِزُّ = عزّت دینے والا

(۲۵) اَلْمُذِلُّ = ذِلّت دینے والا

(۲۶) اَلسَّمِيْعُ = سننے والا، شِنَوا

(۲۷) اَلْبَصِيْرُ = دیکھنے والا، بینا

(۲۸) اَلْحَكَمُ	=	منصف، فیصلہ کرنے والا
(۲۹) اَلْعَدْلُ	=	انصاف کرنے والا
(۳۰) اَللَّطِيْفُ	=	مہربان، بارک بین
(۳۱) اَلْخَبِيْرُ	=	خبردار، آگاہ
(۳۲) اَلْحَلِيْمُ	=	بردبار
(۳۳) اَلْعَظِيْمُ	=	باعظمت، بزرگ
(۳۴) اَلْغَفُوْرُ	=	آمرزگار، عیب پوش
(۳۵) اَلشَّكُوْرُ	=	بڑا قدر شناس
(۳۶) اَلْعَلِیُّ	=	بلند و برتر
(۳۷) اَلْكَبِيْرُ	=	بزرگ، بڑا
(۳۸) اَلْحَفِيْظُ	=	نگہبان
(۳۹) اَلْمُقِيْتُ	=	روزی دینے والا، نگران
(۴۰) اَلْحَسِيْبُ	=	حساب لینے والا
(۴۱) اَلْجَلِيْلُ	=	صاحبِ جلالت، بزرگی والا
(۴۲) اَلْكَرِيْمُ	=	کرم کرنے والا، عزّت والا
(۴۳) اَلرَّقِيْبُ	=	نگران
(۴۴) اَلْمُجِيْبُ	=	قبول کرنے والا
(۴۵) اَلْوَاسِعُ	=	وسعت والا، فراخ
(۴۶) اَلْحَكِيْمُ	=	حکمت والا
(۴۷) اَلْوَدُوْدُ	=	محبِّ اعظم و محبوبِ اعظم
(۴۸) اَلْمَجِيْدُ	=	بزرگ، مجد والا
(۴۹) اَلْبَاعِثُ	=	بھیجنے والا، فرستندہ

(۵۰) اَلشَّھِیۡدُ	=	گواہ، حاضر
(۵۱) اَلۡحَقُّ	=	ثابت، قائم، اٹل
(۵۲) اَلۡوَکِیۡلُ	=	کارساز
(۵۳) اَلۡقَوِیُّ	=	توانا، قوّت والا
(۵۴) اَلۡمَتِیۡنُ	=	مضبوط، مستحکم
(۵۵) اَلۡوَلِیُّ	=	مالک، سرپرست
(۵۶) اَلۡحَمِیۡدُ	=	سراہا ہوُا
(۵۷) اَلۡمُحۡصِیُ	=	گننے والا، شمار کنندہ
(۵۸) اَلۡمُبۡدِئُ	=	شروع کرنے والا
(۵۹) اَلۡمُعِیۡدُ	=	دوبارہ کرنے والا
(۶۰) اَلۡمُحۡیِ	=	زندہ کرنے والا، حیات دینے والا
(۶۱) اَلۡمُمِیۡتُ	=	موت دینے والا
(۶۲) اَلۡحَیُّ	=	زندہ
(۶۳) اَلۡقَیُّوۡمُ	=	پایندہ، ہمیشہ رہنے والا
(۶۴) اَلۡوَاجِدُ	=	پانے والا
(۶۵) اَلمَاجِدُ	=	بزرگوار
(۶۶) اَلۡوَاحِدُ	=	ایک، یکتا و یگانہ
(۶۷) اَلۡاَحَدُ	=	کوئی، یگانہ
(۶۸) اَلصَّمَدُ	=	بے نیاز، سیّد
(۶۹) اَلۡقَادِرُ	=	توانا، قدرت رکھنے والا
(۷۰) اَلۡمُقۡتَدِرُ	=	بڑا صاحبِ قدرت
(۷۱) اَلۡمُقَدِّمُ	=	آگے کرنے والا

(۷۲) اَلْمُؤَخِّرُ = پیچھے کرنے والا

(۷۳) اَلْاَوَّلُ = اوّل، پہلا

(۷۴) اَلْاٰخِرُ = آخر، پچھلا

(۷۵) اَلظَّاهِرُ = آشکارا

(۷۶) اَلْبَاطِنُ = پوشیدہ، نہاں

(۷۷) اَلْوَالِیُ = مددگار، کارساز

(۷۸) اَلْمُتَعَالِ = بلند و برتر

(۷۹) اَلْبَرُّ = احسان کرنے والا، نوازندہ

(۸۰) اَلتَّوَّابِ = لوٹنے والا، توبہ قبول کرنے والا

(۸۱) اَلْمُنْتَقِمُ = بدلہ لینے والا، انتقام کش

(۸۲) اَلْعَفُوُّ = بہت معاف کرنے والا، آمرزندہ

(۸۳) اَلرَّءُوْفُ = بڑا مہربان

(۸۴) مَالِکُ الْمُلْکِ = ملک کا بادشاہ

(۸۵) ذُوالْجَلَالِ وَالْاِکْرَامِ = جلالت و کرامت والا

(۸۶) اَلْمُقْسِطُ = عدل و انصاف کرنے والا

(۸۷) اَلْجَامِعُ = اکٹھا کرنے والا، جمع کرنے والا

(۸۸) اَلْغَنِیُّ = بے نیاز

(۸۹) اَلْمُغْنِیُّ = بے نیاز کرنے والا

(۹۰) اَلْمَانِعُ = بچانے والا، روکنے والا

(۹۱) اَلضَّارُّ = ضرّر پہنچانے والا، زیان کنندہ

(۹۲) اَلنَّافِعُ = نفع پہنچانے والا

(۹۳) اَلنُّوْرُ = نور، روشنی

(۹۴) **اَلْھَادِیُ**	=	ہدایت کرنے والا
(۹۵) **اَلْبَدِیْعُ**	=	اِبداع کرنے والا، نَوساز، نَوآورندہ
(۹۶) **اَلْبَاقِیُ**	=	ہمیشہ رہنے والا، جاوید
(۹۷) **اَلْوَارِثُ**	=	وارث، میراث لینے والا
(۹۸) **اَلرَّشِیْدُ**	=	ہدایت کرنے والا
(۹۹) **اَلصَّبُوْرُ**	=	صبر کرنے والا

مرکزِ علم و حکمت، لندن

۶، جون ۲۰۱۱ء

چند بُزرگانِ دِین کی مشهور کتابیں

١ ۔	سَیِّدُنا اَبوحَاتم رَازی	–	اَعْلَامُ النُّبُوَّة
			کِتَابُ الزِّیْنَة
			کِتَابُ الاِصْلَاح
٢ ۔	سَیِّدُنَا اَبُویَعْقُوب سِجِسْتَانِی	–	کِتَابُ الافْتِخَار
			اِثْبَاتُ النُّبُوَّات
			اَلْمَقالِیْد
٣ ۔	سَیِّدُنَا جَعْفَرُ بِن مَنْصُوْرُالْیَمَن	–	اَسْرَارَ وَالسَّرَائِرُالنُّطَقَاء
			اَلْفَتَرَات وَالْقِرَانَات
			اَلشَّوَاهِد وَالْبَیَان
۴ ۔	سَیِّدُنَا قَاضِی نُعْمَان	–	دَعَائِمُ الْاِسْلَام
			تَأوِیْلُ الدَّعَائِم
			اَسَاسُ التَّأوِیْل
			شَرْحُ الْاَخْبَار
			اَلْمَجالِس وَالْمُسَایَرَات
۵ ۔	اِبْنِ هَانِئِ اْلاَنْدَلُسِی	–	دِیوان
٦ ۔	سَیِّدُنَا حَمِیْدُ الدِّین اَحْمَدْ کِرْمَانِی	–	رَاحَةُ الْعَقْل
			اَلرِّیَاض
			مَبَاسِم البِشَارات
			اَلْمَصَابِیْح فی اِثْبَاتِ الاِمَامَة

۷۔ سَیِّدنَا اَلْمُؤَیَّد فِی الدّین هِبَةُ الله شِیرازی	–	اَلْمَجَالِسُ الْمُؤَیَّدِیَّة
		سِیرَةُ الْمُوَیَّد
		دِیوان
۸۔ سَیّدنَا پِیر نَاصِرِ خِسْرَو	–	وَجْهُ الدِّیْن
		زَادُالْمُسَافِرِیْن
		خَوانُ الاِخْوَان
		گشَایِش وَرَهَایِش
		دِیوان
۹۔ پِیر شِهَابُ الدِّین شَاه اَلحُسَیْنِی	–	رِسَاله دَرحَقیقتِ دِین
		خِطَابَاتِ عَالِیَه

سُورَۃ الکَوثَر (۱۰۸)

بِسمِ اللّٰہِ الرَّحمٰنِ الرَّحیم

اِنَّآ اَعۡطَیۡنٰکَ الۡکَوۡ ثَرَ. فَصَلِّ لِرَبِّکَ وَ انۡحَرۡ. اِنَّ شَانِئَکَ ھُوَ الۡاَ بۡتَرُ.

اللہ کے نام سے (شروع کرتا ہوں) جونہایت مہربان اوررحم والا ہے

یقیناً ہم نے تجھے کوثر عطا کیا۔ پس تو اپنے پروردگار کے لئے نماز پڑھ اور (اونٹ کی) قربانی کر۔ یقیناً تیرا دشمن ہی دم کٹا (یعنی بے اولاد) ہے۔

مشکل الفاظ کی وضاحت: ذیل میں مشکل الفاظ کی لغوی معنی اور دورِ ستر کی تأ ویل کی روشنی میں وضاحت کی کوشش کی جاتی ہے۔

۱۔ **کَوثَر**: لفظِ **کَوثَر کَثُرَ یَکۡثُرُ** سے **فَوۡعَل** کے وزن پر آیا ہے جو بہت زیادہ کے معنی دیتا ہے۔ لغت میں کوثر کے کئی ایک معنی ہیں۔ (۱) بڑی تعداد (۲) بڑی بھلائی (۳) سخی وفیاض آدمی (۴) خیرِ کثیر یعنی وہ تمام نعمتیں جو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولؐ کو دنیا میں عطا فرمائیں اور جو آخرت میں عطا کی جائیں گی (۵) جنت کے ایک دریا کا نام جس کی خاک خالص مشک اور جس کا پانی دودھ سے زیادہ سفید اور شہد سے زیادہ میٹھا ہوتا ہے۔ (**القاموس الوحید**، ص ۱۳۸۹)۔ نیز بعض مآخذ میں اس سے مراد علم وعمل، نُبوّت، کتاب، شرفِ دارین، شفاعت، حوضِ کوثر، حضرت فاطمہؑ اور ذریتِ طیّبہ کو لیا گیا ہے (**دیکھئے حاشیۂ تفسیر المتقین**، ص ۷۹۶، حاشیۂ انوارالقرآن، ص ۱۲۳۶)۔

سیّدنا پیر ناصرِ خسرو نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب وجہ دین میں کوثر کے معنی **مردِ کثیر الذّریۃ** کے دئے ہیں جو سیاقِ عبارت کے لحاظ سے سب سے زیادہ قابلِ فہم معنی ہیں جو **اَبتَــــر** کے متضاد کے طور پر استعمال ہوا ہے جس کے معنی بے اولاد یا مقطوع النسل کے ہیں۔ لہٰذا اس سورے میں کوثر سے مراد ایک ایسا شخص ہے جس کی بہت زیادہ اولاد ہے۔ اور اس

سے مراد مولا نا علی علیہ السّلام ہے چنانچہ پیغمبرؑ نے فرمایا ہے: ’’خدا نے ہر نبی کی اولاد اس کی صلب میں قرار دی اور میری اولاد صلبِ علّیؑ میں قرار دی‘‘۔ (نیز دیکھئے ترجمہ و تفسیرِ قرآن، از فرمان علی، ص۷۴۲)

۲۔ صَلِّ: لفظ صَلِّ فعل صَلّٰی یُصَلِّی کا امر ہے جس کے لغوی معنی نماز پڑھنا ہے اور تاویلی معنی دعوتِ حق قائم کرنا ہے۔

۳۔ اِنْحَر: لفظ اِنْحَر فعل نَحَرَ یَنْحَرُ کا امر ہے جس کے معنی ہیں سینے پر چھری چلانا۔ نحر اور ذبح میں یہ فرق ہے کہ نحر میں پہلے سینے کو چیرا جاتا ہے اور پھر گلے کو کاٹا جاتا ہے اور ذبح میں پہلے گلے کو کاٹا جاتا ہے اور پھر سینے پر چھری چلائی جاتی ہے۔ اونٹ کی صورت میں پہلے اس کو نحر اور پھر ذبح کیا جاتا ہے جبکہ بھیڑ، بکری اور گائے بیل کی صورت میں پہلے ذبح اور پھر نحر کیا جاتا ہے۔

۴۔ اَبْتَر: لفظ اَبْتَر فعل بَتِرَ یَبْتَرُ سے اَفْعَل کے وزن پر آیا ہے جس کے لغوی معنی ہیں کٹ جانا، چنانچہ ’’اَبْتَــر‘‘ کے معنی ہیں وہ شخص جو اپنی نسل سے کٹا ہو یعنی دم بریدہ، بے اولاد، مقطوع النسل۔ چنانچہ اس سلسلے میں روایت ہے کہ جب حضرت خدیجۃ الکبریٰ سے آنحضرتؐ کے دو فرزند حضرت قاسم اور حضرت طاہر جن کو عبداللہ بھی کہا جاتا ہے، یکے بعد دیگرے انتقال کر گئے تو قریش میں سے بعض نے آنحضرتؐ کے لئے لفظ اَبْتَـر استعمال کرتے ہوئے اذیّت دینے لگے۔ جن لوگوں نے سب سے پہلے اس لفظ کو استعمال کیا ان کے بارے میں مختلف روایات ہیں۔ بعض کے نزدیک یہ عاص بن وائل تھا، بعض کے نزدیک عقبہ بن معیّط اور بعض کے ہاں کعب بن اشرف (دیکھئے دعا مغزِ عبادت، صص ۷۵۔۷۶) چنانچہ اس سورے میں قریش کی گستاخی کی تردید کی گئی ہے اور پیغمبرؐ کو یقین دلایا گیا ہے کہ آپؐ کو وہ مرد عطا کیا گیا ہے جس کی بے شمار اولاد ہے۔

۵۔ شَانِئَ: لفظ شَانِئَ فعل شَنَأَ یَشْنَأُ کے مادہ سے آیا ہے جس کے معنی ہیں بغض وعداوت رکھنا اور

کینہ ورزی کرنا اور **شانِئ** کے معنی بغض وعداوت رکھنے والا، کینہ ورز (**القاموس الوحید، ص۹۰؛ نیز دیکھئے تفسیرِ نمونہ، جلد۱۵، ص۵۱۵**)۔

چنانچہ پیر ناصرِ خسرو ان معانی کے پیشِ نظر اس سورے کا ترجمہ وتاویل یوں کرتے ہیں:۔

"(اے رسولؐ) ہم نے تجھے بہت سی اولا دوالا مرد عطا کر دیا ہے"۔ جس سے اللہ تعالیٰ کی مراد اساس یعنی مولانا علیؑ ہے۔ "پس اپنے پروردگار کے لئے نماز قائم کر"۔ یعنی دعوتِ حق کو بر پا کر" اور (اونٹ) کو نحر کر"۔ یعنی اساس کا عہد لو۔ "یقیناً تیرا دشمن دم بریدہ ہے"۔ یعنی وہ بےاولاد ہے اسلئے امامت اس میں نہ رہے گی بلکہ وہ آپ ہی کی ذرّیت میں باقی رہے گی۔ (وجه دین، اردو ترجمہ، ص۳۲۔۳۳)۔

فقیرِ حقیر

یومَ الخمیس، ۲۸ جولائی ۲۰۱۱ء

آیاتُ النُّور وَ نَفْسٍ وَاحِدَة

اَلنُّور : ۲۵۷:۲(دو دفعہ) ؛ ۴۶،۴۴،۱۶،۱۵:۵ ؛ ۱:۶ ؛ ۱۵۷:۷ ؛ ۳۲:۹ ؛ ۱۶:۱۳ ؛
۵،۱:۱۴ ؛ ۳۵:۲۴(تین دفعہ)،۴۰ ؛ ۴۳:۳۳ ؛ ۲۰:۳۵ ؛ ۶۹،۲۲:۳۹ ؛ ۹:۵۷؛
۸:۶۱ ؛ ۸:۶۴ ؛ ۱۱:۶۵

نُورًا : ۱۷۴:۴ ؛ ۱۲۲،۹۱:۶ ؛ ۵:۱۰ ؛ ۴۰:۲۴ ؛ ۵۲:۴۲ ؛ ۲۸،۱۳:۵۷ ؛ ۱۶:۷۱

نُورِکُم : ۱۳:۵۷

نُورَنَا : ۸:۶۶

نُورِہٖ : ۳۲:۹ ؛ ۳۵:۲۴ (دو دفعہ) ؛ ۸:۶۱

نُورُھُم : ۱۷:۲ ؛ ۱۹،۱۲:۵۷ ؛ ۸:۶۶

اَلْمُنِیر : ۱۸۴:۳ ؛ ۸:۲۲ ؛ ۲۰:۳۱ ؛ ۲۵:۳۵

مُنِیرا : ۶۱:۲۵ ؛ ۴۶:۳۳

نَفْسٍ وَاحِدَة : ۱:۴ ؛ ۹۸:۶ ؛ ۱۸۹:۷ ؛ ۲۸:۳۱ ؛ ۶:۳۹

سورۂ احقاف (۴۶:۲۹-۳۱) میں

''وَاِذْ صَرَفْنَآ اِلَیْکَ نَفراً مِنَ الْجِنّ'' یا ''جِنّات کے وفد'' کی تفسیر

''نَفراً مِنَ الْجِنّ'' سے جِنّات کا وہ وفد مراد ہے جو قرآنِ کریم سننے کے لئے آنحضرتؐ کے حضور پہنچے تھے اور قرآنِ کریم کو سننے کے بعد اپنی قوم کو ڈرانے کے لئے ان کی طرف لوٹے تھے۔ آج کل نورانی یا کشفی تأویل کی جو بارش ہو رہی ہے اس کی شکرگزاری کے لئے ضروری ہے کہ کتبِ تفسیر اور ان میں جو علمی مشکلات ہیں ان پر بھی ایک نظر ڈالی جائے۔ اس مقصد کے لئے ذیل میں سُنّی اور اثناعشری تفسیرات سے کچھ اقتباسات پیش کرنے کی کوشش کی جاتی ہے:

تفسیر ابنِ جریر طبری جو ''جامع البیان عن تأویل آی القرآن'' کے نام سے مشہور ہے، میں ابنِ عباس سے روایت ہے کہ حضرتِ عیسیٰؑ اور حضرتِ محمدؐ کے درمیانی فَتْـرَتْ کے دوران آسمان محفوظ نہ تھا اور جِنّات باتیں سُننے کے لئے بہت سے مقامات میں بیٹھا کرتے تھے۔ جب ربُّ العزت نے آنحضرتؐ کو مبعوث کیا تو آسمان کو بہت قوی نگہبانوں سے محفوظ کیا گیا اور شیاطین پر شعلے برسائے گئے اور ان کو آسمان پر جانے سے روکا گیا۔ انہوں نے کہا [جیسا کہ ربُّ العزّت ان کی ترجمانی کرتے ہوئے قرآنِ کریم میں فرماتا ہے]: ''لَانَدْرِیْٓ اَشَرٌّ اُرِیْدَ بِمَنْ فِی الْاَرْضِ اَمْ اَرَادَ بِهِمْ رَبُّهُمْ رَشَدًا'' (۷۲:۱۰) یعنی ہم نہیں سمجھتے ہیں کہ اس سے اہلِ زمین کے لئے برائی مقصود ہے یا ان کے پروردگار نے ان کی بھلائی کا ارادہ کیا ہے۔ ابلیس نے کہا کہ زمین میں یقیناً کوئی حادثہ پیش آیا ہے ...... جِنّات سے کہا: زمین میں بکھر جاؤ اور مجھے آگاہ کرو کہ یہ کیا خبر ہے جو آسمان میں واقع ہوئی ہے۔ چنانچہ جِنّات کا اوّلین وفد جو بھیجا گیا وہ نصیبین کے جِنات میں سے تھا جو ان کے اشراف و سادات تھے۔ ابلیس نے ان کو تِہامہ کی طرف بھیج دیا اور وہ وادیٔ نخلہ پہنچ گئے۔ انہوں نے وادیٔ نخلہ میں رسولؐ کو نمازِ بامداد/نمازِ فجر (صلاۃ الغداۃ) کو ادا کرتے ہوئے پایا۔ انہوں نے کان لگا کر سنا، اور رسولؐ کو قرآن کی تلاوت کرتے سنا تو کہا: خاموش ہو جاؤ اور رسولؐ کو معلوم نہیں ہوا کہ وہ آپ کی قرأت کو کان لگا کر

سنتے ہیں۔ ''فَلَمَّا قُضِیَ وَلَّوْا اِلٰی قَوْمِھِمْ مُّنْذِرِیْنَ'' (۲۹:۴۶) پھر جب [قرآن کا پڑھنا] ختم ہوگیا تو وہ اپنی قوم کی طرف لوٹ گئے کہ [ان کو عذاب سے] ڈرائیں۔

طبری کہتا ہے کہ جنّات کے وفد کی تعداد کے بارے میں اختلاف ہے۔ ابنِ عباس اور بعض اور کے ہاں وہ سات تھے، جو نصیبین کے جِنّات میں سے تھے اور رسولؐ نے ان کو اپنی قوم کے لئے ایلچی بناکر بھیجا۔ زِرّ بن حبیش اور بعض اور کے نزدیک وہ نو تھے جن میں سے ایک زَوْبَعَه تھا۔

طبری کے ہاں وہ جِنّات رسولؐ کے پاس کس طرح آئے اس میں بھی اختلاف ہے۔ بعض کے ہاں جب وہ رسولؐ کے پاس آئے تو آسمان میں جو حادثہ پیش آیا تھا اس سے وہ آگاہ تھے لیکن رسولؐ ان کے بارے میں نہیں جانتے تھے۔ حسن [بصری؟] سے روایت ہے کہ رسول اس وقت تک ان کے بارے میں نہیں جانتے تھے جب تک کہ وہ آپ تک نہیں پہنچے اور جب وہ پہنچے تو خدا نے رسولؐ کی طرف وحی بھیجی اور ان کے بارے میں آپؐ کو آگاہ کیا۔ بعض کے نزدیک خدا نے رسولؐ کو حکم دیا تھا کہ ان کے لئے قرآن پڑھیں اور ڈرائیں اور اس کے بعد وہ رسولؐ کے پاس جمع ہوگئے۔

قتادہ کی روایت کے مطابق جب جِنّات کو رسولؐ کی طرف متوجہ کیا گیا تو وہ نِیـنَـوی سے تھے۔ قتادہ نے کہا: رسولؐ نے فرمایا: ''مجھے حکم دیا گیا ہے کہ مَیں جِنّات کے لئے قرآن پڑھوں، تم میں سے کون میرے ساتھ چلے گا؟ اس پر سب نے سر نیچے جُھکایا۔ رسولؐ نے دوسری مرتبہ یہی سوال کیا تو یہی ہوا۔ تیسری مرتبہ یہی سوال کیا تو یہی ہوا۔ ان میں سے ایک آدمی نے کہا: اے خدا کے رسولؐ [ایسا لگتا ہے کہ] اس کام کے کرنے میں آپ جلدی میں ہیں۔ ان میں سے صرف پھر عبداللہ ابنِ مسعود رسولؐ کے ساتھ چلا گیا۔ رسولؐ ایک وادی میں داخل ہوگئے جس کو شِعبُ الحَجُون کہا جاتا ہے۔ اور رسولؐ نے عبداللہ کے گردا گرد ایک خط کھینچا کہ وہ اس میں رہے۔ عبداللہ نے کہا: مَیں گھبرانے لگا...... اور بہت شدید شور کو سنا، یہاں تک کہ مَیں رسولؐ کے بارے میں ڈر گیا۔ پھر آپؐ نے قرآن کی تلاوت شروع کی۔ جب رسولؐ واپس آگئے تو مَیں نے عرض کی: یَانَبِیَّ اللهُ! وہ شور کیا تھا جو مَیں نے سنا؟ آپؐ نے فرمایا: وہ ایک مقتول کے بارے میں، جو ان کے درمیان قتل ہوا تھا، میرے پاس جمع ہوگئے اور ان کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کیا گیا۔

ہمیں بتایا گیا ہے کہ جب ابنِ مسعود کوفہ آئے تو اس نے قومِ زط کے بوڑھوں کو دیکھا جن کے سروں کے بال سیاہ و سفید تھے۔ ان سے وہ متعجب ہوگیا۔ اس نے پوچھا یہ کون ہیں؟ تو جواب دیا گیا کہ یہ عجمیوں کا ایک گروہ ہے۔ اس نے کہا: رسولؐ نے جِنّات میں سے جن کو اسلام کی دعوت دی تھی یہ ان کے مانند ہیں اور ان سے کم مانند مَیں نے کسی کو نہیں دیکھا ہے۔

قتادہ سے روایت ہے کہ جس رات جِنّات کو دعوت دی گئی اس میں رسول کے ساتھ ابنِ مسعود بھی چلا گیا۔ پس رسولؐ نے اس کے گردا گرد ایک لکیر کھینچی اور فرمایا کہ اس سے باہر نہ نکلو۔ پھر رسولؐ جِنّات کی طرف گئے اور ان کے لئے قرآن پڑھا۔ پھر ابنِ مسعود کے پاس لوٹے اور فرمایا: کیا تو نے کوئی چیز دیکھی۔ عرض کیا کہ ایک شدید شور کو سنا۔ فرمایا: جِنّات ایک مقتول کے بارے میں، جو ان کے درمیان قتل ہوُا تھا، بات کو ایکدوسرے پر ڈالتے تھے، ان کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کیا گیا۔ انہوں نے رسولؐ سے زاد طلب کیا۔ آپؐ نے فرمایا: ہر ہڈی تمہارے لئے عرق اور ہر لید سبزی ہے۔ انہوں نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! لوگ (انسان) ان کو ہمارے لئے گندہ کر دیتے ہیں۔ رسولؐ نے لوگوں کو ان سے استنجا کرنے کو منع فرمایا۔ جب ابنِ مسعود کوفہ آیا تو اس نے زط قوم کو دیکھا جو ایک لمبی اور کالی قوم ہے، ان سے ابنِ مسعود خوف زدہ ہوگیا اور کہا کہ بتایئے کہ یہ کون ہیں؟ کہا گیا کہ یہ زط کی ایک قوم ہے۔ اس نے کہا کیا ہی مشابہت ہے ان کی اس جماعت کے ساتھ جن کو رسولؐ کی طرف متوجہ کیا گیا تھا۔

ایسی روایات **عبداللہ بن عمرو بن غَیلان الثقفی** اور **ابو عثمان بن شَبَّۃ الخزاعی** سے بھی ہیں۔ (نیز دیکھئے: فخر رازی، تفسیرِ کبیر، جلد بیست و ہفتم، ۳۰-۳۳)۔

اثناعشری تفاسیر میں سے ابنِ حسن طبرسی کی تفسیر جو ''**مجمع البیان فی تفسیر القران**'' کے نام سے مشہور ہے، میں ابنِ عباس اور سعید بنِ جبیر سے روایت ہے کہ جنّات کو رسولؐ کی طرف متوجہ کرنے سے مراد ان کو از راہ توفیق و الطاف اپنے ملکوں سے رسولؐ کی طرف بھیجنا۔ نیز اس سے مراد چوری چھپے کان لگا کر آسمان سے سننے کی بجائے ان پر شعلے برسا کر رسول کی طرف متوجہ کر دینا، اس لئے کہ حضرتِ عیسیٰؑ کے بعد ایسا کرنے سے نہیں روکا گیا تھا۔ جنّات نے کہا کہ یہ جو کچھ

آسمان میں حادثہ ہؤا یہ اس لئے ہؤا کہ زمین میں کوئی حادثہ ہؤا ہوگا۔ پس انہوں نے زمین میں سفر شروع کیا یہاں تک کہ عُکاظ کی طرف جاتے ہوئے وادیٔ نخلہ میں آپؐ کو پایا جبکہ آپؐ فجر کی نماز ادا کر رہے تھے۔ پس انہوں نے رسولؐ سے قرآن کو سنا اور دیکھا کہ کس طرح نماز پڑھتے ہیں۔

طبرسی، زہری سے روایت کرتا ہے کہ مولانا ابو طالبؑ کے جامہ بدلنے کے بعد قریش کے ظلم و ستم میں اور شدت پیدا ہوئی تو آپ دعوت کی خاطر طائف گئے لیکن وہاں بھی کسی نے دعوت قبول نہیں کی۔ مکہ واپسی پر جب آپ نخلہ کے مقام پر تھے اور نمازِ بامداد پڑھ رہے تھے کہ جِنّات کا ایک گروہ بقولِ بعض نصیبین اور بقول بعض یمن کے جنّات میں سے وہاں سے گزرا اور رسولؐ کو نماز ادا کرتے اور قرآن پڑھتے پایا اور انہوں نے کان لگا کر آپؐ کو سُنا۔ یہ سعید بن جبیر اور ایک جماعت کے قول کے مطابق ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جنّات پر [خدا کی طرف سے] شعلے برسانا ان پر خدا کی مہربانی تھی۔

کچھ اور حضرات کے مطابق خدا نے رسولؐ کو حکم دیا کہ وہ جنّات کو ڈرائے، خدا کی طرف ان کو بلائے اور ان کے لئے قرآن پڑھے۔ پس خدا نے نِیْـنَوی کے جِنّات میں سے ایک گروہ کو ان کی طرف مائل کر دیا۔ رسولؐ نے فرمایا: خدا نے مجھے حکم دیا ہے کہ آج رات مَیں جِنّات کے لئے قرآن پڑھوں تو تم سے کون میرے ساتھ چلے گا۔ پس عبداللہ بنِ مسعود رسولؐ کے ساتھ گیا۔ عبداللہ بنِ مسعود نے کہا کہ میرے سوا رسولؐ کے ساتھ کوئی اور نہیں چلا۔ ہم روانہ ہوگئے اور بالائے مکہ پہنچے اور **شعب الحجون** میں داخل ہوگئے۔ وہاں پر رسولؐ نے ایک لکیر کھینچی اور مجھے حکم دیا کہ مَیں اس کے اندر رہوں اور فرمایا کہ جب تک مَیں واپس نہ لوٹوں اس سے باہر نہیں نکلنا۔ رسولؐ وہاں سے روانہ ہو کر ایک جگہ رُک گئے اور قرآن پڑھنا شروع کیا اور بہت سی تاریکیوں نے آپؐ کو ڈھانپ دیا یہاں تک کہ وہ میرے اور رسولؐ کے درمیان حائل ہوئیں اور مَیں پیغمبرؐ کی آواز کو نہ سن سکا۔ پھر وہ بادلوں کے ٹکڑوں کی طرح ٹکڑے ٹکڑے ہوکر غائب ہونے لگے یہاں تک کہ ایک گروہ رہ گیا۔ رسولؐ نمازِ بامداد سے فارغ ہوکر واپس آئے اور پوچھا کہ کیا تو نے کوئی چیز دیکھی؟ مَیں نے عرض کی: ہاں مَیں نے بال دار کالے مردوں کو دیکھا جن کے کپڑے سفید تھے۔ رسولؐ نے فرمایا: وہ نصیبین کے

جنّات تھے۔

جابر بنِ عبداللہ سے روایت ہے کہ رسولؐ نے جب سورۂ رحمان لوگوں کے لئے پڑھا تو وہ خاموش رہے اور کچھ نہ بولا۔ تب رسولؐ نے فرمایا کہ ''اَلْجِنُّ کَانُوا اَحْسَنُ جواباً مِنکُمْ لَمَّا قَرأْتُ عَلَیْھِمْ فَبِاَیِّ آلَاءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبَان، قَالوا لَا وَلَا بشیءٍ مِنْ آلَائِکَ رَبُّنَا نُکَذِّب''، یعنی تم سے جنّات کا جواب بہت اچھا تھا۔ جب ان کے لئے ''فَبِاَیِّ آلَاءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبَان'' (۱۳:۵۵) پڑھا تو انہوں نے کہا: نہیں، ہرگز نہیں، اے ہمارے ربّ! تیری نعمتوں میں کسی چیز کو ہم نہیں جھٹلاتے۔

طبرسی، علی بنِ ابراہیم کے حوالے سے لکھتا ہے کہ جنّات رسول کے پاس آئے، ایمان لائے اور آپؐ نے ان کو شرائعِ اسلام کی تعلیم دی اور سورۂ جنّ (۷۲) کا نزول ہوا۔ اور وہ ہر وقت رسولؐ کی طرف آیا کرتے تھے۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ رسولؐ جنّ کی طرف بھی مبعوث ہوئے تھے جس طرح انس کی طرف۔ اور آپؐ سے پہلے کوئی نبی جنّ اور انس دونوں کی طرف مبعوث نہیں ہوا۔ (نیز دیکھئے علامہ طباطبائی، المیزان فی تفسیر القرآن، جلد ہژدھم، ۲۱۵–۲۲۰، فیض کاشانی، کتاب الصّافی فی تفسیرُالقرآن، الجزء الاوّل مِن المجلد الثانی، ۵۵۹-۵۶۰)۔

مذکورہ بالا تفاسیر میں حقیقت تک رسائی کے راستے میں جو علمی مشکلات ہیں ان کے پڑھنے کے بعد ذیل میں استادِ بزرگوار کی حکمتوں سے مملو کتاب ''لعل و گوہر'' میں عقل افروز اور روح پرور نورانی یا کشفی تأویل کو پڑھئے:

<u>حضورِ اکرم کے جنّی نمائندے:</u> مومن جنّ کے قرآنی تذکروں میں روحانیت اور معرفت کے بڑے بڑے اَسرار پوشیدہ ہیں، اس لئے آپ تمام متعلقہ آیاتِ کریمہ کو غور سے پڑھ لیں، اور اس عنوان کی مناسبت سے خصوصاً سورۂ احقاف (۴۶:۲۹-۳۲) اور سورۂ جنّ (۷۲:۱-۱۵) میں بھرپور توجہ سے دیکھ لیں، نیز میری ایک تصنیف ''قرۃ العین'' کا ضمیمہ بھی پیشِ نظر ہو تاکہ آپ یقین کر سکیں کہ جنّ ایسا ہرگز نہیں، جیسا کہ عوام النّاس سمجھ رہے ہیں، بلکہ وہ انسان کی بدنی اور روحانی عروج و ارتقاء کا نتیجہ اور نمونہ ہے، جبکہ وہ مومن اور صالح جنّ ہو، وہ مخلوقِ لطیف ہونے کی وجہ سے روحانی علم کا خزانہ ہو سکتا ہے، دراصل یہی فرشتہ ہے۔

جیسا کہ ارشاد ہے: وَاِذْ صَرَفْنَآ اِلَيْکَ نَفَرًا مِّنَ الْجِنِّ يَسْتَمِعُوْنَ الْقُرْاٰنَ فَلَمَّا حَضَرُوْهُ قَالُوْٓا اَنْصِتُوْا فَلَمَّا قُضِيَ وَلَّوْا اِلٰى قَوْمِهِمْ مُّنْذِرِيْنَ (۲۹:۴۶) اور (وہ واقعہ بھی قابلِ ذکر ہے) جب ہم نے جنّوں کے ایک گروہ کو تمہاری طرف متوجہ کیا، وہ کان لگاکر قرآن کو سننے لگے، پھر جب وہ اس کے پاس (یعنی قرآن کی روحانیت میں) حاضر ہوئے تو کہنے لگے خاموش بیٹھے سنتے رہو، پھر جب (روحانی تلاوت اور مشاہدہ) تمام ہوا تو اپنی قوم کی طرف واپس گئے کہ (ان کو عذاب سے) ڈرائیں (۲۹:۴۶)۔

تاویلی حکمت: ظاہر ہے کہ یہ جنّات کسی وجہ سے بھی ازخود آنخضرتؐ کے پاس نہیں آئے تھے بلکہ پروردگارِ عالم کی ہدایت کے مطابق یہاں آگئے، اور خدا کی جانب سے آفتابِ ہدایت حدودِ دین سے طلوع ہوتا رہتا ہے، اس کے یہ معنی ہوئے کہ یہ حضرات حدود ہی کی سیڑھی پر درجہ بدرجہ بلند کئے گئے تھے، تاآنکہ وہ رسول اللہؐ سے روحانی تلاوت سننے اور قرآن کے باطنی معجزات دیکھنے کے قابل ہوگئے، اور ایک عرصہ تک ان علمی و عرفانی مشاہدات و تعلیمات سے بہرہ ور ہو جانے کے بعد ہی یہ جنّات اپنی قوم کی طرف واپس گئے تاکہ ان میں پیغمبرِ اکرمؐ کے لیٔے (باطنی) حجتوں کا فریضہ انجام دیں، اس حقیقت کا ایک روشن ثبوت ان کا قرآن کی روح و روحانیت میں حاضر ہو جانا ہے (حضروہ) جس میں قرآنِ کریم کے روحانی اور عقلی معجزات کے تجدّدِ امثال کا تفصیلی مشاہدہ ہوتا ہے۔(ص ۱۱۵-۱۱۶، پُرانا ایڈیشن، ص ۸۸-۹۰، نیا ایڈیشن)۔

فقیر حقیر

مرکزِ علم و حکمت، لندن

۱۷، اکتوبر ۲۰۱۱ء

اَکْثَرِیَّت وَ اَقَلِّیَّت سے متعلق قرآنی آیات

اَکْثَرِیَّت:

(۱) لَایَشْکُرُوْنَ (شکر نہیں کرتے ہیں): ۲۴۳:۲ ؛ ۳۸:۱۲ ؛ ۶۱:۴۰ ؛ ۱۷:۷ ؛ ۶۰:۱۰؛
۷۳:۲۷

(۲) لَایَعْلَمُوْنَ (نہیں جانتے ہیں): ۱۸۷:۷ ؛ ۲۱:۱۲ ؛ ۶۸:۱۲ ؛ ۳۸:۱۶ ؛ ۶:۳۰، ۳۰ ؛
۲۸:۳۴، ۳۶ ؛ ۵۷:۴۰ ؛ ۲۶:۴۵ ؛ ۳۷:۶ ؛
۱۳۱:۷ ؛ ۵۵:۱۰ ؛ ۷۵:۱۶، ۱۱۰ ؛ ۲۴:۲۱ ؛
۶۱:۲۷ ؛ ۱۳:۲۸، ۵۷ ؛ ۲۵:۳۱ ؛ ۲۹:۳۹، ۴۹ ؛
۳۹:۴۴ ؛ ۴۷:۵۲

(۳) لَایُؤْمِنُوْنَ (ایمان نہیں لاتے ہیں): ۱۰۰:۲ ؛ ۱۷:۱۱ ؛ ۱:۱۳ ؛ ۵۹:۴۰ ؛ ۱۰۲:۱۲ ؛
۸:۲۶، ۶۷، ۱۰۳، ۱۲۱، ۱۳۹، ۱۵۸، ۱۷۴، ۱۹۰
؛ ۷:۳۶

(۴) فَاسِقُوْنَ (بدکار لوگ): ۱۱۰:۳ ؛ ۵۹:۵ ؛ ۱۰۲:۷ ؛ ۸:۹

(۵) لِلْحَقِّ کَارِهُوْنَ (حق کو ناپسند کرنے والے): ۷۸:۴۳ ؛ ۷۰:۲۳

(۶) لَایَعْقِلُوْنَ (نہیں سمجھتے ہیں): ۱۰۳:۵ ؛ ۶۳:۲۹ ؛ ۴:۴۹

(۷) یَجْهَلُوْنَ (نہیں جانتے ہیں، جاہل ہیں): ۱۱۱:۶

(۸) وَمَایَتَّبِعُ اَکْثَرُهُمْ اِلَّا ظَنًّاط (اور ان میں اکثر
سوائے گمان کے کسی چیز کی پیروی نہیں
کرتے): ۳۶:۱۰

(۹) مُشْرِکُوْنَ (شرک کرنے والے): ۱۰۶:۱۲ ؛ ۴۲:۳۰

(۱۰) کَافِرُوْنَ (کفر کرنے والے): ۸۳:۱٦

(۱۱) کَاذِبُوْنَ (جھوٹ بولنے والے): ۲۲۳:۲٦

(۱۲) لَایَسْمَعُوْنَ (نہیں سنتے ہیں): ۴:۴۱

(۱۳) اَضَلُّوْا (گمراہ کیا): ۵:۷۷ ؛ ۷۱:۲۴

(۱۴) غَافِلُوْنَ (غافل ہیں، بے خبر ہیں): ۹۲:۱۰

(۱۵) مُعْرِضُوْنَ (حق سے روگردان ہوجاتے ہیں): ۲۱:۲۴

<u>اَقَلِّیَّتْ:</u>

(۱) وَمَآ اٰمَنَ مَعَهٗٓ اِلَّا قَلِیْلٌ (اس کے ساتھ تھوڑے ہی ایمان لائے): ۱۱:۴۰

(۲) وَقَلِیْلٌ مِّنْ عِبَادِیَ الشَّكُوْرُ (اور میرے شکرگزار بندے تھوڑے ہیں): ۳۴:۱۳ ؛ ۷:۱۰ ؛ ۲۳:۷۸

(۳) مَافَعَلُوْهُ اِلَّا قَلِیْلٌ مِّنْهُمْ ط (ان میں سے تھوڑے لوگ اس پر عمل کرتے ہیں): ۴:٦٦

(۴) وَقَلِیْلٌ مَّاهُمْ ط (اور ایمان لانے اور عملِ صالح کرنے والوں کی تعداد تھوڑی ہے): ۳۸:۲۴

(۵) فَلَا یُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِیْلًا (ایمان بہت تھوڑے لاتے ہیں): ۴:۴٦، ۱۵۵

فقیر حقیر

اوسٹن مرکز

۱۹، اکتوبر ۲۰۱۱ء

سورۂ کوثر کا شانِ نزول

سورۂ کوثر قرآن کا ایک نہایت مختصر سورہ ہے لیکن اس کے مضمون کی نسبت سے جو سلسلۂ امامت کی دائمیت کے بارے میں ہے، بہت بڑی اہمیت کا حامل ہے۔

تاریخی مآخذ خصوصاً شیعی مآخذ میں آیا ہے کہ حضرتِ خدیجۃ الکبری علیہا السلام سے آنحضرت کے دو فرزند ہوئے، حضرتِ قاسم اور حضرتِ عبداللہ علیہما السلام۔ حضرتِ قاسم علیہ السلام اولین نرینہ فرزند تھے اور آپ کی نسبت سے آنحضرت ابوالقاسم کی کنیت سے مشہور ہوئے۔ حضرتِ عبداللہ علیہ السلام آپ کے بعد پیدا ہوئے تھے اور بعض مآخذ میں آیا ہے کہ آنحضرت نے آپ کو طاہر و طیّب کے القاب سے بھی نوازا تھا۔ جب آنحضرت کے یہ دونوں فرزند یکے بعد دیگرے رحمتِ ایزدی سے واصل ہوئے تو کفّارِ مکہ بہت خوش ہوئے اور آنحضرت کو ''ابتر'' یعنی نسل بریدہ کا طعنہ دینے لگے کہ اب محمدؐ کی کوئی نرینہ اولاد باقی نہیں رہی ہے اس لئے جس دین کی وہ تبلیغ کرتا ہے وہ اس کے بعد باقی نہیں رہے گا اور خودبخود ختم ہو جائے گا۔

اسماعیلی دعوت میں جہاں چراغِ روشن کی رسم جاری رہی ہے وہاں خصوصیت کے ساتھ حضرتِ عبداللہ کا ذکر کیا جاتا ہے کہ یہ رسم آپ کی وفات پر جاری ہوئی اور سب سے پہلے آپ کی وفات پر اس رسم کو ادا کیا گیا تھا۔

الغرض آنحضرتؐ اس عظیم امتحان و ابتلاء کے موقع پر دشمنوں کے طعنہ سے بہت رنجیدہ ہوئے تھے۔ اس لئے حضرتِ ربّ العزت نے آپ کی تسلّی اور دلجوئی کے لئے اس سورہ کو نازل کیا اور بشارت دی کہ آپ کے اساس اور وصی حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام جو کہ کثیر الذریّہ ہیں اور حضرتِ خاتونِ جنت فاطمۂ زہرا علیہا السلام کی آلِ پاک کی صورت میں آپ کو کثیر اولاد دی گئی ہے جو ابد الآباد تک آپ کی دعوت کو جاری رکھیں گے۔ اس قرآنی بشارت کی وضاحت میں پیغمبرؐ نے فرمایا ہے: ''خدا نے ہر نبی کی اولاد اس کی صلب میں قرار دی اور میری اولاد علی کی صلب میں۔'' اس حدیث

کا ذکر سنی مآخذ میں بھی آیا ہے۔ (دیکھئے اہل البیت الاطھار فی الاحادیث النبویّۃ، ص ۵۵)۔ اور ساتھ ساتھ یہ بشارت بھی دی گئی کہ حقیقت میں ''ابتر یا نسل بریدہ'' وہی ہے جو زبردستی اور بغیر کسی حق کے امامت کا دعویٰ کرتا ہے۔ (دیکھئے پیر ناصر خسرو، وجہ دین، ترجمۂ اردو، صص ۳۲:۳۳)۔

فقیرحقیر

آسٹن مرکز

۲۲، اکتوبر ۲۰۱۱

مولانا عبد المطّلب کا عظیم معجزہ اور اصحابِ فیل کا حشر

حضرتِ ربّ العزّت ہر چند اپنی ذاتِ اقدس میں مکان و لامکان اور زمان و لازمان سے بالا و برتر ہے، لیکن بہت سی قرآنی آیات مثلاً (۱۵:۵ ؛ ۳۳:۴۵-۴۶ ؛ ۳۲:۹ ؛ ۸:۲۱ ؛ ۳۵:۲۴ ؛ ۳:۳۳-۳۴) اور خاص کر ''ھُوَالْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاھِرُ وَالْبَاطِنُ'' (۵۷:۳)۔ یعنی ''وہی (خدا ہی) اوّل ہے اور وہی آخر ہے اور وہی ظاہر ہے اور وہی باطن ہے۔'' اور ''وَھُوَالَّذِیْ فِی السَّمَآءِ اِلٰہٌ وَّفِی الْاَرْضِ اِلٰہٌ ط'' (۴۳:۸۴)۔ یعنی ''اور وہ (اللہ تعالیٰ) وہی ہے جو آسمان میں معبود ہے اور زمین میں بھی معبود ہے۔'' اور احادیثِ نبوی مثلاً : ''خَلَقَ اللّٰہُ عَزَّ وَجَلَّ آدَمَ عَلٰی صُوْرَتِہٖ'' (مسلم، حدیث ۶۳ ۷)۔ یعنی ''خدائے عزّ و جلّ نے آدم کو اپنی صورت پر بنایا۔'' اور ''اَلنَّظَرُ اِلٰی وَجْہِ عَلِیٍّ عِبَادَۃ'' (اھل البیت الاطھار فی الاحادیث النبویۃ ، حدیث ۳۲۸۹۵)۔ یعنی ''علیؑ کے چہرے کی طرف نگاہ ڈالنا عبادت ہے،'' سے ظاہر ہے کہ اس جلیل و جبّار نے اپنی بے پایان رحمت سے اپنے بندوں کو اپنی معرفت سے نوازنے کے لئے اپنے برگزیدہ بندوں کی صورت میں اس دنیا میں اپنا ظہور بھی کیا ہے۔ ان برگزیدہ بندوں کو اپنا خلیفہ اور اپنے نور کا مرکز و مظہر بناکر اپنے اور اپنے بندوں کے درمیان وسیلہ و واسطہ (۵:۳۵) بنایا تاکہ ان کے ذریعے ہر زمانے میں اس کی معرفت حاصل ہوتی رہے اور کسی کو شکایت کا موقع نہ ملے کہ اس کے زمانے میں معرفتِ الٰہی کا وسیلہ حاصل نہ تھا (۴:۱۶۵)۔ اس مظہرِ الٰہی کی معرفت جو اپنے اپنے زمانوں میں انبیاء و ائمہ کی صورت میں حاصل ہوتی رہتی ہے، اتنی اہم ہے، کہ جس کو یہ معرفت حاصل نہ ہو، قرآنِ حکیم نے اس کو دونوں جہان میں ''اندھا'' قرار دیا ہے (۱۷:۷۱-۷۲)۔ ان انبیاء و ائمہ سے ضرورت کے وقت حق کی حمایت میں خداوندی قدرت کا ظہور حسّی و عقلی معجزات کی صورت میں ہوتا رہا ہے۔

انبیاء و ائمہ کے کام میں ایک بنیادی فرق یہ رہا ہے کہ انبیاء کا کام ایک معینہ وقت تک رہتا ہے، لیکن اماموں کا کام ہمیشہ جاری و ساری ہے (۱۷:۷۱ ؛ ۱۳:۷)۔ البتہ ائمہؑ انبیاء کے دور میں ان کے وزیروں کی حیثیت میں پوشیدہ طور پر کام کرتے ہیں، لیکن دورِ امامت میں اعلانیہ طور پر اپنا کام

انجام دیتے ہیں۔ جیسا کہ مولانا علیؑ سے پیغمبرؐ نے فرمایا: ''یَاعَلِیُّ کُنْتَ مَعَ الْاَنْبِیَاءِ سِرّاً وَ مَعِیَ جَهْراً۔'' یعنی ''یاعلی تُو ہر پیغمبر کے ساتھ پوشیدہ تھا اور میرے ساتھ آشکار ہوگیا۔'' مولانا عبد المطّلب دورِ ستر کے ان اماموں میں سے ہیں۔

ان اماموں کے بارے میں یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ حضرتِ ابراہیمؑ کے بعد نورِ الٰہی نے مستقر اور مستودع دو صورتوں میں کام کرنا شروع کیا۔ حضرتِ اسماعیل علیہ السلام کی ذرّیت میں مستقر اماموں کا سلسلہ جاری رہا اور یہ امام ستر میں کام کرتے تھے اور یہ سلسلہ حضرتِ مولانا ابو طالب عمرانؑ تک پہنچا۔ آپؑ دورِ عیسیٰ کے آخری مستقر امام تھے۔ ساتھ ساتھ اس دور کے آخری امام ہونے کی وجہ سے آپ کی حیثیت امامِ مقیم کی بھی تھی اور آپ ہی نے بحیثیتِ امامِ مقیم ناطقِ ششم حضرتِ محمد مصطفیٰؐ کی روحانی تربیت کی۔ آنحضرتؐ پر دورِ نبوت ختم ہوًا اور مولانا ابو طالبؑ کی آل مولانا علیؑ سے امامت کا دَور شروع ہوگیا۔ مولانا عبد المطّلبؑ مولانا ابو طالبؑ کے والدِ گرامی تھے۔

دوسری طرف سے مستودع امامت حضرتِ اسحاق علیہ السلام کی ذرّیت میں جاری رہی اور اس سلسلے کے ائمہ نے انبیاء کی صورت میں ظاہری طور پر کام کیا اور آنحضرتؐ کے زمانے میں مستودع امامت بھی آپؐ کی طرف لوٹ آئی۔

چنانچہ حضرتِ مولانا عبد المطّلبؑ کے زمانے میں بہت بڑا معجزہ ہوًا اور یہ اصحابُ الفیل کی سرکوبی کے سلسلے میں واقع ہوًا۔ اس واقعہ کی تفصیلات میں بہت سی متضاد باتوں کا ذکر بھی آیا ہے، لیکن کعبہ کی حفاظت کے بارے میں مولانا عبد المطّلبؑ نے کمالِ طمانیّت اور استقامت کے ساتھ ابرہہ سے جو ارشاد فرمایا تھا اس میں تمام راوی متفق ہیں۔ اور یہاں پر اصل مقصود بھی وہ مقدس الفاظ اور ان کا نتیجہ ہے، نہ کہ واقعے کی تفصیلات۔ واقعے کا ذکر سورۃُ الفیل میں آیا ہے جو ایک مکّی صورت ہے۔ ترتیبِ نزول کے لحاظ سے اس کا نمبر ۱۹ اور موجودہ ترتیب کے لحاظ سے نمبر ۱۰۵ ہے۔

یہ واقعہ آنحضرتؐ کی ولادتِ باسعادت سے چالیس یا پچاس دن پہلے حضرتِ مولانا عبد المطّلبؑ کے زمانے میں سنِّ عیسوی کے حساب سے ۵۷۱ء اور سنِّ رومی کے حساب سے ۸۸۲ سکندری میں پیش آیا۔ اہلِ عرب میں یہ واقعہ اس قدر مشہور ہوًا کہ اس سال کا نام ''عامُ الفیل'' (ہاتھیوں والا سال) پڑ گیا

اور اس کے بعد اہلِ عرب تاریخی واقعات کو اسی سنّ کے حساب سے شمار کرنے لگے۔

واقعہ کے پس منظر کے بارے میں یوں لکھا جاتا ہے کہ: **ابرھۃ الاشرم** (نکٹا) جو شاہ حبش نجاشی الیباس (الاصبح) کی طرف سے یمن کا گورنر تھا، اس کو کعبے سے حسد تھا۔ اس نے صنعاء میں ایک شاندار گرجا بنایا اور نجاشی کو لکھا کہ میری تمنا ہے کہ اہلِ عرب جو مکہ میں کعبہ کا حج کرنے کے لئے جمع ہوتے ہیں، اُن کا رُخ اس کی طرف پھیر دوں۔ اہلِ عرب نے یہ سُنا تو وہ سخت برہم ہوگئے۔ اور ایک حجازی نے اس میں ایک رات پاخانہ کیا۔ جب ابرہہ کو اس کا علم ہوُا تو اُس نے قسم کھائی کہ کعبہ کو برباد کئے بغیر چین سے نہیں بیٹھے گا۔ چنانچہ ایک بہت بڑے لشکر کے ساتھ جس میں ہاتھی بھی تھے، کعبہ پر حملہ آور ہوُا۔ مکہ کے قریب پہنچے تو وہاں قریش اور دوسرے قبائل کی بھیڑ بکریوں اور اونٹوں کے ریوڑ تھے، اُن پر چھاپہ مار کر اپنے کیمپ لے گئے۔ اُن اونٹوں میں مولانا عبد المطّلبؑ کے اونٹ بھی تھے۔

اسی دوران ابرہہ کی طرف سے ایک قاصد مکہ پہنچا اور پوچھا کہ یہاں کا سردار کون ہے؟ لوگوں نے مولانا عبد المطّلبؑ کی طرف اشارہ کیا۔ اُس نے مولانا عبد المطّلبؑ سے کہا کہ ہمارے بادشاہ کا پیغام ہے کہ ہمیں آپ کو نہ نقصان پہنچانا ہے اور نہ آپ کے ساتھ جنگ کرنی ہے، ہم تو صرف کعبہ کو منہدم کرنے آئے ہیں۔ اگر آپ کو کعبہ کی حفاظت کی خاطر ہمارے ساتھ جنگ نہیں کرنی ہے تو ہمارا بادشاہ آپ سے ملاقات کا خواہشمند ہے۔ مولانا عبد المطّلبؑ نے فرمایا کہ ہمارے پاس آپ کے مقابلے کی طاقت نہیں۔ جہاں تک کعبہ کا تعلق ہے یہ خدا کا گھر ہے اور وہ خود اس کی حفاظت کرے گا۔

اس کے بعد مولانا عبد المطّلبؑ ابرہہ کے دربار پہنچے۔ ابرہہ آپؑ کی جلالت و عظمت سے بہت متأثر ہوُا اور نہایت احترام کے ساتھ پیش آیا۔ دورانِ گفتگو مولانا عبد المطّلبؑ نے شکایت کی کہ آپ کے ایک سردار نے ہمارے اونٹوں پر چھاپہ مارکر آپ کے کیمپ میں لایا ہے، ان کو واپس کیا جائے۔ ابرہہ نے کہا کہ مجھے تعجب ہے کہ آپ اپنی قوم کے سردار ہیں، آپ نے کعبہ کے بارے میں، جو آپ کے پاس سب سے زیادہ عظیم اور مقدس ہے، کوئی بات نہیں کی اور اونٹوں جیسی حقیر چیز کی

بات کر رہے ہیں؟ اس پر آپؑ نے فرمایا: ''اَنَا رَبُّ الْاِبْلِ وَ اِنَّ لِلْبَیْتِ رَبّاً سَیَمْنَعُه۔'' یعنی ''مَیں اونٹوں کا مالک ہوں اور یقیناً اس گھر کا بھی ایک مالک ہے وہ اس کی حفاظت خود کرے گا۔'' ابرہہ نے اونٹوں کو واپس کرنے کا حکم دیا، لیکن اس بیان سے اس پر ایک دہشت طاری ہوگئی۔

مولانا عبد المطّلبؑ نے مکہ لوٹ کر لوگوں سے فرمایا کہ وہ ارد گرد کی پہاڑیوں میں پناہ لے لیں۔ خود آپؑ نے کعبہ آکر امدادِ الٰہی طلب فرمائی اور پناہ کے لئے ایک درّے کی طرف گئے۔ اور اپنے ایک بیٹے کو کُوہِ قُبَیْس کے اوپر بھیج دیا کہ دیکھے کیا ہو رہا ہے۔ بیٹے نے آکر اطلاع دی کہ سمندر کی طرف سے ایک سیاہ بادل آتا ہؤا نظر آ رہا ہے۔ اس سے آپؑ خوش ہوئے اور فرمایا: ''یَامَعْشَرَ قُرَیْش! اُدخُلُوا مَنَازلکُم فَقَدْ آتاکُمُ اللهُ بِالنَّصْرِ مِنْ عِنْدَه۔'' ''اے جمعیتِ قریش! اپنے گھروں میں داخل ہو جاؤ کیونکہ خدا کی نصرت تمہاری مدد کے لئے آ رہی ہے۔

اس دوران ابرہہ جب مُزْدَلِفَه اور مِنَی کے درمیان وادیٔ مُحَسَّر پہنچا تو یکایک سمندر کی طرف سے پرندوں کے جُھنڈ کے جُھنڈ اپنی چونچوں اور پنجوں میں کنکریاں لئے ہوئے آئے اور انہوں نے اس لشکر پر کنکریوں کی بارش کر دی۔ جس جس پر کوئی کنکری پڑتی اس کا گوشت گل گل کر جھڑنا شروع ہو جاتا۔ اس طرح یہ سارا لشکر تباہ ہوگیا۔ کہا جاتا ہے کہ ابرہہ زخمی حالت میں یمن پہنچ کر صورتِ حال شاہ حبش کو سنا رہا تھا۔ جیسے ہی اُس نے سنانا ختم کیا تو ایک پرندے نے جو اس کے اوپر اڑتے ہوئے وہاں پہنچا تھا، اس کو کنکری مار دی اور وہ ختم ہوگیا۔ اس حالت کا ذکر قرآنِ حکیم میں سورۂ فیل میں یوں آیا ہے: ''بِسْـمِ اللهِ الـرَّحْـمٰنِ الـرَّحِیْمِ ۔ کیا تُو نے نہیں دیکھا کہ تیرے پروردگار نے ہاتھی والوں کے ساتھ کیسا برتاؤ کیا؟ کیا اُس نے ان کی تدبیر کو اکارت نہیں کر دیا؟ اور ان پر پرندوں کے جُھنڈ کے جُھنڈ بھیج دیئے جو ان کے اوپر سجّیل کی کنکریاں برسا رہے تھے۔ پس اس نے انہیں کھائے ہوئے بھوسے کی مانند کر دیا۔''

اس سورے میں جس لشکرِ جرّار کی کُلّی تباہی کا ذکر آیا ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ بہت بڑا معجزہ تھا جو آنحضرتؐ کی ولادتِ باسعادت سے پہلے وقوع پذیر ہؤا۔ بایں ہمہ دعوتِ حق میں ہر ظاہر کا ایک باطن بلکہ کئی بواطن ہوتے ہیں۔ ظاہری یا حسّی معجزہ ہنگامی معجزہ ہوتا ہے جو ایک خاص زمان و

مکان سے تعلق رکھتا ہے اور باطنی یا عقلی معجزہ دائمی معجزہ ہوتا ہے جو تمام ازمنہ و امکنہ پر محیط ہوتا ہے۔ ذیل میں اس معجزے کے باطنی یا عقلی پہلو پر اُستادِ گرامی نے تأویل کی جو روشنی ڈالی ہے اس کو بیان کرنے کی کوشش کی جاتی ہے:

اس سورے میں سب سے پہلے رفعِ زمان کے دائمی معجزے کا ذکر آیا ہے۔ یعنی جب پیغمبرؐ سے ایک ایسے واقعہ کے بارے جو آپؐ کی ولادت سے پہلے واقع ہوُا تھا پوچھا جاتا ہے ''کیا تُو نے نہیں دیکھا؟'' تو اس کا مطلب یہ ہے کہ انبیاء، أئمہ اور عرفاء ماضی اور مستقبل دونوں کو حال میں دیکھ سکتے ہیں، اس لئے کہ ان کے سامنے سے زمان و مکان کے پردے کو ہٹایا جاتا ہے۔

اصحابِ فیل سے مراد اہلِ باطل اور طاغوتی طاقتیں ہیں جو حق کو مٹانے کی کوشش کرتی رہتی ہیں۔ کعبہ سے مراد انسانِ کامل ہے۔ پرندوں سے مراد فرشتے ہیں۔ سجّیل جو فارسی میں سنگِ گِل کا معرّب ہے، میں دو چیزیں ہوتی ہیں: ایک تو مٹی ہے اور دوسرا پانی۔ مٹی اعتقاد کی مثال ہے اور پانی علم الیقین کی مثال۔ اور گارے سے بنے ہوئے پتھر سے ایسا مؤمن مراد ہے جس کا اعتقاد سخت محکم ہوتا ہے اور ساتھ ساتھ علم الیقین سے مسلح ہوتا ہے۔ چنانچہ ایسے مؤمنین کی شان میں قرآنِ کریم میں آیا ہے: ''یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَنْ یَّرْتَدَّ مِنْکُمْ عَنْ دِیْنِہٖ فَسَوْفَ یَاْتِی اللّٰہُ بِقَوْمٍ یُّحِبُّھُمْ وَ یُحِبُّوْنَہٗٓ اَذِلَّۃٍ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ اَعِزَّۃٍ عَلَی الْکٰفِرِیْنَ یُجَاھِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَلَایَخَافُوْنَ لَوْمَۃَ لَآئِمٍ ط'' (۵:۵۴)۔ یعنی ''اے وہ لوگو! جو ایمان لا چکے ہو، تم میں سے جو کوئی بھی اپنے دین سے پھر جائے گا تو عنقریب ہی اللہ تعالیٰ ایک ایسی قوم کو لے آئے گا جن سے وہ محبت کرتا ہے اور وہ اس سے محبت کرتے ہیں، وہ مومنین پر نرم ہیں اور کافروں پر سخت۔ وہ راہِ خدا میں جہاد کرتے ہیں اور ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈرتے۔''

اس سورے کی مجموعی تأویل بیان کرتے ہوئے کتاب ''گنجِ گرانمایہ'' میں استادِ گرامی لکھتے ہیں:

''اللہ تعالیٰ نے ہاتھی والوں کو کسی اور پتھر سے نہیں بلکہ سجّیل کی کنکریوں سے ہلاک کر دیا۔ اس میں بہت بڑا راز ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ خانۂ کعبہ یا خانۂ خدا جس طرح ظاہر میں مادّی طور پر موجود ہے، اسی طرح باطن میں روحانی حیثیت میں موجود ہے۔ اور جس طرح اہلِ باطل نے جسمانی حالت میں ایک بار خدا کے ظاہری گھر کو مٹانے کے لئے کوشش کی تھی، اسی طرح وہ روحانی کیفیت میں ہر

بار اللہ کے باطنی گھر کو مٹانے کی سعی کرتے ہیں۔ یعنی وہ ذرّات کی شکل میں ایک خاص وقت میں انسانِ کامل پر حملہ آور ہو جاتے ہیں، مگر اللہ تعالیٰ اپنے پاک نورانی گھر کی حفاظت کے لئے فرشتوں کا ایک لشکر بھیجتا ہے جس کے ذریعے سے راسخ العقیدہ اور جان نثار مؤمنین و مؤمنات کے ذرّاتِ اَرواح کی کنکریاں برسا کر خانۂ کعبہ یا خانۂ خدا کے دشمنوں کو تباہ کیا جاتا ہے۔'' (گنجِ گرانمایہ، صص، ۸۶-۸۷)۔ **اَلْحَمْدُلِلّٰہِ عَلٰی مَنِّہٖ وَاِحْسَانِہٖ۔**

فقیر حقیر

مرکزِ علم و حکمت، لندن

۷، نومبر ۲۰۱۱ء

اَسمَائے مُبَارَک خَاتَمُ النَّبِیّیْن

حَضرَتِ مُحَمَّد مُصطَفٰی صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم

آنحضرتؐ کے اسمائے مبارک کی کثرت کا اندازہ اس ارشادِ مقدس سے ہوتا ہے جو فرمایا گیا ہے: ''قرآن تمام وصفِ کمالِ محمدؐ است''، یعنی قرآن سراسر (تنزیلی اور تأویلی معنوں میں) آپؐ کے کمال کا بیان ہے۔ چنانچہ قرآنِ کریم اور احادیثِ نبوی کی بنیاد پر آپؐ کے اسماء کی تعداد مقرر کرنے کی الگ الگ کوششیں کی گئی ہیں۔ ایک تحقیق کے مطابق آنحضرتؐ کے اسماء کی تعداد بعض کے نزدیک چونسٹھ ہے۔ بعض کے نزدیک ننانوے، بعض کے نزدیک تین سو، اور بعض کے نزدیک ایک ہزار تک بھی ہے۔ (مولانا محمد حفظ الرحمٰن سیوہاروی، قصص القرآن، حصۂ چہارم، ص،۲۱۴)۔ اس لئے ان کی ایک جامع و مانع فہرست پیش کرنا تقریباً ایک ناممکن کام ہے۔ ذیل میں سرِ دست صرف ایک ایسی فہرست کا ترجمہ پیش کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، جس پر بعض شیعی اور سنّی حضراتِ مترجمین و شارحین کا اتفاق ہے۔

(۱) مُحَمَّدٌ = تعریف کیا ہوَا، سراہا ہوَا

(۲) اَحْمَدُ = بڑا سراہا ہوَا

(۳) حَامِدٌ = تعریف کرنے والا، سراہنے والا

(۴) مَحْمُوْدٌ = تعریف کیا ہوَا، سراہا ہوَا

(۵) قَاسِمٌ = تقسیم کرنے والا، بانٹنے والا

(۶) عَاقِبٌ = سب سے آخر میں آنے والا

(۷) فَاتِحٌ = فتح پانے والا، کھولنے والا

(۸) شَاهِدٌ = گواہ، حاضر

(۹) حَاشِرٌ = جمع کرنے والا

(۱۰) رَشِیۡدٌ = راہِ راست پانے والا، راہِ راست پایا ہوا

(۱۱) مَشۡھُوۡدٌ = جس کے لئے گواہی دی گئی ہے

(۱۲) بَشِیۡرٌ = خوشخبری دینے والا، بشارت دینے والا، مُبَشِّر

(۱۳) نَذِیۡرٌ = ڈرانے والا

(۱۴) دَاعٍ = دعوت دینے والا، بُلانے والا

(۱۵) شَافٍ = شِفا دینے والا

(۱۶) ھَادٍ = ہدایت کرنے والا

(۱۷) مَھْدٍ = ہدایت کیا گیا

(۱۸) مَاحٍ = مٹانے والا، محو کرنے والا

(۱۹) مُنۡجٍ = نجات دینے والا

(۲۰) نَاہٍ = منع کرنے والا، روکنے والا

(۲۱) رَسُوۡلٌ = پیغمبر، پیغام لانے والا

(۲۲) نَبِیٌّ = خبر دینے والا، یعنی عالمِ روحانی کی خبر دینے والا

(۲۳) اُمِّیٌّ = وہ شخص جو کتابِ کائنات نہیں پڑھ سکتا ہے

(۲۴) تِھَامِیٌّ = تِہامہ کا رہنے والا

(۲۵) ھَاشِمِیٌّ = مولانا ہاشمؑ کی اولاد سے

(۲۶) اَبۡطَحِیٌّ = اَبۡطح (بطحاء) یعنی مکّۂ معظّمہ کا رہنے والا

(۲۷) عَزِیۡزٌ = عزّت والا، وہ شخص جس پر شاق گزرے

(۲۸) حَرِیۡصٌ = خواہشمند، لالچی

(۲۹) رَءُوۡفٌ = رأفت والا، مہربان

(۳۰) رَحِیۡمٌ = رحم والا، مہربان

(۳۱) طٰهٰ = اے طالبِ حق، اے ہادیٔ راہِ حق

(۳۲) مُجتَبٰی = برگزیدہ، پسندیدہ، چنا ہوُا

(۳۳) طٰسٓ = طٰسٓ

(۳۴) مُرتَضٰی = پسندیدہ، چنا ہوُا

(۳۵) حٰمٓ = حٰمٓ

(۳۶) مُصطَفٰے = برگزیدہ، مقبول، چنا گیا

(۳۷) یٰسٓ = اے وحی کا سننے والا، اے سیّد

(۳۸) اَوُلٰی = زیادہ حق رکھنے والا

(۳۹) مُزَّمِّلٌ = کپڑوں میں لپٹنے والا، چادر لپیٹنے والا

(۴۰) وَلِیٌّ = حق رکھنے والا

(۴۱) مُدَّثِرٌ = کپڑا اوڑھنے والا

(۴۲) مَتِیُنٌ = مضبوط، مستحکم، پائیدار

(۴۳) مُصَدِّقٌ = تصدیق کرنے والا، سچّا ثابت کرنے والا

(۴۴) طَیِّبٌ = پاکیزہ، پسندیدہ

(۴۵) نَاصِرٌ = مددگار، مدد کرنے والا

(۴۶) مَنُصُوُرٌ = مدد کیا ہوُا

(۴۷) مِصُبَاحٌ = چراغ

(۴۸) اٰمِرٌ = امر کرنے والا، حکم دینے والا

(۴۹) حِجَازِیٌّ = حجاز کا رہنے والا

(۵۰) قُرَشِیٌّ = مولانا قریشؒ جن کا اصل نام لؤیّ تھا، کی اولاد

(۵۱) مُضَرِیٌّ = مولانا مضرؑ کی اولاد

(۵۲) نَبِیُّ التَّوُبَةِ = توبہ کا نبیّ

(۵۳) حَافِظٌ = حفاظت کرنے والا، حفظ کرنے والا

(۵۴) کَامِلٌ = پورا

(۵۵) صَادِقٌ = سچّا

(۵۶) اَمِیْنٌ = امانتدار، قابلِ اعتبار

(۵۷) عَبْدُاللّٰهِ = خدا کا بندہ

(۵۸) کَلِیْمُ اللّٰهِ = خدا سے کلام کرنے والا

(۵۹) حَبِیْبُ اللّٰهِ = خدا کا دوست

(۶۰) نَجِیُّ اللّٰهِ = خدا کے ساتھ سرگوشی کرنے والا

(۶۱) صَفِیُّ اللّٰهِ = خدا کا برگزیدہ، خدا کا خالص دوست

(۶۲) خَاتَمُ الْاَنْبِیَاء = نبیوں کا خاتَم

(۶۳) حَسِیْبٌ = حساب لینے والا

(۶۴) مُجِیْبٌ = جواب دینے والا، قبول کرنے والا

(۶۵) شَکُوْرٌ = بڑا شکرگزار

(۶۶) مُقْتَصِدٌ = میانہ رَو، درمیانی راہ چلنے والا

(۶۷) رَسُوْلُ الرَّحْمَةِ = رحمت کا رسول

(۶۸) قَوِیٌّ = زبردست، توانا

(۶۹) حَفِیٌّ = مکمل علم رکھنے والا، لطیف و شفیق، بڑا مہربان

(۷۰) مَأمُوْنٌ = قابلِ اعتماد، محفوظ

(۷۱) مَعْلُوْمٌ = جان ہوُا

(۷۲) حَقٌّ = ثابت، قائم

(۷۳) مُبِیْنٌ = آشکار، بیان کرنے والا

(۷۴) مُطِیْعٌ = فرمان بردار، اطاعت گزار

(۷۵) رَسُوْلُ الرَّاحَةِ = راحت کا پیغمبر

(۷۶) اَوَّلٌ = اوّل

(۷۷) اٰخِرٌ = آخر

(۷۸) ظَاهِرٌ = آشکار

(۷۹) بَاطِنٌ = پوشیدہ

(۸۰) نَبِیُّ الرَّحْمَةِ = رحمت کا نبی

(۸۱) یَتِیْمٌ = نابالغ جس کے والدین میں سے باپ یا ماں اور باپ دونوں وفات پا چکے ہوں، بے نظیر

(۸۲) کَرِیْمٌ = بزرگ والا، عزّت والا

(۸۳) حَکِیْمٌ = حکمت والا، دانا

(۸۴) خَاتَمُ الرُّسُلِ = رسولوں کا خاتَم

(۸۵) سَیِّدٌ = سردار، پیشوا

(۸۶) سِرَاجٌ = چراغ

(۸۷) مُنِیْرٌ = روشن، نور دینے والا

(۸۸) مُحَرَّمٌ = قابلِ احترام و تقدس

(۸۹) مُکَرَّمٌ = قابلِ تعظیم، گرامی

(۹۰) مُبَشِّرٌ = خوشخبری دینے والا، بشیر

(۹۱) مُذَکِّرٌ = نصیحت حاصل کرنے والا

(۹۲) مُطَهَّرٌ = پاک کیا ہوا

(۹۳) قَرِیْبٌ = نزدیک

(۹۴) خَلِیْلٌ = گہرا دوست

(۹۵) مَدْعُوٌّ = دعوت دیا گیا، بُلایا گیا

(۹۶) **جَوَّادٌ** = سخی، فیّاض

(۹۷) **عَادِلٌ** = عدل کرنے والا، انصاف کرنے والا

(۹۸) **شَهِيْدٌ** = گواہ، حاضر

(۹۹) **شَهِيْرٌ** = مشہور

(۱۰۰) **رَسُوْلُ الْمَلَاحِمِ**= جنگوں کا پیغمبر

مآخذ: القرآن الکریم، ترجمہ و حواشی از تفسیرِ نمونہ، مترجم: علامہ سید صفدر حسین نجفی؛ القرآن الحکیم، ترجمہ از مولوی حافظ نذیر احمد

فقیر حقیر
مرکزِ علم و حکمت، لندن
۱۸، جنوری ۲۰۱۲ء

خطبہ ۱۶۳

(از کتاب نہج البلاغہ)

مولانا علی، علینا منہ السلام، کا ایک خطبہ جس میں آپؑ طاؤس کی حیرت انگیز خلقت کا تذکرہ فرماتے ہیں:

اس (خدای تعالیٰ) نے ان کو ایک حیرت انگیز مخلوق کے طور پر ابداع[1] کیا، جیسے جاندار و بیجان، ساکن و متحرک۔ پھر اس [تبارک و تعالیٰ] نے اپنی لطیف[2] صنعت[3] اور عظیم قدرت پر روشن شواہد[4] میں سے وہ چیز پیش کی کہ عقلوں نے اس کا اعتراف کرتے ہوئے اور اس کو مانتے ہوئے اس کے لئے سرِ تسلیم خم کر لیا۔ اور اس کے دلائل ہمارے کانوں میں گونج رہے ہیں جو اس نے اپنی وحدانیت اور جو کچھ اس نے بنایا ہے اُن پر دیئے ہیں۔ جیسے مختلف صورت والے پرندے جن کو زمین کے خندقوں، درّوں[5] کے شگافوں اور پہاڑوں کی چوٹیوں پر بسایا ہے، جو طرح طرح کے پَر، جُدا جُدا شکلیں رکھتے ہیں، اور تسخیر کے لگام میں فرمانبردار کھلی ہوا اور کشادہ فضا میں اپنے پَروں کو پھڑ پھڑاتے ہیں۔ اس نے ان کو حیرت انگیز ظاہری صورتوں میں وجود بخشا، بعد اس کے کہ کچھ بھی نہ تھے۔ اور ڈھکے ہوئے جوڑوں کے کاسوں[6] (حِقاق) میں ان کو باہم ملاکر ایک کر دیا۔ اور بعض کو ان کی خلقت کی سنگینی[7] کی وجہ سے تیزی اور پھرتی کے ساتھ ہوا (آسمان) میں بلند ہونے سے روک دیا، اور زمین سے ذرا اوپر پرواز کرنے کے قابل بنا دیا۔ اور اپنی لطیف قدرت اور دقیق[8] صنعت سے ان کے رنگوں میں جو اختلاف ہے اس کے مطابق ان کو ترتیب[9] دیا۔ ان میں سے بعض ایک ہی رنگ کے قالب میں ڈھلے ہوئے ہیں، جس میں ان کو ڈھالا گیا ہے، اس کے علاوہ کوئی اور رنگ اس کے ساتھ نہیں ملتا۔ اور بعض ایک ہی رنگ میں ڈھلے ہوئے ہیں، سوائے گردن کے طوق[10] کا رنگ جو اس رنگ سے مختلف ہے جس میں ان کو ڈھالا گیا ہے۔

طاؤس

بہ حیثیت مخلوق ان میں سب سے زیادہ حیرت انگیز طاؤس ہے جس کو اس نے محکم ترین تعدیل[11] میں وجود میں لایا ہے اور اس کے رنگوں کو بہترین ترتیب میں مرتب کیا ہے۔ ایسے پَروں کے ساتھ کہ جن کی جڑوں کو ایک دوسرے سے جوڑ دیا ہے، اور ایسی دُم کے ساتھ کہ جس کے کھینچنے اور گھسیٹنے کی جگہ لمبی ہوتی جاتی ہے۔ جب وہ اپنی مورنی کا رُخ کرتا ہے تو اس کو اس کی لپیٹ سے پھیلاتا ہے اور اپنے سر پر سایہ ڈالتے ہوئے اس کو بلند کرتا ہے، گویا کہ وہ داریّ[12] [کشتی] کا بادبان ہے جس کو اس کا ملاّح کھینچتا اور بلند کرتا ہے۔ وہ اپنے دُم کے رنگوں پر اِتراتا ہے اور اس کی دائیں بائیں حرکت پر اَکڑ کر چلتا ہے۔ وہ مرغوں کی طرح (اپنی مادہ) کی طرف جاتا ہے اور اس کو حمل ٹھہرانے کے لئے پُرشہوت سانڈوں کی طرح اپنے اعضائے تناسل سے اس کے ساتھ جماع کرتا ہے۔ اس سلسلے میں مَیں تجھے ایک معائنے کا حوالہ دیتا ہوں، نہ کسی ایسے شخص کی طرح جو ایک ضعیف سند کا حوالہ دیتا ہو۔ اگر [حقیقتِ حال] گمان کرنے والوں کے گمان کی طرح ہوتا کہ وہ اپنی مادہ کو ایک آنسو سے حاملہ کرتا ہے جس کو اس کی آنکھیں بہاتی ہیں اور وہ پلکوں کے کناروں پر ٹھہرتا ہے اور اس کی مادہ اس کو چُوس لیتی ہے، پھر اُس آنسو سے انڈے دیتی ہے نہ کہ کسی نر کے نطفے سے، تو بھی یہ مطاعمۂ غراب[13] سے زیادہ حیرت انگیز نہ ہوتا!

تُو اس کے پَروں کی جڑوں کو چاندی کی سلائیاں اور ان پر جو کچھ اُگایا گیا ہے، جیسے اس کے حیرت انگیز ہالے[14] اور سورج، کو خالص سونا اور زبرجد[15] کے ٹکڑے خیال کریگا۔ اگر تُو اس کو زمین کی نباتات سے تشبیہ دے گا تو کہے گا کہ یہ ایک گلدستہ ہے جو ہر بہار کے پھولوں سے چُنا گیا ہے۔ اگر پوشاک کے ساتھ مقابلہ کرائے گا تو یہ حُلّوں[16] میں منقش (حُلّہ) یا یمن کے چادروں میں خوشنما (چادر) ہوگا۔ اور اگر زیورات سے تشبیہ دیگا تو یہ گونا گون رنگوں کے نگینوں کی طرح ہوگا جن کو جواہرات سے مزیّن[17] نطاقِ[18] سیمین[19] پہنایا گیا ہو۔ وہ ایک مگن اور اکڑ باز کی طرح چلتا ہے۔ وہ اپنی دُم اور

پَروں کو غور سے دیکھتا ہے اور اپنے لباس کے جمال اور وشاح[۲۰] کے رنگوں پر ہنستے ہوئے قہقہے لگاتا ہے۔ پھر جب وہ اپنے پاؤں پر نظر ڈالتا ہے تو وہ واویلا کرتے ہوئے ایک ایسی آواز نکالتا ہے کہ وہ مشکل سے اس کی فریاد سے الگ ہو سکتی ہے، اور اپنے سچے افسوس کی شہادت دے رہا ہے، اس لئے کہ اس کے پاؤں خِلاسی[۲۱] مرغوں کی طرح باریک ہیں اور اس کی پنڈلی کی ہڈی سے ایک پوشیدہ کانٹا اُبھرا ہوُا ہے۔ اور عرف[۲۲] کی جگہ اس کی ایک منقش سبز کلغی[۲۳] ہے۔

اور اس کی گردن کی برآمدگی کا مقام (مَـــخْـــرَج) صراحی دار لوٹے کی طرح ہے۔ اور اس کی گردن کی جوڑ (مغرز) سے لے کر جہاں تک اس کا پیٹ ہے یمنی وسمہ[۲۴] کے رنگ کی طرح ہے، یا ایک ایسے ریشمی کپڑے کی طرح ہے جسے ایک صیقل[۲۵] کئے ہوئے آئینہ پر پہنایا گیا ہے، اور وہ گویا ایک کالی اوڑھنی سے ڈھک گیا ہے۔ سوائے اس کے کہ اس کی چمک کی کثرت اور دمک کی شدّت سے خیال کرتا ہے کہ اس کے ساتھ تر و تازہ سبز رنگ ملا ہوُا ہے۔ اور اس کے کانوں کے سوراخ کے ساتھ قلم کی باریک نوک کی طرح گل بابونہ[۲۶] کے نہایت سفید رنگ میں ایک لکیر ہے جو اپنی سفیدی کی وجہ سے وہاں کی سیاہی میں چمکتی ہے۔ اور شاید ہی کوئی رنگ ایسا ہوگا جس سے اس نے ایک [مناسب] حصہ نہ لیا ہو۔ لیکن اپنی چمک اور دمک کی کثرت اور اپنے چہرے اور رونق کی درخشندگی کی وجہ سے اس پر فوقیت[۲۷] لے جاتا ہے۔ پس وہ بکھرے ہوئے پھولوں کی طرح ہے جن کی پرورش نہ موسمِ بہار کی بارشوں نے کی ہے اور نہ موسمِ گرما کے سورجوں نے۔

اور پھر اس کے بال گر جاتے ہیں اور وہ اپنے لباس سے عُریان[۲۸] ہو جاتا ہے۔ وہ متواتر[۲۹] گر جاتے اور پھر سے لگاتار اُگتے ہیں۔ پس [یہ بال] اس کے بازو کی ہڈی سے اس طرح جَھڑ جاتے ہیں جس طرح شاخوں سے پتّے۔ پھر بڑھتے ہوئے ایکدوسرے کو پالتے ہیں یہاں تک کہ اس ہئیت[۳۰] کی طرف لوٹتے ہیں جو ان کے گرنے سے پہلے تھی۔ اس کے گزشتہ رنگوں سے کوئی رنگ مختلف نہیں ہوتا اور نہ کوئی رنگ اپنی جگہ چھوڑ کر کسی اور جگہ پر واقع ہوتا ہے! جب تُو اس کے بازو کی ہڈی کے بالوں میں کسی ایک بال کو غور سے دیکھے گا تو تجھے [کبھی] گلابی سرخی، کبھی زبرجدی سبزی اور کبھی سنہری زردی دکھائی دے گا۔

پھر تو فراستوں[۳۱] کی گہرائیاں اس کی صفت تک کس طرح پہنچ سکتی ہیں! یا عقلوں کی استعدادیں[۳۲] اس تک کس طرح رسائی کر سکتی ہیں! یا واصفین[۳۳] کے اقوال اس کے وصف[۳۴] کو منظّم کس طرح کر سکتے ہیں! جبکہ اس کے اجزاء میں سے سب سے چھوٹے جزء نے اوہام[۳۵] کو خود کو درک[۳۶] کرنے اور زبانوں کو اپنی صفت بیان کرنے سے عاجز کر دیا!

پس پاک ہے وہ ذات ہر صفت سے جس نے عقلوں کو ایک ایسے مخلوق کی صفت بیان کرنے سے بے بس کر دیا جس کو اس نے آنکھوں کے سامنے رکھا! اور انہوں نے اس کو محدود، موجود، مؤلف اور رنگین پایا۔ اور زبانوں کو [بھی] اس کا خلاصہ بیان کرنے اور اس کی تعریف کو ادا کرنے سے بے بس کر دیا! پاک ہے ہر صفت سے وہ ذات جس نے ایک چھوٹی چیونٹی اور مچھر سے لے کر ان کے اوپر مچھلیوں اور ہاتھیوں کی مخلوقات تک کے پیروں کو مستحکم بنا دیا، اور اپنے اوپر وعدہ کیا ہے کہ کوئی پیکر[۳۷] جس میں روح ڈالی گئی ہے حرکت نہیں کرے گا، سوائے اس کے کہ موت کو اس کے وعدے کا وقت اور فنا کو اس کا انجام مقرر کرے۔

مترجم: ڈاکٹر فقیر محمد ہونزائی
مرکزِ علم و حکمت، لندن
۲، مارچ ۲۰۱۲ء

مشکل الفاظ کے معانی

(۱) اِبداع = بغیر کسی سابقہ نمونہ یا ذریعہ کے چشم زدن میں کسی چیز کو پیدا کرنا

(۲) لطیف = نازک، شفاف، پاک

(۳) صنعت = کاریگری

(۴) شواہد = شاہد کی جمع، دلیل، گواہ

(۵) درّوں = درّہ کی جمع، گھاٹی، دو پہاڑوں کے درمیان کا راستہ

(۶) کاسوں = کاسہ کی جمع، ایک جانب سے خلادار عضو جس میں اور کوئی عضو جاگزین ہو سکتا ہو

(۷) سنگینی = گرانی، بھاری پن، ٹھوس پن

(۸) دقیق = باریک، نازک

(۹) ترتیب = اپنے مرتبے پر رکھنا، درجہ بدرجہ ٹھیک رکھنا

(۱۰) طوق = بعض پرندوں کے گلے کا گول نشان

(۱۱) تعدیل = اعتدال، برابری

(۱۲) دارِیّ = دارین سے تعلق رکھنے والے۔ دارین گزشتہ زمانے میں بحرین کا ایک جزیزہ اور بندرگاہ تھا

(۱۳) مطاعمۂ غراب = مطاعمہ کے لفظی معنی ایک دوسرے کو کھلانا، اور غراب کے معنی کوّا۔ یہ ایک عام روایت کی طرف اشارہ ہے کہ مادہ کوّے کا حمل مجامعت کے ذریعے نہیں بلکہ نر کوّا اپنی مادہ کی چونچ سے چونچ ملا کر اپنے سنگدانہ کا پانی اس کے منہ میں ٹپکا دیتا ہے اور وہ انڈے دیتی ہے

(۱۴) ہالے = ہالہ کی جمع، دائرہ، کُنڈل، چاند یا سورج کا حلقہ

(۱۵) زبرجد = ایک قسم کا زمرد، ایک سبز رنگ کا قیمتی پتھر

(۱۶) حُلّوں = حُلّہ کی جمع، جبّہ، بہشتی لباس، چادر، یمن کی پوشاک
(۱۷) مزّین = زینت دیا گیا، آراستہ
(۱۸) نِطاق = پٹکا، کمربند
(۱۹) سیمین = روپہلا/روپہلی، چاندی کا
(۲۰) وشاح = ایک شانہ پوش یا کمربند جو آرایش یا امتیاز کے لئے کاندھے پر ڈالا یا کمر کے گرد باندھا جاتا ہے
(۲۱) خِلاسی = وہ مرغا جس کے ماں باپ میں سے ایک ہندی اور ایک فارسی ہو
(۲۲) عُرف = گردن یا سر کے بال
(۲۳) کلغی = طاؤس یا دوسرے پرندوں کے سر کا تاج
(۲۴) وسمہ = نیم کے پتے جن سے خضاب تیار کیا جاتا ہے
(۲۵) صَیقل = جِلا، چمک
(۲۶) گل بابونہ = ایک بوٹی جس کے پھولوں کا تیل جوڑوں کے دردوں میں مفید ہوتا ہے
(۲۷) فوقیت = برتری
(۲۸) عُریان = برہنہ، ننگا
(۲۹) متواتر = لگاتار، مسلسل
(۳۰) ہئیت = صورت، شکل، حالت، بناوٹ
(۳۱) فراستوں = دانائی، عقلمندی، سمجھداری
(۳۲) استعدادیں = آمادگی، قابلیت، لیاقت
(۳۳) واصفین = وصف یا خوبیاں بیان کرنے والا
(۳۴) وصف = تعریف، خوبی، صفت، اچھی خاصیت، ہنر
(۳۵) اوہام = وہم کی جمع، محسوس چیزوں کے معنی کو پانے کی قوت
(۳۶) درک = پانا، معلوم کرنا
(۳۷) پیکر = کالبُد، تن، چہرہ، شکل

شَرْحُ الْاَخْبَار

شَرْحُ الْاَخْبَار جس کا پورا عنوان **شَرْحُ الْاَخْبَارِ فِی فَضَائِلِ الْاَئِمَّةِ الْاَطْهَار** ہے۔ **سیّدنا قاضی نُعمان بن محمّد بن منصور بن احمد بن حَیُّون التمِیمِی المغربی** کی نہایت اہم کتاب ہے۔ یہ کتاب سولہ اجزاء پر مشتمل ہے۔ اس کی تصحیح سید محمد حسینی جلالی نے کی ہے اور ۱۴۰۷ھ/۱۹۸۶ء میں قم، ایران میں تین جلدوں میں چھپ گئی ہے۔

کتاب کے مصنف سیدنا قاضی نعمان نے **مولانا ابو محمد عبداللہ المهدی باللہ، مولانا ابوالقاسم محمد القائم بامراللہ، مولانا ابو طاهر اسماعیل المنصور باللہ اور مولانا ابو تمیم مَعَدّ المعزّلِدینِ اللہ علیهم السلام** چار اماموں کی خدمت کی ہے۔ سیدنا قاضی نعمان کا وصال ۳۶۳ھ/۹۷۴ء میں ہوا اور مولانا معز علیہ السلام نے خود آپ کی نمازِ جنازہ پڑھائی۔ آپ نے دعوتِ حق یعنی اسماعیلی مذہب کے لئے عظیم خدمات انجام دیں۔ ان کی اہمیت کا اندازہ مولانا معز علیہ السلام کے اس مقدس ارشاد سے ہوتا ہے کہ **عیون الاخبار** کے مؤلف کے مطابق آپؑ نے فرمایا: ''**مَنْ یُؤَدِّی جُزْءً ا مِنْ مِائةِ مِمَّا أَدَّاهُ النُّعْمَانُ اَضْمَنُ لَهُ الْجَنَّةَ بِجوارِ رَبِّه**''۔ ''جو شخص نعمان نے جو خدمات انجام دی ہیں ان کا ایک فیصد بھی انجام دے تو مَیں اس کے لئے اپنے پروردگار کی ہمسائیگی میں جنت کی ضمانت دیتا ہوں۔'' سیّدنا قاضی نعمان نے دعوتِ حق پر اس کتاب کے علاوہ اور بہت سی کتابیں لکھی ہیں، ان میں سے چند ایک یہ ہیں: **دَعَائِمُ الْاِسْلَام، تَأوِیلُ الدَّعَائِم، اَسَاسُ التَّأوِیل، کِتَابُ الْهِمَّةِ فِی آدَابِ اَتْبَاعِ الْاَئِمَّة، اِفْتِتَاحُ الدَّعْوة و اِبْتِداءُ الدَّوْلة، اَلْمَجَالِسُ و الْمُسَایَرات، اَلْمَنَاقِب وَالْمَثَالِب، اِخْتِلَاف اصولِ المذاهب**، جن سے دعوتِ حق کے پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے۔

جہاں تک زیرِ نظر کتاب یعنی شرحُ الاخبار کا تعلق ہے، اس کے عنوان سے ظاہر ہے کہ اس کا مرکزی اور اساسی مضمون وہ اخبار یا احادیث ہیں جو آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ و سلم نے مولانا علیؑ، مولاتنا فاطمہؑ، اور ان کی نسلِ پاک سے دنیا میں آنیوالے پاک اماموں کی فضیلتوں اور کرامتوں کے

بارے میں فرمایا ہے۔ اس کتاب کی بڑی خوبی اَئمۂ طاہرین کی امامت کی حقانیت مثلاً مولانا علی علیہ السلام کا بابِ شہرِ علم ہونے، مؤوّلِ قرآن ہونے، آپ کی مماثلتِ ہارونی، ولایت، وصایت، خلافت، وزارت اور آپ کیساتھ حق کی معیّت، آپ کی اولادِ پاک میں امامت کی دائمیت سے متعلق اخبار یا احادیثِ نبوی کی یکجائی میں ہے۔ اس کے ساتھ نورٌ علیٰ نور ان احادیث کے اسباب و احوال اور پس منظر کو بیان فرمایا ہے۔ یہاں اخبار یا احادیث کی شرح کی مثال ایسی ہے جیسے مفسرین کے ہاں آیاتِ قرآنی کا شأنِ نزول یا اسبابِ نزول ہے، جس میں آیات کے نازل ہونے کے اسباب و احوال سے بحث کی جاتی ہے۔ اس کے ساتھ اس کتاب میں اَئمۂ اطہار کے بارے میں تاریخی واقعات اور خصوصیت کے ساتھ مولانا مہدی علیہ السلام اور قائمِ آلِ محمدؐ کے ظہور سے متعلق احادیث کا ذکر آیا ہے۔ کتاب کے آخری یعنی سولھویں جزء میں ''صفات شيعة امير المؤمنينؑ'' کے عنوان سے مؤمنینِ مخلصین کی صفات کا بیان آیا ہے۔ الغرض یہ کتاب امام شناسی اور قائم شناسی کے ساتھ مؤمن شناسی میں بھی بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ بلاشبہ اس کا مطالعہ مؤمنینِ بایقین کے لئے روحانی اور عقلانی روشنی کا ذریعہ ہے۔

مرکزِ علم و حکمت، لندن
فقیر حقیر
۲۰، جولائی ۲۰۱۲ء

قصّۂ موسیٰ میں ستّر رجال کے زلزلے کی گرفت میں آنے کی ایک مختصر صوفیانہ تفسیر

از ابنِ عربی

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ۔ ''وَاَخۡتَارَ مُوۡسٰی قَوۡمَہٗ سَبۡعِیۡنَ رَجُلًا لِّمِیۡقَاتِنَا فَلَمَّآ اَخَذَتۡھُمُ الرَّجۡفَۃُ... (۱۵۵:۷)۔

ترجمہ: ''اور موسیٰ نے اپنی قوم کے ستّر آدمیوں کو منتخب کیا تاکہ وہ (اس کے ساتھ) ہمارے مقرر کردہ وقت پر (کوہِ طور پر) حاضر ہوں۔ جب ان کو ایک زلزلے نے آ پکڑا......''

اس آیت میں جو ستّر رجال زلزلے کی گرفت میں آئے تھے، ان کے بارے میں ابنِ عربی کہتے ہیں کہ وہ بنی اسرائیل کے اشراف میں سے تھے اور راہِ سلوک پر چلنے کی اہلیت رکھتے تھے۔ یہاں ''رَجۡفَۃ'' سے مراد ظاہری پہاڑ کا زلزلہ نہیں بلکہ ''رَجۡفَۃُ جَبَلِ الۡبَدَن'' ہے یعنی ''کوہِ بدن کا زلزلہ'' ہے جو فناء کی غشی یا بیہوشی کی مبادیات میں سے ہے، جو اس وقت وقوع پذیر ہوتا ہے جب انوار کی شعائیں پرواز کرتی ہیں اور بدن کے رونگھٹے کھڑے ہونے کی وجہ سے تجلّیاتِ صفات کے ستاروں کا ظہور ہوتا ہے اور ان (تجلّیاتِ صفات) سے وہ (جسم) متأثر ہوتا اور لرزتا ہے۔ (تفسیرِ ابنِ عربی، جلدِ اول، ص ۴۵۳)۔

فقیر حقیر

مرکزِ علم و حکمت، لندن

۳، اکتوبر ۲۰۱۲

مولوئ معنوی حضرتِ جلال الدّین رومی (ر ح)

آپ کا اسمِ گرامی محمد اور لقب جلال الدّین تھا۔ آپ کے والدِ ماجد کا نام محمد بن حسین خطیبی تھا، لیکن بہاءالدین ولد کے نام سے زیادہ معروف تھے، جن کا اپنے زمانے کے مشہور علماء و صوفیاء میں شمار ہوتا تھا۔ مولانا رومی ۶۰۴ ہجری / ۱۲۰۷ عیسوی میں بلخ میں پیدا ہوئے اور ۶۷۲/۱۲۷۳ میں قونیہ میں آپ کا وصال ہؤا۔ تاریخ میں آیا ہے کہ آپ کے جنازے میں یہودیوں اور عیسائیوں نے بھی شرکت کی۔

آپ کے والدِ گرامی بادشاہِ وقت خوارزم شاہ کے ساتھ اَن بن ہونے کی وجہ سے ہجرت کرنے پر مجبور ہوگئے۔ لہٰذا حج کے بعد ایشیائے کوچک میں قونیہ کی طرف رُخ کیا۔ قونیہ میں بادشاہِ وقت علاء الدّین کیقُباد اور اس کے وزیر مُعین الدین پروانہ نے نہایت عزّت و احترام کے ساتھ ان کا استقبال کیا اور ان کو سلطان العلماء کا لقب دیا۔ اور جلد ہی وہ وعظ و نصیحت، درس و تدریس اور فتوٰی نویسی کے فرائض انجام دینے لگے۔ ۶۲۸/۱۲۳۱ میں ان کا انتقال ہؤا۔ مولانا رومی اپنے والد کے فرائض انجام دیتے رہے یہاں تک کہ ۶۴۲/۱۲۴۴ میں ایک عارفِ کامل حضرتِ شمس تبریزی (قس) سے ملاقات ہوئی اور اُن سے طریقت اور حقیقت کی تعلیم لینے لگے۔ ان کی معجزانہ صحبت کا اتنا گہرا اثر ہؤا کہ آپ نے وعظ و نصیحت، درس و تدریس اور فتوٰی نویسی کا کام چھوڑ دیا اور ہمہ وقت ان کی صحبت میں رہنے لگے۔

کہتے ہیں کہ ایک دو سال کے بعد حضرتِ شمس تبریزی قونیہ سے چلے گئے، لیکن مولانا رومی نے نہایت منّت و سماجت کرکے اُن کو واپس لایا۔ حضرتِ شمس تبریزی ۶۴۵/۱۲۴۷ تک قونیہ میں رہے اور پھر دوبارہ غائب ہوگئے، اور اس کے بعد پھر کسی نے اُن کو نہیں دیکھا۔ اس سے مولانا رومی کو بہت دُکھ ہؤا۔ آپ کو اپنے استاد سے والہانہ عقیدت و محبت تھی اور بقیہ زندگی ان کی یاد اور مدح سرائی میں گزاری۔

مولانا رومی خود سے فنا اور استادِ معظم میں زندہ ہوگئے تھے، اس لئے آپ اپنی نظموں میں اپنے تخلص کی جگہ حضرتِ شمس کا ذکر کرتے ہیں، جس کی وجہ سے آپ کی کُلّیات ''کُلّیاتِ شمس تبریزی'' کے نام سے مشہور ہوگئی ہے۔ آپ کا منظوم کلام دو ضخیم کتابوں کو صورت میں یعنی ''کلیاتِ شمس

تبریزی'' اور ''مثنوی'' کے نام سے سامنے آیا ہے، جس سے عاشقانِ الٰہی اور جویندگانِ حکمت و معرفت آج تک مستفید و مستنیر ہو رہے ہیں۔

مثنوی اور کُلّیات کے اشعار کے حساب میں کچھ تفاوت پایا جاتا ہے۔ ایک حساب کے لحاظ سے کُلّیات کے کُلّ اشعار ۴۷۴۹۷ اور مثنوی کے ۲۵۶۳۱ ہیں۔ میرے پاس جو نسخہ ہے اُس کے لحاظ سے کُلّیات کے اشعار ۴۲۰۰۰ اور مثنوی کے ۲۵۶۵۰ ہیں۔ کُلّیات کے اشعار میں الگ الگ اصنافِ سخن مثلاً غزلیات، قصائد، مقطعات، ملمعات، ترجیعات اور رباعیات شامل ہیں۔

حضرتِ شمس تبریزی اسماعیلی بزرگانِ دین میں سے تھے، ان کی تعلیمات کا اثر مولانا رومی کی تعلیمات پر کتنا گہرا ہے اس کا اندازہ حضرت مولانا امام سلطان محمد شاہ، علیہ الصلواۃ و السلام، کے اس مبارک فرمان سے ہوتا ہے:

> *''مولامی کی کتابیں دیوانِ شمس تبریزی اور مثنوی پڑھیں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ دوسرے ملکوں میں آپ کا مذہب کس طرح چلتا ہے۔ آپ کا مذہب ہر ایک ملک میں ہے۔''*

چنانچہ استادِ بزرگوار کی نظر میں مولانا رومی دنیائے اسلام کے صوفئ اعظم ہیں، آپ فرماتے ہیں کہ *''اس بابرکت پیری اور مریدی نے دنیا والوں کو عام طور پر اور اہلِ تصوف کو خاص طور پر بہت کچھ سکھایا اور بہت کچھ عطا کیا ہے۔''* (گلشنِ خودی، صفحہ ب)۔ چنانچہ بزرگوار نے ان تعلیمات کی اہمیت کے پیشِ نظر دو کتابیں ''گلشنِ خودی'' اور ''گلدستہ ای از گلزارِ مولویٔ معنوی'' کے نام سے لکھی ہیں۔ جن میں مولانا رومی کے اشعار کی عرفانی شرح لکھی ہے جو کُلّیات کے سمجھنے میں کلید کی حیثیت رکھتی ہیں۔ پہلی کتاب میں ۲۵ رباعیات کی شرح ہے جس میں ہر رباعی کو ایک پُرحکمت عنوان دیا گیا ہے، اور دوسری کتاب میں بھی ایسے ہی عناوین کے تحت غزلیات و قصائد کی شرح کی گئی ہے۔ اَلْحَمْدُلِلّٰہِ عَلٰی مَنِّہٖ وَ اِحْسَانِہٖ۔

فقیر حقیر

مرکزِ علم و حکمت، لندن

۱۸، اکتوبر ۲۰۱۲ء

موسیقی اور رقص – حضرتِ داؤد علیہ السّلام

ہمیں اس بات کا علم ہے کہ قرآنِ حکیم نے قطعی طور پر رقص اور موسیقی کو ممنوع قرار نہیں دیا ہے، اور فی الواقع تاریخ میں اس بات کا بہت کچھ ثبوت ملتا ہے کہ موسیقی اور رقص عبادت کے نہایت اہم طریقے تھے۔ اس سلسلے میں بہترین حوالہ حضرتِ داؤد علیہ السلام کی زندگی ہے۔ آپ کی زندگی کے اس پہلو کے بارے میں جو حوالہ جات کتابِ مقدس میں ہیں وہ قرآنِ حکیم (میں جو حوالے ہیں ان) سے زیادہ واضح ہیں۔ عہدِ عتیق میں اس سلسلے میں بہترین مثالیں کتابِ زبور اور کتابِ سموئیل ہیں: ذیل میں ان کتابوں سے چند مثالیں دی جاتی ہیں جس سے اس مضمون پر روشنی پڑے گی:

(۱) دوم سموئیل ۶:۵:

داؤد اور تمام اسرائیلی خداوند کے سامنے ناچ رہے تھے اور تمام موسیقی کے آلات بجا رہے تھے۔ وہاں پر وہ بینا، ستار، ڈھول، شہنائی، جو قبرص کی لکڑی سے بنے ہوئے تھے، اور منجیرا بجا رہے تھے۔

(۲) دوم سموئیل ۶:۱۵:

داؤد اور تمام اسرائیلی مطمئن تھے، وہ گاتے اور سنکھ پھونکتے ہوئے خداوند کے مقدّس صندوق کو شہر لا رہے تھے۔

(۳) دوم سموئیل ۶:۱۴:

داؤد خداوند کے سامنے اپنی پوری طاقت سے ناچ رہا تھا۔

(۴) دوم سموئیل ۲۱:۱۱:

اکیس کے افسروں نے یہ پسند نہیں کیا۔ انہوں نے کہا: ”یہ داؤد ہے اسرائیل کی

سرزمین کا بادشاہ، یہ وہ آدمی ہے جس کے گیت اسرائیل گاتے ہیں۔ وہ ناچتے ہیں اور یہ گانا گاتے ہیں: ساؤل نے ہزاروں کو مار ڈالا، لیکن داؤد نے لاکھوں کو مار ڈالا۔"

(۵) اوّل تواریخ ۲۹:۱۵:

جب معاہدہ کا صندوق شہرِ داؤد میں پہنچا تو ساؤل کی بیٹی میکل نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ اُس نے بادشاہ داؤد کو ناچتے اور جشن مناتے ہوئے دیکھا اور اُس نے اس کے تئیں میں اپنی ساری عزّت و احترام کو کھو دیا۔

(۶) زبور ۱۴۹:۱-۵:

خداوند کی حمد کرو۔ اُن نئی چیزوں کے بارے میں جن کو خدا نے (پیدا) کیا ہے۔
ایک نیا گیت گاؤ۔
اور مقدس لوگوں کے مجمع میں اُس کی ستائش کرو۔
خداوند نے اسرائیل کو بنایا۔ خداوند کے ساتھ اسرائیل شادمان رہے۔ فرزندانِ صیّون اپنے بادشاہ کے ساتھ میں خوشی منائیں۔
وہ ناچتے ہوئے اُس کے نام کی ستائش کریں، وہ دف اور بربط پر اُس کی مدح سرائی کریں۔
خداوند اپنے لوگوں سے مسرور ہے۔ خدا نے ایک حیرت انگیز کام اپنے خاکسار لوگوں کے لئے کیا، اُس نے ان کو نجات دی۔
خدا کے وفادار پیروکار! تم اپنی فتح مناؤ! یہاں تک کہ تم بستر پر جانے کے بعد بھی مسرور رہو۔

(۷) زبور ۱۵۰:۱-۲:

خداوند کی حمد کرو۔خدا کی تعریف اس کی ہیکل میں کرو۔ اُس کی خدائیت کی

تعریف بہشت میں کرو۔
اُس کی اور اس کی خدائیت کی تعریف کرو۔ اُس کی تمام عظمت کے لئے اُس کی تعریف کرو۔
نرسنگے اور بگل کی آواز کے ساتھ اُس کی حمد کرو۔ بربط اور ستار پر اس کی حمد کرو۔
خداوند کی مدح سرائی دف اور رقص سے کرو۔ تاردار سازوں اور بانسری کے ساتھ اُس کی حمد کرو۔
بلند آواز جھانجھ کے ساتھ اُس کی حمد کرو۔ زور سے جھنجھناتی جھانجھ کے ساتھ اُس کی حمد کرو۔
ہر ایک جاندار خداوند کی حمد کرے! خدا کی حمد کرو!

<u>(۸) زبور ۶۸:۲۵:</u>

آگے آگے گانے والے چلتے ہیں، پیچھے پیچھے بجانے والے آ رہے ہیں۔ جن کے گرد دف بجانے والی جوان لڑکیاں ہیں۔

(ترجمہ از بائبل لیگ انٹرنیشنل)

حضرتِ داؤد علیہ السلام، جو کتابِ مقدس میں داؤد بادشاہ کے نام سے مشہور ہے، جس طرح نغمات اور رقص کو استعمال کرتے تھے، کچھ یہودی آج تک اس پر عمل کرتے رہے ہیں اور یہ داؤدی عبادت کے نام سے مشہور ہے۔

عیسائیوں میں بھی ایک خاص گروہ ہے جو ''شیکرز'' (Shakers) کے نام سے مشہور ہے جو رقص کو بندگی کے ایک بنیادی حصے کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔

قرآنِ کریم میں براہِ راست حضرتِ داؤد علیہ السلام کے رقص اور موسیقی کا ذکر نہیں لیکن ایسے حوالے ہیں جن میں پہاڑوں اور پرندوں کا آپؑ کے ساتھ رَبُّ العزّت کی تسبیح خوانی کرنے

کا ذکر آیا ہے جن سے یہ نتیجہ آسانی سے اخذ کیا جا سکتا ہے۔ **الغرض** کتابِ مقدس اور قرآنِ حکیم میں حضرتِ داؤد علیہ السلام کا جو قصہ آیا ہے اس سے یہ یقینی طور پر ثابت ہوتا ہے کہ موسیقی اور رقص کو حقیقی عبادت کے ذرائع کے طور پر استعمال کئے جاتے تھے اور کئے جا سکتے ہیں۔ **اَلْحَمْدُللهِ عَلٰی مَنِّہٖ وَاِحْسَانِہٖ**۔

تحریر: ظہیر لالانی

ترجمہ: فقیر ہونزئی

مرکزِ علم و حکمت، لندن

۲۸، نومبر ۲۰۱۲ء

حدودِ دین اور دورِ قیامت

قرآنِ حکیم میں آیۂ فطرت (۳۰:۳۰) سے ظاہر ہے کہ خدا کا دین یعنی دعوتِ حق اس کی فطرت ہے اور اسی فطرت کی بنیاد پر انسان کو بنایا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوُا کہ دینِ خدا کو سمجھنے کے لئے انسانی فطرت کا جاننا ضروری ہے۔ انسانی فطرت کے بارے میں حضرتِ مولانا امام سلطان محمد شاہ علیہ الصلواۃ و السلام فرماتے ہیں:

"*Our religion is like that of a man who gets photographed every ten years. Each time the image is different but the man is the same. He will not look the same at ninety as he looked at ten. Similarly the fundamental principle of our religion remains the same but outer form changes*." (A Tract on Ginan Party, 29-11-1955, P-C15).

ترجمہ: ہمارا دین ایک ایسے شخص کی طرح ہے جو ہر دس سال فوٹو کھچواتا ہے، ہر دفعہ [اس کی] صورت بدل جاتی ہے، لیکن شخص وہی رہتا ہے۔ نوّے سال کی عمر میں وہ وہی دکھائی نہیں دے گا جو دس سال کی عمر میں دکھائی دیتا تھا۔ اسی طرح ہمارے دین کا بنیادی اصول وہی رہتا ہے لیکن اس کی بیرونی صورت بدلتی رہتی ہے۔

چنانچہ اسی بنیاد پر دینِ حق میں تدریجی تعلیم کا تصور ہے۔ شریعت اور حقیقت، دورِ ستر اور دورِ کشف، شریعتِ وضعی اور شریعتِ عقلی، یہ تمام اصطلاحات اسی تدریجی تعلیم کی حقیقت کو سمجھانے کے لئے بنائی گئی ہیں، اور اسی تدریجی تعلیم کے لئے حدودِ دین کا نظام ہے۔ چنانچہ حدودِ دین کا مرکز اپنے اپنے دور اور زمانے کے لحاظ سے ناطق، اساس، امام اور قائم القیامت علینا منہم السلام ہیں اور باقی حدود

ان کے فرمان کے مطابق دعوت کا کام کرتے ہیں۔

حدودِ دین کے نظام کو سمجھانے کے لئے ایک تمثیل سورج، چاند اور ستاروں سے دی گئی ہے۔ اس میں سورج کا ممثول ناطق یا اساس یا امام یا قائم ہے، علینا منہم السلام۔ چاند کا ممثول باب یا حجتِ اعظم، اور ستاروں کے ممثولات باقی حدود حُجَّج (واحد: حجت) اور دعاۃ (واحد: داعی) وغیرہ ہیں۔

اس تمثیل میں بدیہی بات یہ ہے کہ جب سورج سے براہِ راست روشنی حاصل ہوتی ہے تو اس وقت نہ چاند کی روشنی کی ضرورت ہوتی ہے اور نہ ستاروں کی۔ حالانکہ چاند اور ستارے اپنی اپنی جگہ پر موجود ہیں، لیکن سورج کی زبردست تابانی و درخشانی میں ان کی روشنی مدغم ہو جاتی ہے، اور وہ خود ناقابلِ دید ہو جاتے ہیں۔

اس حقیقت کا دورِ ستر کے بزرگوں نے بھی اپنی کتابوں میں جابجا صراحتاً یا اشارتاً ذکر فرمایا ہے۔ چنانچہ پیر ناصر خسرو (قس) کتابِ ''وجہ دین'' میں نمازِ وِتر کی تاؤیل کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''نمازِ خفتن کے بعد وِتر پڑھی جاتی ہے، اور وِتر قائمِ قیامت علیہ افضل التحیۃ و السلام پر دلیل ہے، اور یہ نماز دن رات کی تمام نمازوں کے بعد پڑھی جاتی ہے، جس کی تاویل یہ ہے کہ لوگ قیامت کے دن اُن تمام حدود سے یکسو ہو جائیں گے جو عالمِ جسمانی میں ہیں، سوائے صاحبِ قیامت کے شرف کے۔ اور قیامت کے دن مومنوں کو (اسی دنیا ہی سے شروع کرکے) عزت و بزرگی ملے گی اور کافروں پر تاوان ہوگا (عذاب اُترے گا)۔'' (وجہِ دین، کلام ۲۰، ص ۲۰۹)۔

یہاں پر مزید وضاحت کے لئے استادِ بزرگوار (دامت فیاضاتہ) کی کتاب ''سلسلۂ نورِ امامت'' سے ایک طویل اقتباس پیش کیا جاتا ہے۔ کتابِ ہٰذا میں حدودِ دین کی تفصیلی وضاحت کے بعد استادِ بزرگوار ''حدود ایک وقت معین تک ہیں'' کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں:

''طالبِ حقیقت کو نہایت ہی ضروری ہے کہ وہ حدودِ دین کے بارے میں پوری علمیت حاصل کرے کہ حدود کس ضرورت کے لئے ہیں۔ کیا وہ ہمیشہ کے لئے ہیں؟ یا ان کی

برخاستگی کا کوئی وقت ہے؟

مَیں اس موقع پر حدود کی ایک حقیقی تفصیل پیش کرتا ہوں جو آفاق و انفس کی نشانیوں کی دلیلوں پر مبنی ہوگی۔ اس لئے کہ جس بات کی دلیل یا گواہی آفاق و انفس سے نہیں مل سکتی وہ محض جھوٹ ہوتی ہے۔

چنانچہ حضرتِ رسول اکرم صلعم کی حدیث ہے کہ: اِنَّ اللّٰہَ اَسَّسَ دِیْنَہٗ عَلٰی مِثَالِ خَلْقِہٖ لِیُسْتَدَلَّ بِخَلْقِہٖ عَلٰی دِیْنِہٖ وَ بِدِیْنِہٖ عَلٰی وَحْدَانِیَّتِہٖ۔ ترجمہ: اللہ نے اپنے دین کی بنیاد اپنی مخلوقات کی مانند رکھی تاکہ اس کی مخلوقات ہی سے اس کے دین کی دلیل مل سکے اور اس کے دین سے اس کی یگانگی کی دلیل مل سکے۔ اس حدیث میں تینوں عالم کا ذکر ہے اور بتایا گیا ہے کہ تینوں عالم ایک دوسرے کی مثال ہیں: یعنی عالمِ خلق، عالمِ دین، اور عالمِ وحدت۔

اور یہی حقیقت سمجھانے کے لئے کہ جب تک آفاق و انفس کسی قول کی سچائی پر گواہی نہ دیں تو وہ قول ہرگز درست نہیں ہو سکتا۔ قرآنِ شریف کی آیت ملاحظہ ہو: مَآ اَشْهَدْتُّهُمْ خَلْقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَا خَلْقَ اَنْفُسِهِمْ ط(۱۸:۵۱)۔ ترجمہ: ہم نے ان کے لئے آسمانوں اور زمین کی آفرینش سے گواہی نہیں دی اور نہ اُن کی جانوں کی آفرینش سے۔ پھر عقل والوں کو لازم ہے کہ دین سے متعلقہ جو بات ہو اسے ظاہر کرنے سے پہلے اس کائناتی شہادت سے محکم کریں۔

چنانچہ ہم یہ کہتے ہیں کہ امامِ زمان عالمِ دین میں ہمیشہ حاضر اور دائم فیضِ روحانی بخشتا ہے تو یہ بات صحیح ہے، کیونکہ دنیا میں بھی ایک ایسی چیز ہے جو ہمیشہ سے دنیا میں موجود ہے اور روشنی بخشتی رہتی ہے وہ سورج ہے۔ امامِ زمان اس دنیاوی سورج کا ممثول ہے اور سورج امامِ زمان کی مثال ہے، لیکن معلوم ہو کہ مثال اور ممثول میں فرق ہوتا ہے۔ پھر اس کے بعد سورج کی جملہ صفات اور افعال سے امامِ زمان کی قریبی مثال لی،

یعنی سورج جب ہم سے دُور ہوتا ہے اُس وقت تاریکی ہونی شروع ہوتی ہے، پھر سورج کی طرف سے ہمیں چاند روشنی دیتا ہے اور اگر یہ بھی ہم سے دُور ہو یا اس کا رُخ ہماری طرف نہ ہو تو ہمیں تاروں سے روشنی ملتی ہے۔ پھر بعض اوقات بادل کی وجہ سے تاریکی ہی رہتی ہے۔ اور جب سورج نکلے تو ہمیں چاند روشنی نہیں دے سکتا ہے، مگر وہ ہمیشہ اپنے لئے نور حاصل کرتا ہے۔ اسی طرح تارے بھی سورج نکلنے پر ہمیں نظر نہیں آتے۔ چاند اور تاروں میں اپنے لئے روشنی ضرور موجود رہتی ہے، کیونکہ ان کے اور سورج کے درمیان کوئی شے حائل نہیں ہوتی ہے، اس لئے کہ وہ زمین سے بہت اونچائی پر ہے۔

صفحۂ کائنات کی مذکورہ شہادت سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ جب زمانہ والوں کی روحانی رسائی امام تک نہ ہو تو اُس وقت امام کی طرف سے حدود مقرر ہوتے ہیں، ......۔ حدودِ سفلی میں سے حجتِ اعظم جو چاند کے مقابلے میں ہے اور دوسرے حجت اور داعی ماذون تک تاروں کے مقابلے میں ہیں، عالمِ دین کو علمِ دین سے روشنی دیتے ہیں۔ اور جب امامِ زمان دینی لحاظ سے لوگوں کے نزدیک ہو جائے تو حدودِ سفلی کی پہچان باقی نہیں رہتی۔ ہاں جس طرح ستارے دن کے وقت نیست و نابود نہیں ہوتے لیکن ہمیں ان سے ظاہری طور پر کوئی روشنی لینے کی ضرورت نہیں ہوتی ہے۔ اسی طرح حدود بھی تو ہر وقت موجود ہیں اور اپنی ذات کے لئے روشن بھی ہیں۔

حجت کی مثال بھی اسی طرح ہے جس طرح دن کے وقت چاند کی۔ قولہٗ تعالیٰ: وَاِذَا النُّجُوۡمُ انۡکَدَرَتۡ (۸۱:۲)۔ یعنی جب ستارے دیکھنے میں غیر شفاف ہوں۔ وَخَسَفَ الۡقَمَرُ (۷۵:۸)۔ اور چاند گہہ جائے۔ وَجُمِعَ الشَّمۡسُ وَالۡقَمَرُ (۷۵:۹)۔ اور جس وقت سورج اور چاند ایک ہو جائیں۔

یہی علامت حدودِ ظاہری کے اشخاص نہ دکھائی دینے کی ہے، یعنی روزِ قیامت کے قریب ہونے پر امام کے سوا باقی تمام جسمانی حدود ظاہراً نہ دکھائی دیں گے اور حجت امام

کے ساتھ ایک ہوگا۔

یہاں پر یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ حدودِ علوی و سفلی کے بارے میں علم حاصل کرنا نہایت ضروری ہے کیونکہ علمِ تاویل جو مومن کی روح کے حق میں باعثِ عروج ہے علمِ حدود کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا ہے۔ ...... اس لئے اگرچہ امامِ زمان کے علاوہ ظاہراً کوئی حدودِ سفلی نہ بھی ہو، لیکن پھر بھی علمِ حدود ضروری ہے تاکہ حدود شناسی کے بعد خدا شناسی حاصل ہو سکے۔

ے حدود دان چه نباشی خدای دان نشوی

سورج نکلنے کے بعد اگرچہ چاند اور تاروں سے ہمیں کوئی روشنی نہیں آتی ہے لیکن چاند اور تاروں سے متعلق علم ضرور ہمارے ذہن میں موجود ہوتا ہے اور ہونا چاہیئے۔" (سلسلۂ نورِ امامت، صص ۱۰۳-۱۰۸)۔

اب جہاں تک ہمارا زمانہ دَورِ قیامت ہونے کا تعلق ہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ اشراطِ قیامت میں سے بیشتر اس زمانے میں ظہور پذیر ہو چکے ہیں۔ ان میں ایک اہم شرط سورج اور چاند کا ایک ہو جانا ہے، جس کے معنی تأویلی زبان میں امام اور حُجت کا ایک ہونا ہے۔ اس سلسلے میں حضرتِ مولانا امام سلطان محمد شاہ، صلوات اللہ علیہ کے فرامینِ مبارک کو دیکھنے سے واضح ہو جاتا ہے کہ یہ اہم ترین شرط آپ کے دَورِ مبارک ہی میں پوری ہو چکی ہے۔ جیسا کہ امامِ عالیمقام فرماتے ہیں:

"In our family the Imamat usually has been given to a Pir as a successor and at present there is no independent Pir, I myself holding this position." (Mubarak Ta'liqat and Messages, Mombasa, 1955, P-32).

ترجمہ: ہمارے خاندان میں امامت عموماً جانشین کے طور پر ایک پیر کو دی گئی ہے اور اس وقت یہ منصب [بھی] میرے پاس ہے۔ [اس لئے] کوئی الگ پیر نہیں ہے۔

استادِ بزرگوار اس فرمانِ مقدس کی وضاحت کرتے ہوئے اپنی کتاب ''شہدِ بہشت'' میں حدودِ دین کی وضاحت کے بعد لکھتے ہیں:

''واضح رہے کہ حدودِ دین کا مذکورہ نظام حضرت امام آقا سلطان محمد شاہ صلوات اللہ علیہ کے زمانے سے اُٹھایا گیا ہے اور حدودِ دین کے یہ دَرَجات صرف اُس زمانے میں مقرر ہوتے ہیں جس زمانے میں امامِ زمان علیہ السلام خود مرتبۂ حُجت یعنی پیری کے مرتبہ کو اپنے پاس نہیں رکھتے۔ چونکہ حضرتِ امام آقا سلطان محمد شاہ صلوات اللہ علیہ کے دَورِ مقدس سے مرتبۂ حُجت یعنی پیری کا مرتبہ بھی خود امام علیہ السلام ہی کے پاس ہے، اس لئے حدودِ دین کا یہ نظام اس زمانے میں اسماعیلی دعوت میں نہیں پایا جاتا اور جماعتی ادارے جو خدمت انجام دیتے ہیں اور جو درجے ان اداروں میں پائے جاتے ہیں وہ صرف ظاہری اور انتظامی امور کے لحاظ سے ہیں۔ (شہدِ بہشت، ص ۱۸۸)۔

ساتھ ساتھ یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ حدودِ دین کی اس وقت ضرورت باقی نہ رہنے کے یہ معنی نہیں کہ اب علم کے مراتب نہیں۔ علم کے مراتب اب بھی ہیں۔ یہ یقینی بات ہے کہ **تَعْلِیم** اور **تَعَلُّم** یعنی سکھانے اور سیکھنے کا سلسلہ اب بھی جاری ہے۔ اور اس میں سکھانے والے کا مرتبہ سیکھنے والے سے بلند تر ہے اور وہ تعظیم و احترام کا سزاوار ہے۔ اس کے مقابلے میں سیکھنے والے کا درجہ سکھانے والے کے نیچے ہے اور وہ شفقت و محبت کا مستحق ہے۔ اب دَورِ قیامت میں یہ کام نہایت شکرگزاری کے ساتھ کمالِ تندہی اور مستعدی کے ساتھ کرنا ہے۔ اس لئے کہ دَورِ قیامت کی برکتوں سے اب علمی قحط دُور ہو گیا ہے اور علم کے حصول اور اشاعت کے تمام تر عقلانی، روحانی اور جسمانی وسائل میسر ہوگئے ہیں۔ خیال کیجئے کہ استادِ بزرگوار (دامت فیوضاتہ) جس وقت ایک مقالہ یا نظم کو مکمل کرتے ہیں اُسی وقت وہ مقالہ یا نظم پوری دنیا کے کونے کونے پہنچ جاتی ہے۔ یا کوئی علم بیانی فرماتے ہیں تو چار دانگِ عالم میں سُنی جاتی ہے۔ گویا حقیقی معنوں میں اب اکمالِ دین اور اتمامِ نعمت کا کام حدِّ قوت سے حدِّ فعل تک پہنچ چکا ہے۔ الغرض علمی مراتب اب بھی قائم ہیں۔ ''**سَابِقُوْا**'' اور ''**سَارِعُوْا**'' کا

فرمان اب بھی جاری ہے۔ فرق اتنا ہے کہ دَورِ ستر میں حدودِ بالا (اوپر کے حدود) اور حدودِ پائین (نیچے کے حدود) کے مابین عہد و میثاق کے بغیر کسی کو نہ سکھانے کی اجازت تھی اور نہ سیکھنے کی۔ لیکن اب دَورِ قیامت میں یہ شرط باقی نہیں رہی ہے بلکہ عہد و پیمان کی شرط کے بغیر دعوتِ حق سے وابستہ نفوس دیوِ جہالت کو مغلوب کرنے، نورِ علم سے دنیا کو روشن کرنے اور بنی آدم کو اُمتِ واحدہ بنانے کے لئے حسبِ مراتب ایکدوسرے سے سیکھ اور ایکدوسرے کو سکھا سکتے ہیں، اَلْحَمْدُلِلّٰہِ عَلٰی مَنِّہٖ وَاِحْسَانِہٖ۔ حضرتِ علی اللہ ہم سب کو توفیق اور عالی ہمتی عطا فرمائے! آمین! یاربّ العالمین!!

فقیر حقیر

مرکزِ علم و حکمت، لندن

۲۱، فروری ۲۰۱۳ء

انسان کی اِنائے سفلی کا عُرُوج و نُزُول

انائے سفلی اور انائے علوی استادِ گرامی کے علمِ قیامت کی اصطلاحات میں سے ہیں جو اس سے پہلے دعوت کی کسی کتاب میں نہیں پائی جاتی ہیں۔ اَلْحَمْدُلِلّٰہ آج آفاق و انفس میں خداوندی آیات کے دکھانے اور زمینِ دعوت سے پوشیدہ اَسرار کے ظاہر ہونے کا وقت ہے، یعنی قیامت کا دور ہے۔ اور قیامت بھی ہزار سال یا سات ہزار سال بعد کی نہیں بلکہ پچاس ہزار سال بعد کی قیامت ہے، جس کے بارے میں استادِ بزرگوار فرماتے ہیں: ''یہ ہفت ادوار......ہونے لگے گا۔''[1] مزید فرماتے ہیں: ''پچاس ہزار سالہ قیامت میں البتہ سب لوگ جسمِ لطیف میں منتقل ہو جاتے ہیں۔''

ان اصطلاحات کی اہمیت کا اندازہ کرنے کے لئے اس حقیقت کا جاننا ضروری ہے کہ اس بابرکت دور میں خود استادِ بزرگوار پر دین کے مختارِ برتر نے تأویل و تائید کے کیسے عظیم خزانوں کے ابواب کھول دیئے ہیں۔ چنانچہ بزرگوار قیامتی حقائق سے مملو اپنی کتاب میزان الحقائق میں یو۔ایف۔اوز کے راز کو فاش کرنے سے پہلے لکھتے ہیں: ''اس غیبی مخلوق......خاموشی اختیار کرے۔''

اس اقتباس کے ذکر کا مقصد یہ ہے کہ ایک تو یو۔ایف۔اوز کا مضمون اس مضمون سے مربوط ہے۔ دوسرا یہ کہ جو حضرات ان کتابوں کو پڑھیں تو اس یقینِ کامل کے ساتھ پڑھیں کہ ان کتابوں میں جن حقائق کا ذکر آیا ہے وہ سب کے سب دین کے مختارِ برتر یعنی زمانے کے ہادیٔ برحق کی مرضی اور اجازت سے لکھے گئے ہیں، تاکہ پڑھنے والوں کو اس مقدس علم سے کما حقہٗ فائدہ حاصل ہو۔

چنانچہ انسان کی انائے سفلی کے عروج و نزول کا مضمون پورے قرآن میں پھیلا ہوا ہے، لیکن نہایت واضح الفاظ میں اس کا ذکر سورۂ تین (۹۵:۱-۸) میں آیا ہے۔ نیز مذکورہ سورہ کے مضمون کو اچھی طرح سمجھنے کے لئے اس سے متعلق ایک اور آیت ''لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ'' (۸۴:۱۹)، یعنی تمہیں ایک

طبق سے دوسرے طبق چڑھا دیا جائے گا، یا تمہیں ایک حال سے دوسرے حال میں بدل دیا جائے گا، کی تأویل، جو استادِ بزرگوار نے کی ہے، سمجھنے کی ضرورت ہے۔ چنانچہ بزرگوار فرماتے ہیں کہ بادشاہِ مطلق اس آیت میں نہ صرف عالمِ بالا اور عالمِ پائین کے انسانوں سے فرماتا ہے کہ تم نیچے آؤ اور یہ اوپر جائے، بلکہ تمام سیّاروں بلکہ جملۂ کائنات کے عروج و نزول کا فرمان بھی نافذ کرتا ہے۔ کیونکہ اس کے متحدہ ملک (عالم) میں جزو و کُلّ کے لئے ایک ہی قانون ہے۔ اگر یہ حقیقت مان لی جائے کہ اس فعلِ خدا کا اطلاق نوری اور خاکی دونوں قسم کے انسانوں پر واقع ہو چکا ہے، تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ نوری انسان کو موجودہ حالت کے برعکس اعلیٰ عِلِّیّین سے اسفل سافلین میں لایا گیا تھا اور خاکی انسان کو موجودہ حالت کے برعکس اسفل سافلین سے اعلی عِـلِّیّیـن پہنچایا گیا تھا۔ کیونکہ ان دونوں میں سے کسی ایک کو تقدّمِ زمانی کا فضل ثابت نہیں۔ ان دونوں پر احسنِ تقویم سے پیدا کرنے اور اسفل سافلین واپس بُلانے کا فعل بلا امتیاز ختم ہو چکا ہے۔

انائے سفلی کے اس دائمی عروج و نزول کی حکمت کے سلسلے میں استادِ گرامی مزید فرماتے ہیں کہ قانونِ فطرت یا ارادۂ قدرت ایسا ہے کہ ہر چیز کا ارتقاء حدِّ کمال کے بعد رُو بزوال ہو جائے اور ہر زوال از سرِ نو رُو بکمال ہو جائے۔ اس کی مثال خدا کا وہی قانون یا عادت ہے جو ہرگز نہیں بدلتی، یعنی وہ ہر چیز کو اس کی ضد سے پیدا کرتا ہے، جیسے زندگی اور موت، شب و روز وغیرہ۔ اور یہ دونوں ضدّ اپنی اپنی جگہ پر ضروری ہیں۔ مثلاً عقلِ سلیم کے نزدیک دنیا بھی اتنی ضروری ہے جتنی آخرت، کیونکہ دنیا ہی تو آخرت کی کشت گاہ ہے، جیسا کہ پیغمبرؐ نے فرمایا ہے: ''اَلـدُّنْیَا مَزْرَعَةُ الْاٰخِرَةِ۔'' اس لئے کہ نہ دنیا کلیۃً شرّ ہے اور نہ آخرت کلیۃً خیر۔ جس طرح دنیا میں بھلائی اور بُرائی دونوں ہیں، اسی طرح آخرت میں ثواب و عقاب دونوں ہیں۔ دنیا کی بھلائی و بُرائی اور آخرت کے ثواب و عقاب کا انحصار انسان کے اپنے اعمال پر ہے۔

الغرض انائے سفلی کے اس عروجی و نزولی سفر کے دو انتہائی مقام ہیں۔ جو بلندی کی انتہا پر ہے اُسے عِـلِّیّیـن، حظیرۂ قدس، حقیقتِ واحدہ (monoreality)، روحِ مستقر، انائے علوی وغیرہ کہا جاتا ہے۔

اور جو انتہائی پستی پر ہے اُسے اسفل سافلین، سجّین وغیرہ کہا جاتا ہے۔ استادِ گرامی انائے علوی اور انائے سفلی کے درمیان جو فرق ہے اُس کے بارے میں فرماتے ہیں کہ انائے علوی سورج کی طرح ہمیشہ ایک حال پر قائم ہے، اس کے اندر کوئی فرق و تفاوت نہیں، اس میں مساوات ہی مساوات ہے۔ اسی کے بارے میں رَبُّ العزت نے فرمایا ہے: ''**مَاتَرٰی فِیۡ خَلۡقِ الرَّحۡمٰنِ مِنۡ تَفٰوُتٍ** ط''(۶۷:۳)، یعنی تمہیں رحمان کی آفرینش (انائے علوی) ایک جیسی نظر آتی ہے۔ اس کے مقابلے میں انائے سفلی چاند کی طرح گھٹتے بڑھتے بار بار دنیا میں آتی رہتی ہے۔ اور جیسے مساوات کا تعلق انائے علوی سے ہے درجات کا تعلق انائے سفلی سے ہے۔

اب ان حقائق کو سامنے رکھتے ہوئے واپس سورۂ تین کی طرف آتے ہیں۔ سورۂ تین کا مضمون نہایت ہی اہم ہے۔ یہ انسان کی ازلی و ابدی حقیقت کا مضمون ہے۔ اگر کسی کو اپنی اس حقیقت کی کما حقہٗ شناخت ہو جائے تو اُس کو معلوم ہو جائے گا کہ وہ حضرتِ ربُّ العزت کا مثل پہلے سے ہے۔ اس کے برعکس حصولِ معرفت میں کوتاہی یا غفلت ہوئی تو اپنے بلند مقام سے گر کر ''**اُولٰٓئِکَ کَالۡاَنۡعَامِ بَلۡ ہُمۡ اَضَلُّ** ط'' (۷:۱۷۹)، یعنی وہ چوپایوں کی طرح ہیں بلکہ اُن سے زیادہ گئے گزرے ہوئے ہیں، کے زُمرے میں شامل ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ حضرتِ مولانا امام سلطان محمد شاہ، علیہ الصلواۃ و السلام، نے فرمایا ہے کہ انسان کا درجہ بہت بلند ہے لیکن اُس نے اپنے ہاتھ سے خود کو گرایا ہے۔ چنانچہ مضمون کو اس اہمیت کی نسبت سے شروع کی تین آیات میں ربُّ العزت نے دین کے چار اصول: عقلِ کُلّ، نفسِ کُلّ، ناطق اور اساس کی قسم کھائی ہے، جن کی مثال بالترتیب: انجیر، زیتون، طورِ سنین اور امن والے شہر سے دی گئی ہے۔ چوتھی آیت میں انائے سفلی کو روحانی عروج و ارتقاء میں بلند کرتے ہوئے احسنِ تقویم میں پیدا کرنے یعنی مرتبۂ **عِلِّیّین** یا انائے علوی تک پہنچانے کا ذکر آیا ہے۔ یہ مرتبہ انسان کی روحانی و عقلانی عروج و ارتقاء کی آخری حدّ ہے۔ یہاں پر انائے سفلی اپنے اصل یعنی انائے علوی سے واصل ہو جاتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ وہ مقام ہے جہاں مولا اور بندہ کے ایک ہونے کا علم ہوتا ہے۔ جیسا کہ استادِ بزرگوار فرماتے ہیں:

؎ مولا کہ بندہ ہن بمہ اَسرارہ اَرشَیم

یعنی مَیں مولا اور بندہ کے ایک ہونے کے اَسرار سے مست ہوگیا۔

انائے سفلی کے اس عروج و ارتقاء کی مثال قرآنِ کریم میں ایک سیڑھی سے دی گئی ہے۔ جس کے زینوں کی مسافت طے کرنے کے لئے پچاس ہزار برس کا زمانہ گزر جاتا ہے (۷۰:۱-۴)۔ استادِ بزرگوار فرماتے ہیں کہ ممکن ہے کہ اس سے یہ مراد ہوکہ کافرِ مطلق سے ایک نبیٔ مرسَل تک انسانیت کے پچاس ہزار درجات مقرر ہیں۔ نیز فرماتے ہیں کہ پچاس ہزار سال کا دن ظاہری اعتبار سے ہے۔ روحانی لحاظ سے مؤمنین و مؤمنات کا نور زمان و مکان کو سمیٹتا ہے جس کو قرآنِ حکیم میں نور کا دوڑنا کہا گیا ہے (۵۷:۱۲)۔

پانچویں آیت میں حضرتِ ربّ العزت فرماتا ہے: ''ثُمَّ رَدَدْنٰـهُ اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ''، یعنی ہم نے اسے پست ترین جگہ کی طرف لوٹا دیا۔ اس کی تأویل میں استادِ گرامی فرماتے ہیں کہ ربُّ العزت نے بمقتضائے حکمت انسان کو انائے سفلی کے اعتبار سے درجۂ اسفل کی طرف لوٹا دیا تاکہ علم و عمل میں آزمائش ہو جائے۔

چھٹی آیت میں ایمان یعنی علم الیقین اور عملِ صالح کی اہمیت کا ذکر ہے۔ چنانچہ فرماتا ہے: ''اِلَّا الَّـذِيْـنَ اٰمَـنُـوْا وَعَـمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ ط''، یعنی مگر وہ لوگ جو ایمان لائے اور اچھے اچھے کام کئے تو اُن کے لئے غیر ممنون اجر ہے۔ یعنی اجر جو غیر منقطع اور بے پایان ہے اور اُس میں احسان جتلانا بھی نہیں۔

انائے سفلی کا صُعُودی اور نُزُولی سفر

انائے علوی اور انائے سفلی استادِ گرامی کے علمِ قیامت کی اصطلاحات میں سے ہیں جو اس سے پہلے دعوت کی کسی کتاب میں نہیں پائی جاتی ہیں۔ انائے علوی سے نفسِ جزوی کا وہ بالائی یا سماوی سِرا مراد ہے جو عالمِ امر یا آخرت میں نفسِ واحدہ کے ساتھ ازلی و ابدی طور پر وابستہ ہے، اور انائے سفلی سے اس کا وہ زیرین یا ارضی سِرا مراد ہے جس کا سورج کی کرنوں یا درخت کے سایے کی طرح عالمِ خلق یا دنیا میں ظہور ہوتا رہتا ہے۔ ایک اور مثال میں انائے علوی سورج کی طرح ہمیشہ ایک حال پر قائم ہے اور انائے سفلی چاند کی طرح گھٹتے بڑھتے ہوئے بار بار آتا جاتا رہتا ہے۔ انائے علوی اور انائے سفلی کو بالترتیب روحِ مستقر اور روحِ مستودع بھی کہا جاتا ہے۔[1]

ادیانِ عالم میں نفسِ جزوی یا انسانی روح جن کو اس مقالے میں متبادلاً استعمال کیا گیا ہے، کو عموماً ایک اکائی کے طور پر تسلیم کیا جاتا رہا ہے اور اس کے دنیا میں آنے اور نہ آنے کے بارے میں الگ الگ نظریات پائے جاتے ہیں۔ مثلاً: (۱) کچھ کے یہاں انسانی روح دنیا میں بار بار آتی رہتی ہے یہاں تک کہ آخری نجات یعنی نِرْوَان نصیب نہ ہو۔ (۲) کچھ کے یہاں علم و عمل کی کمائی کے لئے دنیا میں آنے کا اس کو ایک ہی موقع ملتا ہے اگر اس موقع کو ضایع کیا اور اس سے کماحقہٗ فائدہ نہ اُٹھایا تو وہ ابدی طور پر عذابِ جہنم میں گرفتار رہتی ہے۔ (۳) کچھ کے یہاں چونکہ دنیا کو خدا نے آخرت کے لئے کھیتی کے طور پر بنایا ہے، اس لئے جب بھی کمائی کی ضرورت پڑے، شادمانی کے ساتھ روح یہاں آتی رہتی ہے۔

روح کے دنیا میں آنے جانے کے ساتھ ساتھ یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ خود دنیا کی تخلیق کے بارے میں سائنسی (یعنی مادّی سائنس) اور مذہبی الگ الگ نظریات پائے جاتے ہیں۔ مثلاً: مادّی سائنس میں اس وقت مشہور تھیوری بگ بینگ (Big Bang) کی ہے جس کے ذریعے سائنسدانوں کا ایک گروہ

ابتداء عالم کو ثابت کرنے کے لئے تگ و دو کرتا ہے۔ ادیانِ عالم میں کتبِ سماوی اور خصوصاً قرآنِ کریم میں، جو گزشتہ تمام کتبِ سماوی کا مُھَیۡمِن (محافظ و نگہبان ۴۸:۵) بھی ہے، چھ دنوں میں دنیا کو بنانے کا جو تمثیلی بیان تنزیل کی صورت میں آیا ہے اس کی بنیاد پر یہودیت، عیسائیت اور اسلام میں اہلِ ظاہر نے مثال کو ممثول یا حقیقت سمجھنے کی کوشش کی ہے، یعنی واقعاً وہ یہ مانتے ہیں کہ ہمارے شمار کے چھ دنوں میں خدا نے آسمانوں اور زمین یعنی دنیا کو بنایا ہے۔ اس کے برعکس جو تنزیل کو تأویل کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں ان کے یہاں یہ ایک ناقابلِ تصور بات ہے کہ خدا کی خدائی میں، جہاں وہ ذاتِ پاک خالق، رازق اور ربّ جیسی قدیم صفات کا مالک ہے، ایک ایسا وقت بھی ہو جس میں کوئی مخلوق، مرزوق اور مربوب نہ ہوں، اور پھر بعد میں کسی وقت میں یہ وجود میں آ جائیں۔ اس صورت میں خدا کی صفات قدیم نہیں رہیں گی بلکہ حادث ہو جائیں گی۔ اس لئے کائنات خدا کی صفاتِ قدیم کے ظہورات کی صورت میں ہمیشہ سے جاری و ساری ہے اور جس شش روزہ تخلیق کا ذکر آیا ہے، اس کا تعلق عالمِ کبیر سے نہیں بلکہ عالمِ دین اور عالمِ شخصی سے ہے۔

اس میں شک نہیں کہ ان مذکورۂ بالا تمام نظریات میں جزوی طور پر صداقت کا کوئی نہ کوئی پہلو ضرور پایا جاتا ہے لیکن صداقت کا جزوی پہلو منزلِ مقصود تک رہنمائی نہیں کر سکتا ہے اس لئے اس مقصد کے لئے ہمیں صداقتِ کُلّی کی ضرورت ہے، اور صداقتِ کلّی کے لئے ہمیں قرآنِ کریم ہی کی طرف رجوع کرنا ہے جو ہر گونہ صدق و عدل سے بھرپور ہے۔

کتبِ سماوی اور خاص کر قرآنِ کریم تمثیلی زبان میں ہونے کی وجہ سے ہر ایک کی رسائی سے باہر ہے، اس لئے ان سے کماحقہٗ فیضیابی کے لئے خدا نے کچھ شرائط رکھی ہیں جن کا جاننا لابدّی ہے۔ جاننا چاہئے کہ ہر آسمانی کتاب اپنے اپنے وقت میں ہدایت، رحمت، شفا اور بشارت جیسی برکات کا منبع، ہر سوال کا جواب اور ہر چیز کا بیان ہوتی ہے (۸۹:۱۶)۔ اس کے باوجود اگر قرآن کو دیکھا جائے تو بہت سی ایسی آیات سے واسطہ پڑے گا جو بظاہر سرے سے ایکدوسرے کے متضاد ہیں، مثلاً تخلیق کے بارے میں ہم نے دیکھا کہ ایک طرف شش روزہ تخلیق کا ذکر ہے (۵۴:۷) تو دوسری طرف سے امرِ

کُن سے ابداعی طور پر وجود میں لانے کا (۱۱۷:۲) بیان ہے۔ ایک طرف ہے کہ انسان وہی چاہتا ہے جو خدا چاہتا ہے (۳۰:۷۶)، دوسری طرف انسان اپنے نیک و بد اعمال کا ذمہ‌دار ہے (۲۸۶:۲)۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ واقعاً خدا کے کلام میں کوئی تضاد ہے، بلکہ امرِ واقعی یہ ہے کہ بعض آیات کا تعلق عالمِ امر سے ہے اور بعض کا عالمِ خلق سے، بعض کا تعلق انبیاء اور اولیاء سے ہے اور بعض کا عوام سے۔ اگر ان آیات کو اپنی مخصوص جگہ سے ہٹا کر عمومی طور پر یا ایکدوسرے کی جگہ استعمال کیا جائے تو لازمی طور پر تضادات پیدا ہوں گے اور راہِ راست پانے کا ذریعہ بننے کی جگہ گمراہی کا باعث ہوں گے۔

مثلاً آیت (۳۰:۷۶) کا تعلق انسانانِ کامل یعنی انبیاء و اولیاء سے ہے جو نفسِ امّارہ (۵۳:۱۲) پر غلبہ پا کر نفسِ لوّامہ (۲:۷۵) تک اور وہاں سے بھی ترقی کر نفسِ مطمئنّہ (۲۷:۸۹) کے مرتبے پر پہنچ کر خدا کے خاص بندوں میں شامل ہوگئے ہیں (۲۹:۸۹)، یعنی اب ان کو فنا فی اللہ اور بقاباللہ کا مرتبہ حاصل ہؤا ہے، اس لئے اب ان کا قول و فعل خدا کا قول و فعل ہو گیا ہے، جیسا کہ آنحضرت صلعم کے بارے میں ارشاد ہے: ''وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى - اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ يُّوْحٰى'' (۵۳:۳-۴)، یعنی وہ اپنی خواہش سے نہیں بولتا، یہ تو صرف وحی ہی ہے جو اس کی طرف کی جاتی ہے۔ ''وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى'' (۱۷:۸)، یعنی جب تُو نے (مٹی) پھینکی تو تُو نے نہیں پھینکی بلکہ خدا ہی نے پھینکی۔ نیز پیغمبرؐ کی بیعت کو خدا کی بیعت اور پیغمبر کے ہاتھ کو خدا کا ہاتھ قرار دیا گیا ہے، جیسا کہ فرمایا گیا ہے: ''اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ ط يَدُاللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ'' (۱۰:۴۸)، یعنی یقیناً جو لوگ تیری بیعت کرتے ہیں وہ خدا ہی کی بیعت کرتے ہیں، خدا کا ہاتھ ان کے ہاتھوں کے اوپر ہے۔

ان کے مقابلے میں آیت (۲۸۶:۲) کا تعلق عوام الناس سے ہے جن میں سے بیشتر شروع میں نفسِ امّارہ بالفعل اور نفسِ لوّامہ اور نفسِ مطمئنّہ بالقوہ ہونے کی وجہ سے بُرائی کی طرف زیادہ مائل ہوتے ہیں۔ اب اس صورت میں کوئی شخص انسانانِ کامل سے متعلق آیات کا اطلاق عوام النّاس پر کرے تو اس سے وہ ناقابلِ تصور نتائج سامنے آئیں گے جن کی نشاندہی کرتے ہوئے پیر ناصر (قس)

اپنے دیوان میں فرماتے ہیں:

عُقُوبت محال است اگر بُت پرست　　　بفرمان ایزد پرستد صنم
ستمگار زی تُو خدای است اگر　　　بدست تُو اُو کرد برمن ستم

اگر بت پرست خدا کے حکم سے بت پرستی کرتا ہے تو اس پر اس کو سزا دینا ایک بیہودہ کام ہوگا، اگر خدا تیرے ہاتھ سے مجھ پر ظلم کرتا ہے تو پھر تیرے نزدیک خدا ہی ظالم ہے۔[۲]

چنانچہ ربّ العزت نے ان خطرات سے اپنے بندوں کو بچانے کے لئے کتبِ سماوی، بالخصوص قرآنِ حکیم کو سمجھنے کے لئے، جیسا کہ قبلاً ذکر کیا گیا ہے، کچھ شرائط رکھی ہیں، جن کا جاننا اشد ضروری ہے۔

چنانچہ ان شرائط میں سے ایک بڑی شرط کتبِ سماوی کی زبان کی نوعیت کو سمجھنا ہے۔ کتبِ سماوی کی زبان دو قسم کی ہوتی ہے: ایک تنزیلی اور دوسری تأویلی۔ تنزیلی زبان میں حقائقِ عالیہ کو عوام کی سہولت کی خاطر عام فہم اور مانوس الفاظ اور مثالوں میں بیان کیا جاتا ہے۔ تأویل میں تنزیلی مثالوں میں پوشیدہ حقائق کو لوگوں کے فہم و فراست اور سمجھنے کی استعداد اور زمانے کے تقاضوں کے مطابق تدریجی بیان کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ یہاں تک کہ ایک پیغمبر کا دور مکمل نہ ہو جائے اور تأویلِ محضِ مجرّد کا وقت نہ آ جائے۔ اس عمل میں گزشتہ تأویل کی بہ نسبت حقائق آئندہ تأویل میں روشن تر نظر آتے رہتے ہیں۔ اس کام کے لئے خدا نے تنزیل اور تأویل دونوں کے لئے الگ الگ معلّم مقرر کئے ہیں تاکہ عوام سے لے کر جویانِ حقائق کے لئے قرآنِ حکیم سے فیض حاصل کرنے میں رکاوٹ نہ ہو۔ تنزیل کے لئے پیغمبر کو مقرر کیا ہے اور تأویل کے لئے آپ کے وصی اور ان کی اولاد ائمۂ طاہرین کو، تاکہ جو قیامِ قیامت یا دور کے مکمل ہونے تک تأویل کو جاری رکھیں۔ خلاصہ یہ کہ خدا نے اپنی مشکل کتاب کو اپنے بندوں کو آسان بنانے کے لئے اپنے علم کے ساتھ ایک معلّم کو بھی بھیجا ہے تاکہ قرآن فہمی کے لئے یقینِ کامل کے ساتھ ان کی طرف رجوع کریں۔

قرآن فہمی کی ایک اور ضروری شرط خدا کا اپنے نور کو تدریجی طور پر تمام کرنے (۳۲:۹ ؛

۸:۶۱) اور بالآخر زمین کا اس کے نور سے روشن ہونے (۶۹:۳۹) کی حکمت کو سمجھنا ہے۔ ظاہر ہے کہ خدا کا نور فی ذاتہٖ تمام یا ناتمام ہونے سے بالا و برتر ہے۔ یہ صرف بندوں کے لحاظ سے ہے کہ دورِ ستر کے شروع میں بیشتر لوگ حقائقِ عالیہ یا اسرار کو سمجھنے کے قابل نہیں ہوتے۔ اسلئے وقتی طور پر ان سے ان کو پوشیدہ رکھا اور بتدریج ظاہر کیا جاتا ہے۔ گویا خدا کا نور وقت کے ساتھ مکمل ہو جاتا ہے۔

دوسرے لفظوں میں ہر چند کہ پیغمبر کی شریعت میں وضعی اور عقلی دونوں پہلو ہیں لیکن وضعی شریعت کا تعلق دورِ ستر سے ہے اور عقلی شریعت کا تعلق دورِ کشف یا دورِ قیامت سے ہے جو اسرار کے ظہورات (۹:۸۶ ؛ ۴:۹۹) کا وقتِ معین ہے، لہٰذا اس سے پہلے اسرار ظاہر نہیں ہو سکتے۔ جس طرح کسی کاشتکار نے ابھی ابھی گندم، جو یا کسی اور غلے کی کاشت کی ہے تو اس کی فصل ساتھ ساتھ نہیں پکتی بلکہ اس کے لئے مقررہ وقت کا انتظار کرنا ہوگا۔ اسی قانونِ فطرت کے مطابق کبھی کبھار دورِ ستر کے ایک امام کا فرمان دورِ کشف کے ایک امام کے فرمان کا منافی و متضاد بھی ہوتا ہے جو اصل میں منافی و متضاد نہیں بلکہ وقت کی مناسبت کی ہدایت ہے۔ مثلاً مولانا علی کے زمانے میں کچھ مؤمنین نے برملا آپ سے کہا: ''اَنْتَ اِلٰهُنَا وَخَالِقُنَا وَرَازِقُنَا وَمِنْکَ مَبْدَؤُنا وَ اِلَیْکَ مَعَادُنا''، یعنی تُو ہی ہمارا خدا، خالق اور رازق ہے اور تجھ سے ہمارا مبدأ اور تیری طرف ہمارا معاد ہے۔ اس پر مولا نے ان سب کو قتل کرا دیا۔[۳] لیکن مولانا سلطان محمد شاہ، صلوات اللہ علیہ نے برملا ''علی اللہ'' کی تعلیم دی اور جماعت میں سے بہت سارے لوگوں کو جو اس آخری درجے کی تعلیم کی قدردانی سے قاصر تھے، وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اسماعیلی دین میں کن معنوں میں ''علی اللہ'' کہتے ہیں۔ چنانچہ امامِ عالیمقام ۱۹۴۵ء میں ''اسماعیلیہ مشن کانفرنس''، دارالسلام میں فرماتے ہیں:

"In Bombay eight years ago, many of our people came to me and requested me to add just one word in Du'a, and then, they said everything was alright. I said, "what is that one word?" They said, "Instead of 'ALI ALLAH', say 'ALIYYUN WALIYYU'LLAH'." So I

said, "you better drop the whole Dua if you want to alter that word. You are ignorant. It is your ignorance and not that "ALI ALLAH" is wrong.

You read my farmans that I made in Bombay in 1905/6, interpreted by Kamadia Hajee, where I explained fully that there is a fundamental difference between Ismailism and Christianity. They believe that Jesus the man was God Almighty. For the Ismailies, during the sixty years of his life, Ali on earth was the prisoner of the material world, limited by it, and suffering constantly. When we think of Ali, it is not the man during these sixty years, but the eternal one that came from God and returned to God direct."

’’آٹھ سال پہلے بمبئی میں ہمارے بہت سے لوگ ہمارے پاس آئے اور ہم سے درخواست کی کہ دعا میں صرف ایک ہی لفظ کا اضافہ کرنا ہے۔ اور پھر انہوں نے کہا کہ باقی سب کچھ ٹھیک ہے۔ ہم نے فرمایا: وہ ایک لفظ کیا ہے؟ انہوں نے کہا: ’’عَلِیّ اللّٰہ‘‘ کی جگہ ’’علیٌّ ولیُّ اللّٰہ‘‘ کہنا۔ پس ہم نے فرمایا: اگر آپ اس لفظ کو بدلنا چاہتے ہیں تو اس سے بہتر ہے کہ آپ پوری دعا کو ترک کر دیں۔ آپ جاہل ہیں۔ یہ آپ کی جہالت ہے نہ کہ ’’علی اللّٰہ‘‘ غلط ہے۔

آپ ہمارے ان فرامین کو پڑھیں جو ہم نے ۱۹۰۵/۶ء میں بمبئی میں کئے ہیں [اور] جن کی تشریح کامڑیا حاجی نے کی ہے۔ ان فرامین میں ہم نے مکمل طور پر وضاحت کی ہے کہ اسماعیلیت اور عیسائیت کے مابین ایک بنیادی فرق ہے۔ عیسائی مانتے

ہیں کہ عیسیٰ [عیثیتِ] شخص قادرِ مطلق خدا تھا۔ جہاں تک اسماعیلیوں کا تعلق ہے علیؑ زمین پر اپنی ساٹھ سالہ زندگی کے دوران ماڈّی دنیا کے قیدی تھے، جس میں محصور مصائب جھیلتے رہتے تھے۔ جب ہم علیؑ کا خیال کرتے ہیں تو اس سے مراد وہ شخص نہیں جو ان ساٹھ سالوں کے دوران تھے، بلکہ وہ ازلی و ابدی (علیؑ) ہے جو براہِ راست خدا سے آئے اور خدا کی طرف واپس ہوئے۔''[۴]

معلوم ہونا چاہیئے کہ حضرت مولانا امام سلطان محمد شاہ، صلواۃ اللہ علیہ، نے علی اللہ کی حقیقت کی جو تفصیلی تأویلی وضاحت فرمائی ہے اس کا اجمالی ذکر قرآنِ حکیم کی ان آیات میں آیا ہے جن میں خدا کے جسمانی اعضاء: چہرہ، ہاتھ، آنکھیں، پنڈلی وغیرہ کا ذکر آیا ہے اور خاص کر اُن آیات میں جن میں اس کے ظہور کا ذکر ہے، جیسے ''هُوَالْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ وَهُوَ بِكُلِّ شَیْ ءٍ عَلِیْمٌ'' (۵۷:۳)۔ اور ان اعضاء اور صفات کے مصداق کی وضاحت کرتے ہوئے آنحضرتؐ نے فرمایا: ''مَنْ رَأنِیْ فَقَدْ رَأی الْحَقّ''، یعنی جس نے مجھے دیکھا اس نے یقیناً خدا کو دیکھ لیا۔''[۵] اس لئے کہ اپنے وقت میں آپ ہی ان اعضاء اور صفات کے مصداق تھے، جیسا کہ اس سے پہلے ہم دیکھ چکے ہیں۔ (دیکھئے، ص ۳)۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا کا نور جو پیغمبرؐ کے بعد أئمۂ اطہار میں جلوہ گر ہے، دورِ قیامت یا دورِ کشف کے زمانے کے لحاظ سے جس قدر نزدیک تر ہوتا جائے گا، اسی لحاظ سے لوگوں کے لئے حقائق پر زیادہ سے زیادہ روشنی پڑتی جائے گی۔ جس طرح آفتابِ عالم تاب ۲۱، دسمبر سے ۲۱، جون کی طرف جس قدر آگے بڑھتا جاتا ہے اسی لحاظ سے اہلِ زمین کے لئے دن کا وقت یعنی روشنی بڑھتی جاتی ہے۔ اس سے سورج کی روشنی میں فی ذاتہٖ کوئی فرق نہیں پڑتا، بلکہ فرق و تفاوت اور زیاد و نقصان کا تعلق اہلِ زمین سے ہے۔ چنانچہ قرآن کی تنزیلی زبان، جو جوامع الکلم کی صورت میں ہے اور جو صدق و عدل میں تمام ہے، قیامت تک وہی رہے گی۔ لیکن اس میں پوشیدہ اسرار و حقائق کا اِفشا اتمامِ نور یا قربِ قیامت کی نسبت سے زیادہ سے زیادہ ہوتا جائے گا۔

اس وضاحت کا مقصد یہ ہے کہ حقائق کو سمجھنے کے لئے قرآنِ حکیم کے مخصوص اور منفرد

طریقے کو اچھی طرح سمجھا جائے۔ عام طور پر حقائق کو صحیح طور پر سمجھنے میں ماضی کے مخطوطات پر زور دیا جاتا ہے۔ الفاظ و عبارت کو صحّت کے ساتھ منتقل کرنے میں اس طریقِ کار سے مدد ضرور مل سکتی ہے۔ لیکن حقائق کے اِفشا کا تعلق الفاظ کی صحت تک محدود نہیں بلکہ اس کا زیادہ تعلق اتمامِ نور سے ہے، مثلاً ایک آیت کی تأویل اگر مولانا علی علیہ السلام نے کی ہے تو وہ اپنے زمانے کی ضرورت کے لحاظ سے حق ہے، لیکن اگر اسی آیت کی ایک مختلف تأویل مستقبل کے ایک امام نے کی ہے تو اس امام کی تأویل اپنے زمانے کی ترقی کے لحاظ سے مولانا علیؑ کی تأویل سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ اس لئے قرآن کے حقائق کو سمجھنے کے لئے مستقبل میں آنے والے اماموں کی تأویلات پر زیادہ زور دینے کی ضرورت ہے، اس لئے کہ ان کے زمانوں میں خداوندی نور کی روشنی گزشتہ کی بہ‌نسبت زیادہ پھیل گئی ہے۔

اس سلسلے میں حضرت مولانا امام سلطان محمد شاہ، صلوات اللہ علیہ کے کئی ایک فرامین ہیں جس سے اس حقیقت پر روشنی پڑتی ہے، مثلاً *"دنیا میں وقتاً فوقتاً بڑی بڑی تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ اس لئے ہر زمانے میں اپنے زمانے کا امام حاضر ہوتا ہے۔ بدلتے ہوئے وقت میں کیا کرنا اور کیسے چلنا چاہیئے اس کے بارے میں ہم آپ کو فرمان فرماتے ہیں...... ہر زمانے میں جو امام حاضر ہو اور وہ جو فرمان کرے اس پر چلنا آپ کا فرض ہے۔"* [٦] *"گزشتہ اماموں کے فرامین مانیں اور حاضر امام کے فرمان نہ مانیں تو اس سے کچھ فائدہ نہیں۔"* [٧] *"امام زمان کے فرامین ہمیشہ نئے آتے ہیں، آپ آخری فرمان پر عمل کریں۔"* [٨]

دینِ حق کے اسرار و حقائق کے اِفشا کے بارے میں جو بیان ہوا اس کا تعلق دورِ کشف سے ہے اور یہ بالعموم ہے۔ لیکن خاص حالات میں ان کا اِفشا دورِ ستر میں بھی رسیدہ مؤمنین کے لئے کیا جاتا ہے۔ جیسے موسمِ سرما میں عام طور پر لوگوں کو سردی کی سختی جھیلنی پڑتی ہے اور پھول اور پھل موسمِ بہار اور موسمِ تابستان سے پہلے پیدا نہیں ہوتے۔ لیکن اگر کوئی آسودہ حال گھرانہ ہے تو سنٹرل ہیٹنگ (central heating) کے ذریعے نہ صرف سردی کی سختی سے بچ جاتا ہے بلکہ اسی موسم میں اپنے گھر

میں پھول اور پھل بھی پیدا کر سکتا ہے۔ اور اس کی کئی ایک مثالیں ملتی ہیں۔

ہم نے سطورِ بالا میں پڑھا کہ مولانا علیؑ نے آپ کو برملا خدا کہنے والوں کو سخت سزا دی تھی۔ اس کے برعکس مولانا سلطان محمد شاہ، صلوات اللہ علیہ، کلامِ مبین میں فرماتے ہیں: ''ہمارے دادا حضرت مولا مرتضٰی علی کو مومن نُصیر ''اللہ'' کہتا تھا، اس کو ستر مرتبہ قتل کیا گیا، مگر وہ ''علی اللہ'' کہتا رہا۔ پھر حکم ہؤا کہ یہ ایک سچا مؤمن ہے اور اس کی اولاد بھی ایسی سچائی والی ہوگی۔ اس مؤمن اور اس کی اولاد سے قیامت کے روز نہیں پوچھا جائے گا۔[9]

مولانا زین العابدینؑ کے زمانے میں جب مولانا محمد الباقرؑ کو پانچ سال کی عمر میں عبداللہ صباح کے مکتب میں بھیجا گیا اور آپؑ سے علم و حکمت کے معجزات ظہور پذیر ہوئے تو وہ امام علیہ السلام کے الوہی پہلو کی شہادت دیتے ہوئے آپؑ کے سامنے سجدہ ریز ہؤا۔ سجدے سے سر اُٹھایا تو آنحضرت سے امام حسینؑ تک یعنی پنجتن پاک میں سے ہر ایک نے یکے بعد دیگرے اپنی اپنی الوہی تجلّی دکھائی اور ان کے بعد دوبارہ مولانا محمد الباقرؑ کی الوہی تجلّی دیکھی۔ اس پر عبداللہ آپے میں نہ رہا اور برملا امامؑ سے خطاب کیا: ''اَنْتَ الْاَوّلُ وَاَنْتَ الْآخِرُ وَاَنْتَ الظَّاهِرُ وَاَنْتَ الْبَاطِنُ وَاَنْتَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِيم''، یعنی تُو ہی اوّل ہے اور تُو ہی آخر ہے، تُو ہی ظاہر ہے اور تُو ہی باطن ہے، اور تُو ہی ہر چیز کا جاننے والا ہے۔ اس کے بعد عام لوگوں کے سامنے گلی کوچوں میں بھی امامؑ کے بارے میں کہنے لگا: ''هُوَالْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ وَهُوَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِيْمٌ'' (۵۷:۳)، یعنی وہی اوّل ہے اور وہی آخر ہے، اور وہی ظاہر ہے اور وہی باطن ہے، اور وہی ہر چیز کا جاننے والا ہے۔ اس پر لوگ گروہ در گروہ اس کے گرد جمع ہونے لگے اور کہنے لگے کہ بڑھاپے میں عبداللہ صباح گمراہ ہوگیا ہے۔ جب اس کی اطلاع مولانا زین العابدینؑ اور مولانا الباقرؑ کو دی گئی تو آپ علیہما السلام نے فرمایا کہ اس کو جلا دیا جائے، کیونکہ وہ پاگل ہوگیا ہے۔

اس کے بعد کچھ رسیدہ مؤمنین نے خلوت میں مولا سے عرض کیا کہ اے مولائے ما! ہمارا اعتقاد بھی عبداللہ ہی کی طرح ہے، لیکن اس کے برملا کہنے پر آپ نے اس کو ایسی سخت سزا دی۔ اس کی

حکمت سمجھنے سے ہم قاصر ہیں۔ مولا نے فرمایا کہ یہ سزا باطن میں نہیں، باطن میں تو وہ تجلّیات میں مست ہے۔ یہ صرف ظاہری لحاظ سے ہے۔ ظاہر میں اس نے ہمارا پردہ ہٹایا تو ہم نے بھی اس کا پردہ ہٹایا۔ دورِ ستر کے چھ ہزار سالوں میں ہمارا پردہ ہٹانا بہت بڑا خطرہ ہے۔ یہ پردہ صرف اُس وقت ہٹایا جائے گا جب ملک تعالیٰ قائم کے ذریعے ظہور فرمائے گا۔[۱۰] (خلاصہ)

ان دو واقعات سے ظاہر ہے کہ ان بیانوں پر سزا غلط بیانی کی وجہ سے نہیں بلکہ افشائے راز کی وجہ سے تھی۔ لہٰذا رسیدہ مؤمنین جب خلوت میں ائمۂ طاہرین سے ان کی حقیقت کے بارے میں پوچھتے تھے تو ائمۂ طاہرین اپنی حقیقت ان پر ظاہر کرتے تھے۔ چنانچہ حضرت پیر شہاب الدّین شاہ الحسینی (قس) اپنے رسالۂ در حقیقتِ دین میں لکھتے ہیں: ایک سائل نے حضرت امام جعفر صادقؑ کے حضور میں گزارش کی کہ کیا یہ درست ہے کہ خدا قیامت کے دن دکھائی دے گا؟ آپؑ نے فرمایا: بالکل درست ہے، خدا تو قیامت سے پہلے اس دن بھی دکھائی دیا تھا جس دن اُس نے فرمایا تھا: اَلَسۡتُ بِرَبِّکُمۡ (۷:۱۷۲)، یعنی کیا میں تمہارا پروردگار نہیں ہوں؟ اور مؤمنین نے اس کو دنیا میں بھی دیکھا ہے۔ پھر امام علیہ السلام نے فرمایا: کیا تُو اس وقت [خدا کو] نہیں دیکھتا ہے؟ اس نے عرض کیا: اے میرے مولا! مَیں تجھے دیکھتا ہوں، کیا آپ مجھے اجازت دیتے ہیں کہ اس حقیقت کو آپ کی زبان سے [دوسروں کو بھی] بتا دوں؟ امامؑ نے فرمایا: کسی سے نہ کہنا، اس لئے کہ جاہل اور ناسمجھ لوگ تیرا انکار کریں گے اور اس [حقیقت] کو نہیں سمجھیں گے۔"[۱۱] پوشیدہ طور پر ائمۂ طاہرین اپنے رسیدہ مریدوں کے لئے نہ صرف اپنی حقیقت کا اظہار کرتے تھے بلکہ ان کے اپنے مرتبے کا بھی اظہار کرتے تھے۔ چنانچہ سیدنا جعفر بن منصور الیمن (قس) اپنی کتاب الزکوٰۃ میں لکھتے ہیں کہ مولانا محمد الباقرؑ نے اپنے اور اپنے مریدوں کے بارے میں فرمایا: "مَاقِیۡلَ فِی اللہِ فَھُوَ فِیۡنَا وَمَا قِیۡلَ فِیۡنَا فَھُوَ فِی الۡبُلَغَاءِ مِنۡ شِیۡعَتِنَا"، یعنی جو کچھ خدا کے بارے میں کہا گیا ہے وہ ہمارے بارے میں ہے اور جو کچھ ہمارے بارے میں کہا گیا ہے وہ ہمارے اُن شیعوں کے بارے میں ہے جو رسیدہ ہیں۔[۱۲]

اس مختصر تمہید کے بعد تخلیق کی دورِ کشف کی روشنی میں وضاحت کرنے سے پہلے دورِ ستر میں

لکھی ہوئی حجتِ خراسان کی مشہور کتاب جامع الحکمتین سے ایک اقتباس کا خلاصہ پیش کیا جاتا ہے جس میں پہلے آپ چھ دنوں میں آسمانوں اور زمین کی تخلیق اور اِستَوٰی عَلَی الْعَرْش سے متعلق آیات کی اہلِ ظاہر کی تفسیر کے تضادات کی نشاندہی کرتے ہیں اور پھر تأویل کی روشنی میں ثابت کرتے ہیں کہ اس شش روزہ تخلیق کا عالمِ کبیر سے کوئی تعلق نہیں بلکہ اس کا تعلق عالمِ دین سے ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں: ''اَللّٰہُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَیْنَھُمَا فِیْ سِتَّۃِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ ط''۔ (۳۲:۴)، یعنی (اہلِ ظاہر کے ترجمے کے مطابق) اللہ وہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ دونوں کے درمیان ہے چھ دنوں میں پیدا کیا، پھر وہ عرش پر مستولی (غالب) ہوا۔ یہاں پر اہلِ ظاہر کا کہنا ہے کہ ایک ایسا وقت بھی تھا جس میں آسمان اور زمین نہ تھے، پھر خدا نے یہ سب چھ دن کی مدت میں بنایا۔ نیز یہاں پر ان کے نزدیک ''استوی'' کے معنی ''استیلا'' کے ہیں، یعنی آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے کے بعد عرش پر مستولی (غالب) ہوا۔ اہلِ تأویل کا کہنا ہے کہ خدا کی کتاب ہماری ہدایت کے لئے آئی ہے۔ اگر ہم یوں سمجھیں کہ خدا نے یہ جہان چھ دنوں میں پیدا کیا تو اس سے ہماری ہدایت میں کوئی اضافہ نہیں ہوگا، کیونکہ اس تفسیر سے خدا کی عاجزی کا ثبوت ملتا ہے، یعنی وہ قادرِ مطلق ایک لحظہ میں یہ عالم پیدا نہیں کر سکتا تھا اس لئے اس کو چھ دن لگانے کی ضرورت پڑی، جبکہ دوسری جگہ وہ فرماتا ہے کہ ''اِنَّمَا قَوْلُنَا لِشَیْءٍ اِذَآ اَرَدْنٰہُ اَنْ نَّقُوْلَ لَہٗ کُنْ فَیَکُوْنُ '' (۱۶:۴۰)، یعنی ہمارا قول سوائے اس کے نہیں کہ جب ہم کسی چیز کا ارادہ کرتے ہیں کہ اسے کہیں کہ ہوجا، تو وہ ہو جاتی ہے۔ اس کے علاوہ اس آیت میں ''استوی'' کو ''استیلا'' کے معنوں میں لیں، کہ خدا عالم پیدا کرنے کے بعد عرش پر غالب ہوا، تو گویا اس کے یہ معنی ہوئے کہ عالم پیدا کرنے سے پہلے وہ عرش پر غالب نہ تھا، یا خود عرش ہی نہ تھا۔ یہ دلیل ایک ایسی یاوہ گوئی (پوچ، لچر) ہے کہ پہلی تفسیر سے بدتر ہے۔

چنانچہ اہلِ تأویل کے نزدیک اس آیت کا تعلق تخلیقِ عالمِ ظاہر یا عالمِ کبیر سے نہیں بلکہ اس کا تعلق عالمِ دین سے ہے کہ خدا نے عمرِ عالمِ دین چھ پیغمبروں کی نبوت کی مدت میں بنایا، جن میں

سے ہر ایک کا دور اس کا دن تھا، جس میں اس نے لوگوں کو خدا کی طرف بلایا۔ جب اس کا دن گزر گیا تو اس کی جگہ ایک دوسرا پیغمبر آیا اور لوگوں پر فرض ہوُا کہ اس دوسرے پیغمبر پر ایمان لائیں۔ اگر لوگ اس تأویل کی تلاش کرتے تو ہرگز وہ ایک ایک پیغمبر پر نہ رُکتے، جس طرح کہ عیسائی، یہودی اور مجوسی بالترتیب پانچ روز، چار روز اور تین روز پر رُکے ہوئے ہیں۔ نیز ''اِسۡتَوٰی عَلَی الۡعَرۡش'' کے معنی عرش پر غالب یا مسلط ہونے کے نہیں بلکہ اس سے مراد ہے خدای تعالیٰ کے فرمان کا حضرتِ قائم القیامت کے ذریعے مکمل ہونا ہے جو خدا کا عرش ہے اور اس کا ظہور ان چھ دنوں (یعنی چھ ادوار) کے گزرنے کے بعد ہوگا۔ اس وقت خدا کے فرمان کا اطلاق لوگوں پر زبردستی ہوگا، جیسا کہ خدا کا قول ہے: ''لِـمَنِ الۡمُلۡکُ الۡیَوۡمَ ط لِلّٰهِ الۡوَاحِدِ الۡقَهَّارِ'' (۱۶:۴۰)، یعنی آج کے دن ملک (حکومت) کس کا ہے؟ خدائے واحد زبردست کا۔[۱۳]

سطورِ بالا میں آیتِ تخلیق کی ظاہری تفسیر اور اس کے مقابلے میں اس کی تأویل سے اندازہ ہوُا کہ تأویل کی رُو سے چھ دن سے مراد نہ چوبیس گھنٹوں کے دن ہیں اور نہ '' اِسۡتَوٰی عَلَی الۡعَرۡش ''سے عرش پر غالب آنا یا مسلط ہونا ہے، اور نہ اس آیت اور اس جیسی آیات سے مراد عالمِ ظاہر یا عالمِ کبیر کی تخلیق ہے، بلکہ چھ دنوں سے مراد چھ اصحابِ اَدوارِ شرائع، عرش سے حضرتِ قائم، ''اِسۡتَوٰی عَلَی الۡعَرۡش '' سے حضرتِ قائم کے ذریعے فرمانِ خداوندی کا مکمل ہونا اور آیتِ زیرِ بحث میں تخلیق سے مراد عالمِ دین کی تخلیق ہے۔ اس تأویل سے ظاہر ہے کہ قرآنِ کریم میں کسی ہنگامی اور وقتی تخلیق کا ذکر نہیں۔ جس تخلیق کا ذکر کیا گیا ہے اس کا تعلق عالمِ دین کے اَدوار ہے۔

جہاں تک عالمِ ظاہر یا عالمِ کبیر کا تعلق ہے، دورِ ستر میں حجاب کی زبان میں اور دورِ کشف میں برملا فرمایا گیا ہے کہ اس عالم کی نہ کوئی ابتداء ہے اور نہ کوئی انتہا، بلکہ ادوار و اَکوار کے دائروں سے گزرتے ہوئے جزئیات سے قطع نظر کلّی طور پر خدا کی صفات کے ظہورات کی صورت میں ہمیشہ جاری و ساری ہے۔ دعوتِ حق کی کتابوں میں اس کی بہت مثالیں مل سکتی ہیں۔ چنانچہ اس سلسلے میں جب حضرتِ اُمُّ النّداء شہر بانوؑ نے مولانا زین العابدینؑ سے عمرِ عالم کے بارے میں پوچھا تو آپؑ نے

فرمایا: ''اَمَّا مَا مَضَیَ فَاُخبِرُکِ وَ اَمَّا مَابَقِیَ فَلَا سَبِیْلَ اِلَیْہِ، قَدْ مَضَی اَرْبَعَمائۃ اَلْفَ کَوْرٍ، فِی کُلِّ کَورٍ اَرْبَعَمِائَۃُ اَلفُ دَورٍ. فَھٰذا شَیءٌ لَاْ یُحْصِیْہِ عِدّۃً اِلّا اللہُ عَزَّ وَجَلَّ''، یعنی ''جو زمانہ گزر چکا ہے اس کے بارے میں مَیں آپ کو بتاؤں گا، لیکن جو باقی ہے اس کے بارے میں ممکن نہیں۔ چنانچہ (دنیا کی عمر سے) چار سو ہزار کَور گزرے ہیں اور ہر کَور میں چار سو ہزار دَور۔ پس یہ ایک ایسی چیز ہے کہ خدائے عزّ و جلّ کے سوا کوئی اس کا شمار نہیں کر سکتا ہے۔'' [۱۴]

امامِ عالیمقام کے اس ارشاد میں اَکوار و اَدوار کا ذکر ہے اور دنیا کی گزشتہ عمر کے بہت بڑے عدد کا ذکر ہے، لیکن اس کے باوجود اس سے تخلیق کی ابتدا ثابت ہے، اور جس چیز کی ابتدا ثابت ہو، تو اس کی انتہا ضرور ہوتی ہے۔ اس لئے یہ عدد جتنا بھی عظیم کیوں نہ ہو خدا کی دائمی صفات کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتا ہے۔ اس سے یوں لگتا ہے کہ امامِ عالیمقام نے یہ ارشاد ایک خاص وقت کے تقاضے کے پیشِ نظر فرمایا ہے نہ کہ حقیقی اور آخری معنوں میں، اس لئے کہ ہر ناطق کی دعوت کی تکمیل و اتمام اس دور کے قائم کے ظہور پر ہوتا ہے اور آخری درجے کے اسرار و حقائق، جیسا کہ پہلے اشارہ کیا گیا ہے، اس سے پہلے فاش نہیں ہو سکتے۔ اس سلسلے میں استادِ گرامی ۱۱، اپریل ۲۰۱۳ء کے ایک تازہ مقالے Royal Bungalows In Living Paradise (۲۴۹) میں آیت ''وَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ جَعَلْنَا بَیْنَکَ وَ بَیْنَ الَّذِیْنَ لَایُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَۃِ حِجَابًا مَّسْتُوْرًا''(۱۷:۴۵)، یعنی اور جب تو قرآن پڑھتا ہے تو ہم تیرے اور ان لوگوں کے درمیان جو آخرت پر ایمان نہیں لاتے ہیں ایک پوشیدہ پردہ بناتے ہیں، کی نورانی کشفی تاویل میں فرماتے ہیں کہ

> *''اس آیت میں بہت بڑا اور ضروری راز ہے کہ جب رسولِ کریمؐ قرآن پڑھتے تھے تو بہت سے اصحاب سامنے ہوتے تھے، لیکن آپؐ اور اصحاب کے درمیان ایک سمعی حجاب یا پردہ حائل ہو جاتا تھا، جس کی وجہ سے وہ تأویل، امام شناسی، قائم شناسی، حوران سے نورانی شادی، حورانی سائنس وغیرہ کے رازوں کو، جن کا تعلق عقلی شریعت سے تھا، نہیں سمجھ سکتے تھے۔ یہ علی اللہ کا بہت عظیم معجزہ تھا۔ وہ وقت سے پہلے دورِ کشف اور عقلی*

شریعت کے رازوں کو کچھ پر ظاہر کرنا نہیں چاہتا تھا۔"

ابتدا و انتہا کے بغیر دوری آفرینش کا تصور یقیناً انہی اسرار میں سے ایک تھا اور جس برملا انداز میں یہ تصور حجتِ قائم نے ظاہر کیا تاریخِ دعوتِ حق میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔ اشراطِ قیامت کے نمایاں ہونے کی برکات سے اہلِ معرفت کے لئے جو بشارتیں مل رہی ہیں اس سے ہمیں یقین آتا ہے کہ وہ مبارک دورِ قیامت ہمارا ہی زمانہ ہے اور وہ دین کے شبِ قدر یعنی حجتِ قائم حضرت مولانا امام سلطان محمد شاہ، فداہ ارواحنا، ہیں، چنانچہ آپؑ اپنی میمائرس (Memoirs) میں برملا فرماتے ہیں:

"The creation according to Islam is not a unique act in a given time, but a perpetual and constant event; and God supports and sustains all existence at every moment by His will and His thought."

"اسلامی تصور کے مطابق آفرینش ایک وقتِ معین میں ایک منفرد عمل نہیں بلکہ ایک دائم اور مسلسل واقعہ ہے، اور خدا تمام وجود کو اپنے ارادے اور اپنے خیال سے ہر آن سہارا دیتا اور قائم رکھتا ہے۔" ۱۵

ایک اور جگہ پر امام عالیمقام "کائنات کو واقعات کا ایک سلسلۂ نامتناہی کی طرح" قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

" But having known the real, the Absolute, having understood the Universe as an infinite succession of events, intended by God, we need an ethic, a code of conduct in order to be able to elevate ourselves toward the ideal demanded by God."

"لیکن حقیقتِ مطلقہ کو جانتے ہوئے، کائنات کو ارادۂ الٰہی کے مطابق واقعات کے ایک سلسلۂ نامتناہی کی طرح سمجھتے ہوئے ہمیں خود کو اس نصب العین تک بلند کرنے کے

لئے جس کا تقاضا خدا کرتا ہے، ایک اخلاقی ضابطۂ حیات [یعنی] ایک ضابطۂ عمل کی ضرورت ہے۔[۱۶]

اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ امامِ عالی مقام یہودی اور اسلامی وحدانیت کے درمیان فرق کی وضاحت کرتے ہوئے کائنات کو خدا کی شخصیت کا ظہورِ برترین قرار دیتے ہیں اور فرماتے ہیں:

"In spite of its great spiritual stregnth, Jewish monotheism has retained two characterstics which render it essentially different from Islamic monotheism; God has remained, in spite of all, a national and racial God for the childern of Israil, and His personality is entirely separate from its supreme manifestation, the Universe."

"یہودی وحدانیت نے اپنی عظیم روحانی قوت کے باوجود دو ایسی خصوصیات باقی رکھی ہیں جو اس کو اسلامی وحدانیت سے بنیادی طور پر جدا کر دیتی ہیں، [اور وہ یہ کہ] خدا تمام باتوں کے باوجود بنی اسرائیل کے لئے ایک قومی اور نسلی خدا رہتا رہا ہے، اور اس کی شخصیت اس کے ظہورِ برترین [یعنی] کائنات سے بالکل جدا ہے۔"[۱۷]

ان حوالہ جات سے ظاہر ہے کہ حضرتِ حجتِ قائم نے جن کا علمی مرتبہ دین کے شبِ قدر کی حیثیت میں ہزار اماموں سے برتر ہے، کس طرح شریعتِ عقلی کے اسرار سے جامۂ تمثیل اور حجابِ تشبیہ کو ہٹا کر ان کو تأویلِ محضِ مجرد کی صورت میں پیش کیا ہے۔

حضرتِ حجتِ قائم کے یہ ارشادات اجمالی صورت میں ہیں اور ان کی تفصیلات کے لئے استادِ گرامی کی کتابوں کی طرف رجوع کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ موصوف کی کتابوں کے حوالے سے پہلے یہ جاننا انتہائی ضروری ہے کہ دین کے مختار برتر [یعنی امامِ زمان] نے آپ پر تأویلی و تأئیدی علم کے کیسے کیسے عظیم خزانوں کے ابواب کھول دیئے ہیں۔ چنانچہ موصوف یو۔ایف۔اوز (U.F.Os) کے

اَسرار فاش کرنے سے پہلے فرماتے ہیں:

''اس غیبی مخلوق کی حقیقت کی راز افشائی کے لئے جسارت کرنے سے پہلے شاید مَیں اس بیان کے نتائج و انجام کا بھی خیال کر چکا ہوں کہ قبل از وقت افشائے راز کرنا، قسطاس المستقیم کے بغیر کوئی بات کہہ دینا اور سب سے بڑھ کر مذہب کے مختارِ برتر کی مرضی کے خلاف کسی بھید کا بتانا کس قدر خطرے کا کام ہوتا ہے، جس شخص کو ایسے خطرات کا خدشہ رہتا ہو اور اسے ہنوز موازینِ حقائق کے ذریعے اپنے مسئلوں کے متعلق کوئی اطمینان حاصل نہ ہوا ہو تو اسے چاہئے کہ بموجبِ حدیث ''مَنْ صَمَتَ نَجا'' [۱۸] (جو خاموش رہا اسے نجات ملی) خاموشی اختیار کرے۔'' [۱۹]

چنانچہ ہادئ برحق مولانا حاضر امام شاہ کریم الحسینی، علیہ افضل التحیۃ و السّلام، نے موصوف کی کتابوں کی اہمیت کے بارے میں ارشاد فرمایا ہے کہ ان کو وسیع پیمانے پر جماعت میں پھیلایا جائے۔ چنانچہ جناب وزیر شفیق سچیدینا ایک خصوصی ملاقات کے حوالے سے جو امام عالیمقامؑ نے استادِ گرامی کو مرحمت فرمائی تھی، ایک خط مؤرخہ ۱۶، اگست ۲۰۰۴ء، میں لکھتے ہیں:

"You will recal that Mawlana Hazir Imam was very keen that ways and means should be found whereby your learning and scholarship can recieve a wider Jamati exposure through collaboration with the Institute."

''آپ کو یاد ہوگا کہ مولانا حاضر امامؑ نہایت ہی مشتاق تھے کہ انسٹیٹوٹ کے ساتھ ہمکاری کے توسط سے ایسے وسائل و ذرائع پیدا کئے جائیں کہ جن سے آپ کا علم و فضل وسیع تر پیمانے پر جماعت کو پہنچ سکے۔'' [۲۰]

یہ اس لئے کہ اس زمانے کے جو مسائل ہمارے سامنے ہیں ان کا جواب دورِ ستر کی کتابوں میں نہیں ملتا ہے اور بزرگوار کی کتابیں دورِ قیامت کی ضرورتوں کے پیشِ نظر لکھی گئی ہیں۔

چنانچہ ان مسائل میں سے ایک یہ ہے کہ قرآنِ کریم میں ایک طرف کئی ایک آیات کی بنیاد

پر یہ ثابت ہے کہ تخلیق ایک دائمی اور مسلسل واقعہ ہے۔ مثلاً ''وَکُلٌّ فِیۡ فَلَکٍ یَّسۡبَحُوۡنَ'' (۳۶:۴۰ ؛ ۲۱:۳۳)، یعنی اور تمام چیزیں ایک ایک دائرے میں گھومتی ہیں؛ ''تُوۡلِجُ الَّیۡلَ فِی النَّھَارِ وَ تُوۡلِجُ النَّھَارَ فِی الَّیۡلِ وَ تُخۡرِجُ الۡحَیَّ مِنَ الۡمَیِّتِ وَ تُخۡرِجُ الۡمَیِّتَ مِنَ الۡحَیِّ'' (۳:۲۷)، یعنی تُو رات کو دن میں داخل کرتا ہے اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے، اور مردہ سے زندہ کو نکالتا ہے اور زندہ سے مردہ کو نکالتا ہے؛ ''وَھُوَالَّذِیۡ جَعَلَ الَّیۡلَ وَ النَّھَارَ خِلۡفَۃً'' (۲۵:۶۲)، یعنی وہ وہی (خدا) ہے جس نے رات اور دن کو آگے پیچھے آنے والے بنایا؛ ''وَتِلۡکَ الۡاَیَّامُ نُدَاوِلُھَا بَیۡنَ النَّاسِ'' (۳:۱۴۰)، یعنی اور ہم ان ایّام (زمانوں) کو لوگوں کے درمیان اَدلتے بدلتے رہا کرتے ہیں۔ اگر تخلیق کی یہی صورت ہے تو گویا کائنات کی تمام چیزیں لامحدود ہیں۔ دوسری طرف قرآنِ کریم میں ایسی آیات ہیں کہ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا کی خدائی میں ہر چیز ایک اندازے میں ہے یعنی محدود ہے، مثلاً ''اِنَّا کُلَّ شَیۡءٍ خَلَقۡنٰہُ بِقَدَرٍ'' (۵۴:۴۹)، یعنی یقیناً ہم نے ہر چیز ایک اندازے (قدر) سے پیدا کیا؛ ''وَکُلُّ شَیۡءٍ عِنۡدَہٗ بِمِقۡدَارٍ'' (۱۳:۸)، یعنی اور ہر چیز اس کے پاس ایک اندازے (مقدار) میں ہے۔ ظاہر ہے کہ دوسری آیات سے پہلی آیات کی نفی ہوتی ہے۔ تو سوال یہ ہے کہ ایک ہی چیز بیک وقت محدود و لامحدود کس طرح ہو سکتی ہے؟

اس سلسلے میں استادِ گرامی آیت ''کَیۡفَ تَکۡفُرُوۡنَ بِاللّٰہِ وَکُنۡتُمۡ اَمۡوَاتًا فَاَحۡیَاکُمۡ ثُمَّ یُمِیۡتُکُمۡ ثُمَّ یُحۡیِیۡکُمۡ ثُمَّ اِلَیۡہِ تُرۡجَعُوۡنَ'' (۲:۲۸)، یعنی کیونکہ تم خدا کا انکار کر سکتے ہو حالانکہ تم مردہ تھے، پس اس نے تم کو زندہ کیا، پھر تم کو موت دے گا، پھر تم کو زندہ کرے گا۔ پھر تم اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے، سے استنباط کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ قادرِ مطلق کی سب سے بڑی طاقت اس حقیقت میں ہے کہ وہ ضد سے ضد کو پیدا کرتا ہے اور اس بنیاد پر آپ نے ''تبادلۂ اضداد اور سلسلۂ نامتناہی'' کے نام سے ایک پُرحکمت اصطلاح بنائی ہے۔ اور اسی اصطلاح کو میزان الحقائق میں عنوان بناکر اس میں پوشیدہ حکمتوں کو اُجاگر کر دیا ہے۔[21]

نیز اسی سلسلے میں امام شناسی میں فرماتے ہیں: ''اگرچہ ہر چیز اپنی جگہ پر محدود اور ایک مقررہ مقدار میں ہے، تاہم وہ فنا و بقا یا کہ تغیر و تبدل کے دائرے پر جو چکر کاٹتی رہتی ہے، اس کے اعتبار

سے یہ کہنا درست ہے کہ ہر چیز لامحدود ہے، مثلاً دن رات دونوں محدود تو ہیں مگر ان دونوں کے تغیّر و تبدّل سے وقت کا جو دائرہ بنتا ہے وہ غیر محدود ہے۔ اسی طرح اس سے بڑا دائرہ سال کے چکر کا بنتا ہے۔ اس کے بعد بڑے بڑے زمانوں کے دائرے ہیں اور اخیر میں جاکر اس کائنات کے مٹ جانے اور پھر وجود میں آنے سے دائرہ بنتا ہے، جو لاانتہا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ہر چیز اگر ایک اعتبار سے محدود ہے تو دوسرے اعتبار سے غیر محدود ہے، اور یہی قانونِ قدرت کی تعریف ہے، کہ اس میں ابتدائی و لاابتدائی اور انتہائی و لاانتہائی کی سب خوبیاں موجود ہیں۔'' [۲۲]

تبادلۂ اضداد اور دائرۂ لامتناہی کی بنیاد پر کائنات میں تبدیلیوں میں جو وقت لگتا ہے اس لحاظ سے ادوار و اَکوار یا قیامتوں کے ناموں کا تعین کیا جاتا ہے جس میں ایک لمحہ سے بھی جلدتر وقت سے لے کر خود کائنات کے مٹ جانے اور پھر سے وجود میں آنے کا طولانی وقت لگتا ہے اور وقت کی مقدار اور کیفیات کی نسبت سے گونا گون نام دیئے گئے ہیں، جیسے:

''(۱) دائمی قیامت: یہ ہمیشہ دنیا میں روزِ اوّل سے جاری ہے۔

(۲) ہنگامی قیامت: یہ ان واقعات کا نام ہے جو قیامت کے کم وقفے میں واقع ہوتے ہیں۔

(۳) شخصی اختیاری قیامت: تزکیۂ نفس کا نام ہے۔

(۴) شخصی اضطراری قیامت: یہ ہر شخص کی جسمانی موت ہے۔

(۵) اجتماعی قیامت: یہ کسی گاؤں، شہر، ملک یا کسی حکومت کی تبدیلی ہے۔

(۶) عالمی قیامت: یہ کسی بھی شکل میں آنے والی ہے۔

اس کے علاوہ اور بھی بہت بڑی قیامتیں ہیں، مثلاً کسی سیّارے کا اپنے مدار سے ہٹ کر عالم کے حاشیہ کی طرف جانا یا حاشیہ کی طرف سے کسی سیّارے کا اندر کی طرف آنا یا سورج میں گر کر ختم ہو جانا یا سورج سے کسی سیّارے کا پیدا ہو جانا یا کُلّ عالم کا ہیولیٰ میں فنا ہو کر پھر سے پیدا ہونا، وغیرہ''۔ [۲۳]

قرآنِ کریم میں ایک لمحہ سے بھی جلد تر قیامت سے لے کر پچاس ہزار سالہ قیامت کا تنزیلی

صورت میں ذکر آیا ہے لیکن تأویلی لحاظ سے بزرگانِ دین نے اپنے روحانی تجارب و تأویلات کی روشنی میں اس سے کہیں زیادہ طویل اور بڑی تبدیلیوں والی قیامتوں کا ذکر کیا ہے۔ چنانچہ استادِ گرامی کلمۂ تامّہ ''تھلا تھلا تھلا نی + تھلا تھلا تھلا ژُو (آہستہ آہستہ آہستہ جاؤ + آہستہ آہستہ آہستہ آؤ) جو آپ نے حضرتِ عالیہ عائشہ بیگم (قس) جو ایک عظیم فرشتہ بن چکی تھیں، سے سُنا تھا، کے بارے میں لکھتے ہیں کہ چونکہ یہ کلمۂ تامّہ ہے لہٰذا اس کی کئی قرأتیں اور تأویلیں ہو سکتی ہیں۔ چنانچہ ایک قرأت ''تھلا(ک) تھلا(ک) تھلا(ک) نی + تھلا(ک) تھلا(ک) تھلا (ک)ژوٗ''، (سو لاکھ سو لاکھ سو لاکھ (تین کروڑ) برس میں جاؤ + سو لاکھ سو لاکھ سو لاکھ (تین کروڑ) برس میں آؤ) بھی ہو سکتی ہے۔[۲۴] اور اس کی ایک تأویل ایک نہایت ہی عظیم روح کا عالمِ امر اور عالمِ خلق کے درمیان دائرۂ اعظم کی مسافت جو چھ کروڑ برس کی ہے، کو طے کرنا ہے۔ چنانچہ اس عظیم واقعہ سے مربوط آیت: ''وَمَنْ نُّعَمِّرْهُ نُنَكِّسْهُ فِي الْخَلْقِ ط اَفَلَا يَعْقِلُوْنَ'' (۳۶:۶۸)، یعنی اور ہم جس کو زیادہ عمر دیتے ہیں اس کو (عالمِ امر سے عالمِ) خلق میں اوندھا کر دیتے ہیں تو کیا وہ لوگ نہیں سمجھتے؟ کی تأویل میں فرماتے ہیں کہ جس [عظیم روح] کو روحانی عالم میں بڑی سے بڑی عمر دی جاتی ہے اُس کو اِس دنیا میں کسی بڑے کارنامے کے لئے بھیجا جاتا ہے۔[۲۴] نیز رایل بنگلوز اِن پیراڈائز (Royal Bungalows in Paradise) مقالہ ۲۱۹ میں ''اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ'' (۸۱:۱)، یعنی جس وقت سورج کو لپیٹا جائے گا، کی تاویل میں بھی اسی عظیم واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس آیت میں مادّی سورج کے خاتمے کا ذکر ہے۔ مادّی سورج کے خاتمے پر ایک [نئے] دَور کا آغاز ہوگا اور ایک اندازے کے مطابق چھ کروڑ سال تک سورج کی عمر ہے۔ الغرض خدا کی خدائی میں چھوٹے سے چھوٹے اور بڑے سے بڑے اَدوار کا سلسلہ اسی طرح جاری ہے۔

خدا کی خدائی میں ''تبادلۂ اضداد'' کے نتیجے میں ''دائرۂ لامتناہی'' کے اثبات کے بعد اصل موضوع کی طرف آتے ہیں جو ''انائے سفلی کے صعودی اور نزولی سفر'' سے متعلق ہے۔ جہاں تک روحِ انسانی کے سفر کا تعلق ہے خود قرآنِ کریم میں آیت: ''وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى'' (۲:۱۹۷)، یعنی زادِ

راہ لو اور بہترین زادِ راہ پرہیزگاری ہے، سے روحانی سفر ثابت ہے اور دورِ ستر میں بھی بزرگانِ دین نے اس موضوع پر لکھا ہے۔ چنانچہ سیدنا ناصر خسرو (قس) نے اس موضوع پر ایک ضخیم کتاب زاد المسافرین کے نام سے لکھی ہے اور اس کی اساسی اہمیت کے پیشِ نظر اس کو معقولات کی ''اصل و قانون'' قرار دیا ہے۔[۲۵] لیکن اس کے باوجود پیر ناصر (قس) نے بھی اپنے وقت کے تقاضوں کے پیشِ نظر روح کے دو سِروں یا دو اَناؤں (علوی و سفلی) سے حجاب نہیں اُٹھایا ہے، بلکہ اس کو ایک اکائی کے طور پر پیش کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر انسانی روح کو ایک اکائی کے طور پر تسلیم کیا جائے تو اس کے سفر کے بارے میں کچھ اساسی سوالات لاینحل رہتے ہیں، مثلاً آیت استرجاع ''اِنَّـا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ'' (۲:۱۵۶)، یعنی بیشک ہم اللہ ہی کے ہیں اور اس کی طرف جانے والے ہیں، کے بارے میں سؤال پیدا ہوتا ہے کہ اگر ہم دنیا میں آنے سے پہلے اللہ ہی کے تھے تو اس بلند و بالا مرتبے میں ہمیں کس نعمت کی کمی تھی جس کے حصول کی خاطر ہمیں یہاں آنا پڑا، وغیرہ۔ اَلْحَمْدُلله! آج دورِ قیامت میں علمی قحط نابود ہو چکا ہے اور علمِ قیامت کی روشنی میں دیکھیں گے کہ اس مقدس علم کے انکشافات سے کس طرح لاینحل سؤالات بڑی آسانی کے ساتھ حل ہوتے جا رہے ہیں جن میں سے ایک روحِ انسانی کے دو سِروں یا دو اناؤں کا انکشاف ہے۔

جہاں تک روحِ انسانی کے دو سِروں کی اہمیت کا سؤال ہے، سطورِ بالا میں ہم نے دیکھا کہ خدا کی خدائی میں سوائے ذاتِ سبحان کے تمام اشیاء ازواج یا جفتوں کی صورت میں ہیں۔ ان کا وجود ایک ساتھ ہے، دونوں میں کوئی تقدم و تأخر زمانی نہیں اور دونوں ایک دوسرے کے محتاج ہیں۔ ان جفتوں میں سے ایک عالمِ امر اور عالمِ خلق کا بھی ہے، بلکہ حقیقت میں یہی جفت تمام جفتوں کی بنیاد ہے۔ ان کی اس باہمی احتیاج کے بارے میں استادِ گرامی آیت ''وَاَقِيْـمُـوا الْـوَزْنَ بِـالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْمِيْزَانَ'' (۵۵:۹)، یعنی اور [حقائق کے] وزن قسط کے ساتھ برابر رکھو اور ترازو میں کمی نہ کرو، کی تأویل کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''عقلِ سلیم کے لئے یہ نکتہ پسندیدہ ہوگا کہ جتنی آخرت ضروری ہے اتنی دنیا بھی ضروری ہے، کیونکہ دنیا ہی تو آخرت کی کشت گاہ ہے، اس میں کچھ بوئے بغیر وہاں کوئی کیا

فصل کاٹے گا، اور اگر دنیا کے بارے میں کوئی ایسا حکم کیا گیا ہو جس سے دنیا کی کچھ اہمیت نہ ہو تو یہ جاننا ضروری ہے کہ ایسے امر کا اطلاق ان لوگوں کے احوال پر ہے، جن کا نصب العین محض دنیاوی ہو اور وہ آخرت سے غافل ہوئے ہوں، اس لئے کہ دنیا کلیّۃً شر نہیں اور نہ آخرت کلیّۃً خیر ہے۔ جس طرح دنیا میں بھلائی اور برائی دونوں موجود ہیں، اسی طرح آخرت میں ثواب و عقاب دونوں موجود ہیں، دنیا کی بھلائی و برائی اور آخرت کے ثواب و عقاب کا انحصار انسان کے اپنے اعمال پر ہے، پس جو کچھ بھی دنیا و آخرت کے متعلق فرمایا گیا ہے وہ انسانوں کے اعمال کی نسبت سے فرمایا گیا ہے۔''[۲۶]

جفتوں کی باہمی احتیاج اور دونوں میں خداوندی مساوات کے سلسلے میں استادِ گرامی ایک اور کلیہ کی طرف توجہ دلاتے ہوئے لکھتے ہیں کہ: ''قانونِ فطرت یا قدرت کا ارادہ ایسا ہے کہ ہر چیز کی ارتقاء حدِ کمال کے بعد رُو بزوال ہو جائے اور ہر زوال از سرِ نو رُو بکمال ہو جائے۔''[۲۷] یعنی یہ بھی اسی بے بدل قانون کی طرح ہے جس کے مطابق وہ ضدّ سے ضدّ کو پیدا کرتا ہے۔

مذکورۂ بالا بیان میں استادِ گرامی نے آنحضرتؐ کی حدیث ''اَلدُّنْیَا مَزْرَعَۃُ الْاٰخِرَۃ''، یعنی دنیا آخرت کی کھیتی ہے،[۲۸] کے حوالے جو فرمایا کہ ''اس میں کچھ بوئے بغیر وہاں کوئی کیا فصل کاٹے گا''، سے ظاہر ہے کہ خدا نے دنیا یا عالمِ خلق کو آخرت یا عالمِ امر کی کمائی اور خوشی کا وسیلہ بنایا ہے۔[۲۹]

عالمِ امر اور عالمِ خلق کی باہمی نیازمندی کو ریشم کے کیڑے کی مثال سے اور زیادہ واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''ریشم کے کیڑے کو دیکھیں، جو وقت آنے پر تبدیل ہوکر پروانہ بن جاتا ہے، پھر وہ انڈے سے ہوکر کیڑا بن جاتا ہے۔ اس میں اہلِ دانش کے لئے دائرۂ لطیف و کثیف کا اشارہ موجود ہے، کہ انسان کثیف سے لطیف ہوکر پرواز کرتا ہے، اور اس پر خدا کی کیسی بے پایان برکت ہے کہ پھر عمل کی غرض سے جسمِ کثیف کا لباس پہنتا ہے، جیسے پروانہ ریشم کو پیدا نہیں کر سکتا ہے، لہٰذا وہ اس مقصد کے لئے کیڑا بن جاتا ہے۔''[۳۰]

مذکورۂ بالا بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ جنّت الاعمال بنانے کے لئے عالمِ امر سے عالمِ خلق میں

نزول اور عالمِ خلق سے عالمِ امر کی طرف رجوع کا سلسلۂ نامتناہی جاری ہے، جیسا کہ سورۂ قدر (۹۷:۴) اور سورۂ معارج (۷۰:۴) اور دوسری بہت سی آیات سے ظاہر ہے۔ وہ آیات جن کے تأویلی حقائق سے اس موضوع پر روشنی پڑتی ہے، ایک یہ ہے: ''وَمَنۡ نُّعَمِّرۡهُ نُنَكِّسۡهُ فِى الۡخَلۡقِ ط'' (۳۶:۶۸)، یعنی اور ہم جس کو لمبی عمر دیتے ہیں اس کو [عالمِ امر سے عالمِ] خلق میں سرنگون کر دیتے ہیں۔ اس کی تأویل میں، جیسا کہ قبلاً ذکر ہوا ہے، استادِ گرامی فرماتے ہیں کہ ''جس کو روحانی عالم میں بڑی سے بڑی عمر دی جاتی ہے اس کو اس دنیا میں کسی بڑے کارنامے کے لئے بھیجا جاتا ہے۔''[۳۱] دوسری اہم آیت اس سلسلے میں یہ ہے ''لَتَرۡكَبُنَّ طَبَقًا عَنۡ طَبَقٍ'' (۸۴:۱۹)، یعنی تمہیں ایک طبق سے دوسرے طبق چڑھا دیا جائے گا۔ اس کی تأویل میں استادِ گرامی فرماتے ہیں کہ: ''خدائے حکیم جو ساری کائنات کا بادشاہِ مطلق ہے اس آیت میں نہ صرف روحانی اور خاکی انسانوں کو یہ فرماتا ہے کہ تم روحانی نیچے آؤ گے اور یہ خاکی اوپر جائے گا، بلکہ اس میں تمام سیّارے بلکہ جملہ کائنات کے عروج و نزول کا فرمان بھی نافذ کرتا ہے، کیونکہ پادشاہِ یگانہ کے متحدہ ملک (عالم) میں جزو و کُلّ کے لئے ایک ہی قانون ہے۔''[۳۲]

انسان کے صعودی اور نزولی سفر کا سب سے نمایاں ذکر ایک ساتھ سورۂ تین میں آیا ہے۔ چنانچہ ربُّ العزت فرماتا ہے: ''لَقَدۡ خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ فِىۡۤ اَحۡسَنِ تَقۡوِيۡمٍ – ثُمَّ رَدَدۡنٰهُ اَسۡفَلَ سٰفِلِيۡنَ'' (۹۵:۴-۵)، یعنی یقیناً ہم نے انسان کو بہترین تقویم میں پیدا کیا ہے، پھر ہم نے اسے پست ترین مقام کی طرف لوٹایا ہے۔ ان آیات کی تأویل میں استادِ بزرگوار فرماتے ہیں: ''ان آیات میں سارے انسانوں کے لئے حکمِ کُلّی ہے جو فرماتا ہے کہ انسان کو ایک بہترین ترتیب میں پیدا کیا گیا اور زندگی کے بامِ عروج پر چڑھا دیا اور پھر اسے پست ترین مقام میں لایا گیا ہے۔ اگر یہ حقیقت مان لی جائے کہ اس فعلِ خدا کا اطلاق روحانی اور خاکی دونوں قسم کے انسانوں پر واقع ہو چکا ہے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ روحانی انسان کو موجودہ حالت کے برعکس اعلیٰ علّیّین سے اسفل سافلین لایا گیا تھا اور خاکی انسان کو موجودہ حالت کے برعکس اسفل سافلین سے اعلیٰ علّیّین پہنچایا گیا تھا، کیونکہ ان دونوں قسم کے انسانوں میں سے کسی ایک کو

تقدمِ زمانی کا فضل ثابت نہیں، ان دونوں پر احسنِ تقویم سے پیدا کرنے اور اسفل سافلین واپس بلانے کا فعل بلاامتیاز ختم ہو چکا ہے۔[۳۳]

سطورِ بالا سے انسان کا سفر عالمِ امر میں اعلیٰ علّیّین اور عالمِ خلق میں اسفل سافلین کے درمیان ایک جاری و ساری ناقابلِ تردید حقیقت ہے۔ سؤال یہاں صرف انسان کے بارے میں پیدا ہوتا ہے کہ آیا اعلیٰ علّیّین تک پہنچنے کا یہ عظیم مرتبہ تمام انسانوں کے لئے یکسان طور پر ممکن ہے یا اس میں کوئی اختصاص ہے؟ یہ اس لئے کہ انسانوں میں سے بعض بقول قرآن: ''اُولٰٓئِکَ کَالْاَنْعَامِ بَلْ ھُمْ اَضَلُّ ط'' (۱۷۹:۷)، یعنی وہ لوگ چوپایوں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ ہیں۔ اس سلسلے میں استادِ گرامی کے ارشادات سے جو نتیجہ نکلتا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ نفوسِ جزوی کے علّیّین تک رسائی کے امکان سے پہلے عالمِ امر اور عالمِ خلق کی خصوصیات جاننے کی ضرورت ہے۔ چنانچہ عالمِ امر عالمِ وحدت ہے اور عالمِ خلق عالمِ کثرت ہے۔ لہٰذا ہر چند کہ نفوسِ جزوی میں سے ہر ایک کو عالمِ امر تک رسائی کا امکان تو ہے لیکن کثرت کی صورت میں نہیں صرف وحدت کی صورت میں۔ اس لئے کہ وحدت میں کثرت کی کوئی گنجائش نہیں۔ اگر کثرت وہاں جاتی ہے تو وحدت بن کر جاتی ہے۔

نفوسِ جزوی کے عالمِ امر میں جانے کی دو صورتیں ہیں: ایک تو یہ کہ نفوسِ جزوی میں سے ایک ''احسنِ تقویم'' کی قیامت انگیز ارتقائی سیڑھی سے علم و عمل کے زینوں سے گزرتے ہوئے عرشِ وحدت یا عرشِ مساوات تک پہنچ کر نفسِ واحدہ بن جائے تو ایسی صورت میں یہی نفس ''یٰٓاَیَّتُھَاالنَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّۃُ – ارْجِعِیٓ اِلٰی رَبِّکِ رَاضِیَۃً مَّرْضِیَّۃً – فَادْخُلِیْ فِیْ عِبٰدِیْ – وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ '' (۸۹:۲۷-۳۰)، یعنی اے اطمینان یافتہ نفس! تُو اپنے پروردگار کی طرف لوٹ جا، تُو اس سے راضی وہ تجھ سے راضی۔ پس تُو میرے بندوں میں داخل ہو اور میری جنت میں داخل ہوجا، کے فرمان کے مطابق کمالِ مسرت و شادمانی کے ساتھ عالمِ امر میں علّیّین میں داخل ہو جاتا ہے۔ چونکہ یہ نفسِ جزوی اب نفسِ واحدہ بن گیا ہے تو اب یہ صرف ایک نہیں بلکہ ایک کرنے والا بھی بن گیا ہے۔ اس لئے اس نے پوری کائنات کو لطیف صورت میں اپنے ساتھ ایک کرکے عالمِ وحدت میں داخل ہو جاتا ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ اگر نفسِ جزوی کمال حاصل نہ کر سکا تو اس صورت میں نفسِ واحدہ میں فنا ہوکر عالمِ وحدت میں داخل ہوگا۔ یہاں پر پھر دو صورتیں ہیں: اگر نفسِ واحدہ میں طوعاً یعنی اپنی خوشی سے فنا ہوگیا تو اس کو حسبِ اطاعت درجاتِ عالیہ سے نوازا جائے گا، اور اگر کرھاً یعنی بغیر رضامندی اور اطاعت کی زبردستی کے ساتھ فنا کر دیا گیا تو اس کو عالمِ وحدت کی خوشیوں اور مسرتوں کا شعور نہیں ہوگا۔ بلکہ وقتی طور پر بقدر معصیت و نافرمانی اس کو عذاب سے گزرنا پڑے گا۔ لیکن عذاب کے ذریعے تطہیر کے بعد عالمِ وحدت کی شادمانیوں کا شعور ہوگا۔ الغرض پہنچنے کا امکان یکسان طور پر سب کو ہے لیکن تجربے کے لحاظ سے اختصاص ہے اور اس اختصاص کا انحصار علم و عمل اور اطاعت و معصیت پر ہے۔

چنانچہ عالمِ امر سے نفوسِ جزوی کے وحدت کی صورت میں آنے جانے کے بارے میں کئی ایک قرآنی آیات ہیں، مثلاً آیت ''مَا خَلْقُكُمْ وَلَا بَعْثُكُمْ اِلَّا كَنَفْسٍ وَّاحِدَةٍ ط'' (۲۸:۳۱)، یعنی اور نہیں ہے تم سب کی پیدائش اور تم سب کا انبعاث سوائے ایک ہی نفس کے۔ یقیناً یہ عالمِ امر یا عالمِ وحدت کے لحاظ سے ہے کہ خدا نے عالمِ امر میں بطریقِ ابداع ایک ہی نفس کو پیدا کیا کہ جس میں دوسرے تمام نفوس مجموع تھے۔ جیسا کہ فرماتا ہے کہ اس نے تمام نفوسِ خلائق کو ایک ہی نفس یعنی نفسِ واحدہ سے پیدا کیا (۱:۴ ؛ ۹۸:۶ ؛ ۱۸۹:۷ ؛ ۶:۳۹)۔ یہی نفسِ واحدہ جب دنیا میں آیا جو عالمِ خلق اور عالمِ کثرت ہے، تو اس سے بہت سے نفوس پیدا ہوگئے (۱:۴)۔ گویا خدا نے وحدت سے کثرت کو پیدا کیا۔ اب بعث یا انبعاث کی صورت میں، جس سے مراد نفوسِ جزوی کا واپس عالمِ امر کی طرف جانا ہے، خدا فرماتا ہے کہ جس طرح دنیا میں آتے وقت ایک ہی نفس کی طرح آئے تھے، واپس جاتے وقت بھی ایک ہی نفس کی طرح جاؤ گے، یعنی ایک ہی نفس میں سب کو فنا یا مدغم ہوکر جاؤ گے، جیسا کہ فرماتا ہے: ''وَلَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰى كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ'' (۹۴:۶)، یعنی اور یقیناً تم ہمارے پاس ایک ایک ہو کے آئے جس طرح ہم نے تم کو پہلی بار (نفسِ واحدہ) سے پیدا کیا تھا۔ نفوسِ خلائق کی پیدائش اور ان کا انبعاث ایک ہی نفس کی طرح ہونے کی تعلیم میں ان کے لئے بہت بڑی مسرت افزا بشارت

ہے کہ ان حوصلہ شکن ظاہری اور ہنگامی اختلافات کے باوجود ان کی ایک ازلی و ابدی وحدت بھی ہے۔ اس وحدت کو عالمِ کثرت میں آنے کے بعد بھول گئے تھے، لیکن علم و عمل کے ذریعے حجابات کے اُٹھنے کے بعد ان کو اپنی اصلی حقیقت کا علم ہوگا اور ان کو بہت بڑی شادمانی ہوگی۔ اس عظیم مقام کے بارے میں استادِ گرامی فرماتے ہیں:

اُیُم دِشَن ئیذٗ با ایلے سِس اُیون ببربان   ازلے ببر بَم جُوَن ابدے ببر بُٹ اُیَم

ترجمہ: مَیں نے ایک اعلیٰ مقام کو دیکھا ہے جہاں سارے لوگ یکسان اور برابر ہیں، جس طرح ازل میں سب برابر اور ایک تھے اسی طرح ابد میں بھی تمام انسانوں کا مساواتِ رحمانی کے تحت ایک ہو جانا زبردست شیرین بات ہے۔ [۳۴]

یہ وہ بلند ترین مقام یا علّیّین ہے کہ جہاں نہ صرف نفوسِ جزوی کے درمیان مساوات ہے بلکہ عبد اور معبود کے درمیان بھی فاصلہ ختم ہو جاتا ہے اور کامیاب اور اطمینان یافتہ نفس ''قَـابَ قَـوْسَیْـنِ'' (۹:۵۳) سے گزر کر ''اَوْ اَدْنٰـی'' (۹:۵۳) تک پہنچ جاتا ہے جو عابد و معبود یا بندہ اور مولا کی وحدت کی جگہ ہے۔ جیسا کہ استادِ گرامی فرماتے ہیں:

مَولا که بنده هِن بمه اَسراره اَرشَیَم

یعنی مَیں مولا اور بندہ کے ایک ہونے کے اَسرار سے [آگاہ ہوکر] مست ہوگیا۔ [۳۵]

یہی وہ مقام ہے جہاں مولا اپنے بندے سے مولا کی طرح ہیبت ناک حیثیت میں نہیں بلکہ رفیقِ اعلیٰ کی حیثیت میں رفاقت اور دوستی سے پیش آتا ہے، اور طالبِ حقیقت کو اس حقیقت کا علم ہو جاتا ہے کہ وہ ازلی طور خدا کا مثل اور کلمۂ امکان کا مالک رہا ہے۔

خدا چاہتا ہے کہ عالمِ خلق سے جو دارالعمل ہے اور سخت محنت و مشقت کی جگہ ہے، تمام نفوسِ جزوی واپس عالمِ امر پہنچ جائیں جو خوشیوں اور شادمانیوں کی جگہ ہے۔ لیکن ساتھ ساتھ خدا یہ بھی جانتا ہے کہ عالمِ خلق میں آنے کے بعد جسمانی کثافت کے خواب سے وہ دوچار ہو جائیں گے اور اپنے اصل عالم کو بھول جائیں گے۔ جیسا کہ آنحضرت نے فرمایا: ''اَلـنَّـاسُ نِیَـامٌ فَـاِذَا مَـاتُوا انْتَبَهُوَا''، [۳۶] یعنی

لوگ اِس وقت سوئے ہوئے ہیں، جب مر جائیں گے تو جاگ جائیں گے۔ چنانچہ ربّ العزّت نے کمالِ مرحمت سے نفوسِ خلائق کو جگانے کے لئے ''احسنِ تقویم'' کی ارتقائی سیڑھی کو مقرر کیا۔ تقویم، جس کے لفظی معنی سیدھا کرنا ہے، ایک نہایت ہی حکمت آگین اصطلاح ہے۔ لفظِ تقویم لفظی لحاظ سے قَامَ یَقُومُ سے تفعیل کے وزن پر ہے۔ یہی بنیادی حروف یا مادّہ قیامت کا بھی ہے۔ اس سے مراد ایک ایسی تعلیم یا ہدایت ہے جس پر کماحقہ عمل کرنے یا چلنے کے نتیجے میں قیامت برپا ہو جاتی ہے، اور سالک عالمِ امر میں داخل ہو کر عارف ہو جاتا ہے۔

اس کے ساتھ یہاں پر احسن کی حکمت کو بھی سمجھنے کی ضرورت ہے اور وہ یہ ہے کہ عالمِ خلق میں زمان و مکان کے الگ الگ حالات میں پرورش پانے کی وجہ سے نفوسِ جزوی کی الگ الگ درجات میں ہیں۔ لہٰذا اُن کی روحانی و عقلانی ترقی کے لئے ایک ہی نہج پر تعلیم و ہدات کارآمد نہیں ہو سکتی۔ اس لئے خدا نے ان سب کے حسبِ حال ترقی کے لئے درجہ وار نظام مقرر کیا، جو نہایت ہی ''احسن'' یا بہترین نظام ہے۔

چنانچہ درجات کا ذکر قرآنِ حکیم میں جابجا آیا ہے۔ خاص کر آیت ''رَفِیۡعُ الدَّرَجٰتِ ذُوالۡعَرۡشِ'' (۴۰:۱۵)، یعنی درجات کا بلند کرنے والا عرش کا مالک، سے ثابت ہے کہ یہ درجات عرشِ اعلیٰ تک جا پہنچتے ہیں۔[۳۷]

ان درجوں کی تعداد کے سلسلے میں استادِ گرامی فرماتے ہیں کہ یہ الگ الگ مثالوں کے اعتبار سے مختلف ہو سکتی ہے۔ تاہم آیت (۷۰:۴): ''تَعۡرُجُ الۡمَلٰٓئِکَةُ وَالرُّوۡحُ اِلَیۡهِ فِیۡ یَوۡمٍ کَانَ مِقۡدَارُهٗ خَمۡسِیۡنَ اَلۡفَ سَنَةٍ''، یعنی فرشتے اور روح اس کی طرف چڑھتے ہیں ایک ایسے دن میں جس کی مقدار پچاس ہزار سال ہے، کی روشنی میں صرف انسانی سطح کے لحاظ سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ درجات پچاس ہزار برس پر محیط ہیں، یعنی ایک دُور افتادہ انسان کو فنا فی اللہ ہو جانے کے لئے روح اور عقل کے پچاس ہزار زینوں سے چڑھ جانا پڑتا ہے۔ پچاس ہزار سال کی مسافت ایک ایسے شخص کی نسبت سے ہے جو مرتبۂ حق الیقین یا فنا فی اللہ سے بہت دُور افتادہ ہے، لیکن ایسا کوئی شخص حدودِ دین کی اس ارتقائی سیڑھی سے

وابستہ ہو جائے اور کماحقہٗ ان کی اطاعت کرے، تو بہت قلیل وقت میں یہ مسافت طے کر سکتا ہے۔ یہ درجات حدودِ دین ہیں جن کے آخری درجات میں چار اصولِ دین اساس، ناطق، نفسِ کُلّ اور عقلِ کُلّ ہیں جن کی عظمت کی قسم سورے کے شروع میں کھائی گئی ہے۔ استادِ گرامی فرماتے ہیں کہ اس پُرحکمت قسم کا ایک بڑا مقصد بھی ہے اور ایک خاص نسبت بھی۔ مقصد امکانی عروج و ارتقاء کی طرف بھرپور توجہ دلاتا ہے اور مناسبت یہ ہے کہ روحانی و عقلانی ترقی کا انحصار چار اصل کی معرفت پر ہے۔

آخر میں یہ دیکھنا ہے کہ انسان کی ''انا'' کو علوی اور سفلی دو اناؤں میں کیوں تقسیم کیا گیا ہے؟ اور عالمِ امر اور عالمِ خلق کے مابین صعودی اور نزولی سفر کو انائے سفلی سے کیوں نسبت دی گئی ہے؟ اس بارے میں یہ جاننا ضروری ہے کہ دینِ حق کے اساسی حقائق و معارف ہر چند کہ دورِ ستر اور دورِ کشف میں ایک ہی ہوتے ہیں لیکن خداوندی حکمت و مصلحت کے تحت دورِ ستر میں ان کو حجابات میں رکھا جاتا ہے اور پھر اتمامِ نور کے اعتبار سے دورِ کشف تک ان سے حجابات کو بتدریج ہٹایا جاتا ہے۔ دورِ کشف میں خدا کا نور مکمل ہو جاتا ہے اور حقائق کو جامۂ تمثیل اور حجابِ تشبیہ کے بغیر تأویلِ محضِ مجرّد کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ نیز جاننا چاہئے کہ دینِ اسلام شریعت، طریقت، حقیقت اور معرفت کا مجموعہ ہے۔ زمانۂ رسول سے لے کر قیامت تک دور کو ان چار درجوں پر تقسیم کیا گیا ہے۔ اس میں سب سے پہلے شریعت پر زور دیا جاتا ہے اور پھر بتدریج طریقت، حقیقت اور معرفت یعنی قیامت پر۔[۳۸] اس وضاحت کا مقصد یہ ہے کہ انسان کی دو اناؤں کا تصور دین میں کوئی نئی بات نہیں بلکہ اساسی حقائق کے طور پر پہلے سے ہیں، صرف ان کا انکشاف قیامتی علم کے برکات میں سے ہے۔ جیسا کہ آیات (۹۸:۶ ؛ ۸۱:۱۶ ؛ ۳۶:۳۶ ؛ ۸۱:۷) میں یہ حقیقت مضمر ہے۔

چنانچہ استادِ گرامی اس سلسلے میں فرماتے ہیں کہ جب انسان معرفت کے درجۂ کمال پر پہنچ جاتا ہے تو اس کو اس حقیقت کا پورا پورا یقین حاصل ہو جاتا ہے کہ اس کی انا دو درجوں میں ہے: وہ سورج کی طرح ہمیشہ ایک حال پر قائم بھی ہے اور چاند کی طرح گھٹتے بڑھتے ہوئے بار بار آتا جاتا بھی ہے، کیونکہ حکمت اور خیرِ کثیر کا تقاضا یہی ہے۔[۳۹] مزید فرماتے ہیں کہ انسان کی ''انا'' بظاہر ایک

مانی جاتی ہے، لیکن روحانی علم کی روشنی میں تحقیق کی گئی ہے کہ انائے علوی اور انائے سفلی دو ہیں، کیونکہ قرآنِ کریم فرماتا ہے کہ ایک تو اصل چیز ہے اور دوسرا اس کا سایہ (۸۱:۱۶)، چنانچہ وہ انسانی حقیقت جو عالمِ علوی (عالمِ امر) سے ازلی و ابدی وابستگی رکھتی ہے، اور لمحہ بھر کے لئے بھی الگ نہیں ہو سکتی، انائے علوی کہلاتی ہے، اور اس کا سایہ جو عالمِ خلق میں آیا ہے، انائے سفلی ہے۔[۴۰]

چنانچہ حضرتِ آدم علیہ السّلام کی علوی و سفلی دو انائیں تھیں۔ انائے علوی کے اعتبار سے خدا نے حضرتِ آدمؑ اور دوسرے تمام اہلِ جنت کے بارے میں فرمایا: ''وَهُمْ فِيهَا خٰلِدُوْنَ'' (۲:۲۵)، یعنی وہ ہمیشہ کے لئے جنت میں ہیں۔ اور انائے سفلی کے اعتبار سے فرمایا: ''اِهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا '' (۲:۳۸)، یعنی اس سے تم سب کے سب نیچے اُتر جاؤ۔[۴۱]

پس اکثر لوگوں نے خلیفۂ خدا کو نہیں پہچانا، جیسا کہ پہچاننے کا حق ہے، آپؑ میں خدائی روح پھونک دی گئی تھی، روح کہیں یا نور، اس کے جسمِ بشری میں آنے کی مثال ایسی ہے، جیسے آسمان میں خورشید انور اور زمین پر کسی آئینے میں اس کا عکس۔[۴۲] اب جہاں تک عالمِ امر (آخرت) اور عالمِ خلق (دنیا) میں صعودی و نزولی سفر کی انائے سفلی سے نسبت کا سؤال ہے۔ مذکورۂ بالا وضاحت سے ظاہر ہے کہ چونکہ انائے علوی آفتابِ عالمتاب کی طرح اپنی جگہ پر قائم اور دائم ہے۔ اور یہ انائے سفلی ہی ہے جو سورج کی کرنوں یا چاند کی طرح گھٹتے بڑھتے ہوئے بار بار دنیا میں بار بار آتی اور واپس عالمِ امر واپس جاتی رہتی ہے، اس لئے سفر کی نسبت انائے سفلی سے دی گئی ہے۔

بیانِ بالا سے ظاہر ہے کہ انسانی روح کی دو اَناؤں کی روشنی میں وضاحت سے روح کے دنیا میں نہ ایک بار آنے پر اور نہ بار بار آنے پر اصرار کی ضرورت باقی رہتی ہے، اور نہ ہی آیۂ استرجاع کی بنیاد پر خدا کے حضور سے کیوں آنے کا سؤال باقی رہتا ہے۔ حضرتِ آدمؑ اور دوسرے تمام اہلِ بہشت کے بارے میں قرآنِ حکیم کی روشنی میں جو وضاحت کی گئی ہے کہ انائے علوی کے اعتبار سے وہ سب ہمیشہ کے لئے عالمِ امر یا بہشت میں ہیں (وَهُمْ فِيهَا خٰلِدُوْنَ، ۲:۲۵)، اور صرف انائے سفلی کے لحاظ سے حکم ہوا کہ تم بہشت سے نیچے اُتر جاؤ (اِهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا، ۲:۳۸)۔ اس میں یقیناً تمام سوالات کے

تسلّی بخش جوابات موجود ہیں۔ انائے علوی اور انائے سفلی کے اعتبارات سے استادِ گرامی یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ اگر ہم بہشت سے نکل کر دنیا میں آئے ہی نہیں ہیں اور یہ ظاہری وجود (انائے سفلی) اُس ہستی (انائے علوی) کا سایہ ہے، تو ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہوں گے کہ ہمارا سایہ ازل سے عالمِ امر اور عالمِ خلق کے درمیان دائرۂ اعظم پر گردش کر رہا ہے، اور پروردگارِ عالم کی لاتعداد نعمتوں کے حصول کا طریقہ بس یہی ہے، کیونکہ دنیا ہی آخرت کی کھیتی باڑی ہے۔ اَلْحَمْدُللهِ عَلٰی مَنِّهٖ وَاِحْسَانِهٖ۔

فقیر حقیر

مرکزِ علم و حکمت، لندن

۱۳، جون ۲۰۱۳ء

اَلْحَمْدُللهِ! یہ مقالہ جو حضرتِ استادِ بزرگوار کی حکمت و معرفت آگین کتابوں پر مبنی ہے۔ آج حضرتِ قائم القیامت، علینا منہ السلام، کے بابرکت و پُرسعادت یومِ ولادت کے موقع پر شکستہ بستہ اختتام پذیر ہؤا۔ بندۂ حقیر کی دلی خواہش تھی کہ استادِ بزرگوار کے مبارک و مسعود یومِ ولادت پر عاجزانہ ہدیہ کے طور پر پیش کرے، لیکن نہایت افسوس کے ساتھ بروقت ختم کرنے سے قاصر رہا۔ اگر از راہِ مرحمت تأخیراً قبول ہو جائے، زہے شفقت و سعادت!

<u>یادداشتہا:</u>

نوٹ: جن کتابوں کے مصنف کا ذکر نہیں وہ سب استادِ بزرگوار حضرتِ علّامہ نصیرالدّین نصیؔر صاحب، ہونزائی، دامت فیوضاتہ کی ہیں۔

(۱) میزان الحقائق (کراچی، ۲۰۰۷)، صص ۶۷-۶۹؛ سوسوال (کراچی، ۱۹۷۸)، صص ۸-۱۲؛ قرآنی مینار (کراچی، ۲۰۰۵)، صص ۱۱۸-۱۲۰؛ قوانینِ قرآن (کراچی، ۱۹۹۳)، صص ۲۶-۲۷، ۲۹-۳۰

(۲) سیدنا ناصر خسرو، دیوانِ اشعار، تصحیح مجتبی مینوی (تہران، ۱۳۶۷ ہجری شمسی)، ص ۲۶۲

(۳) سیدنا قاضی نعمان، دعائم الاسلام، جلدِ اول، تحقیق آصف بن علی اصغر فیضی (قاہرہ، ۱۹۶۳)، صص ۴۸-۴۹

(۴) مولانا سلطان محمد شاہؑ، اسماعیلیہ مشن کانفرنس، دارالسلام، ۱۹۴۵

(۵) اسماعیل بخاری، صحیح البخاری (ریاض، ۱۹۹۷)، ص ۱۲۰۷، حدیث ۶۹۹۶

(۶) مولانا سلطان محمد شاہؑ، کلامِ امامِ مبین (بمبئی، ۱۹۵۰)، حصۂ اول، کچھمندرا، فرمان ۸۱، ۲۲، نومبر ۱۹۰۳ء

(۷) ایضاً، جام نگر، فرمان ۵۶، ۱۵، اپریل ۱۹۰۰ء

(۸) ایضاً، حصۂ دوم، دارالسلام، فرمان ۳۷۹، ۱۵، فروری ۱۹۳۷ء

(۹) ایضاً، حصۂ اول، بمبئی، فرمان ۲، ۸، ستمبر ۱۸۸۵ء

(۱۰) ایوانف (مصحح)، اُمُّ الکتاب، Islam, XXXII، صص ۳-۹

(۱۱) پیر شہاب الدین شاہ الحسینی، رسالہ درحقیقت دین (بمبئی، ۱۹۴۶)، ص ۳۸

(۱۲) سیدنا جعفر بن منصور الیمن، کتاب الزکوٰۃ، (مخطوطہ)

(۱۳) سیدنا ناصر خسرو، جامع الحکمتین، تصحیح ہنری کربین / محمد معین (تہران / پیرس، ۱۹۵۳)، صص ۱۶۳-۱۶۶

(۱۴) ر۔شتروطمان (مصحح)، اربعۃ کتب اسماعیلیۃ (بیروت، ۲۰۰۲)، ص ۱۹

(۱۵) Mawlana Sultan Muhammad Shah, The Memoirs of Aga Khan (London, 1954), p.175

(۱۶) Ibid., p.176

(۱۷) Ibid., p.174

(۱۸) جلال الدین سیوطی، الجامع الصغیر (بیروت، ۲۰۱۲)، ص ۳۳

(۱۹) میزان الحقائق، صص ۶۲-۶۳

(۲۰) وزیر شفیق سچیدینا کا ایک خط استادِ بزرگوار کے نام

(۲۱) میزان الحقائق، صص ۳۱-۳۷

(۲۲) امام شناسی، حصۂ سوم، (کراچی، ۱۹۷۲)، صص ۱۵۸-۱۵۹

(۲۳) میزان الحقائق، ص ۳۰

(۲۴) ہزار حکمت (کراچی، ۲۰۰۵)، صص ۵۰۲-۵۰۳؛ سوسوال، ص ۱۱، ۵۸؛ نورانی تالاب (مخطوطہ)، مقالہ ۴۷۰؛ رایل بنگلوز اِن پیراڈائز (مخطوطہ)، مقالہ ۲۱۹

(۲۵) دیوانِ اشعار، ص ۳۳۰

(۲۶) میزان الحقائق، صص ۶۵-۶۶

(۲۷) ایضاً، ص ۶۵

(۲۸) بدیع الزّمان فروزانفر، احادیثِ مثنوی (تہران، ۱۳۴۷)، ص ۱۱۲

(۲۹) میزان الحقائق، ص ۶۵

(۳۰) قرۃ العین (کراچی، ۱۹۹۱)، ص ۲۹

(۳۱) سوسوال، ص ۱۱

(۳۲) میزان الحقائق، ص ۶۴-۶۵

(۳۳) ایضاً، ص ۶۳

(۳۴) بہشتے اسقرگ، (کراچی، ۱۹۸۸)، صص ۲۴، ۲۶

(۳۵) [بروشسکی] دیوانِ نصیری، (کراچی، ۲۰۰۱)، ص ۱۷۵

(۳۶) احادیثِ مثنوی، ص ۸۱

(۳۷) کتاب العلاج، ص ۴۹۵

(۳۸) سوسوال، ص ۵۷

(۳۹) ایضاً، ص ۱۰

(۴۰) قرآنی مینار، صص ۱۱۸-۱۱۹

(۴۱) قرۃ العین، صص ۲۹-۳۰

(۴۲) قرآنی مینار، ص ۱۱۹

(۴۳) قرۃ العین، ص ۳۲

دعوتِ قیامت میں گریہ وزاری کی اساسی اہمیت

گریہ و زاری ہمیشہ سے انبیائے کرامؑ کی سُنّت رہی ہے۔ اور خصوصی طور پر دعوتِ قیامت کے سلسلے میں نورانی مشاہدات میں حضرتِ قائم القیامت نے اس کی اہمیت پر بارہا زور دیا ہے۔ چنانچہ اس مضمون کی اہمیت کو سمجھانے کے لئے استادِ گرامی نے اپنی حکمت آگین کتابوں میں جابجا لکھنے کے ساتھ دو جامع مضامین ''گریہ و زاری اور خصوصی دعا'' اور ''حکمتِ گریہ و زاری'' کے عناوین سے لکھے ہیں، جو بالترتیب ''مطالعۂ روحانیت و خواب'' اور ''کتاب العلاج'' میں چھپ گئے ہیں، جو موصوف کے علمی معجزات میں سے نہایت اہم معجزات ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ استادِ گرامی کی ہدایت کے مطابق گریہ و زاری اور اس کی شرائط سے متعلق قرآنی آیات کی ذیل میں ایک ابتدائی فہرست بھی تیار کی گئی ہے تاکہ اس مضمون کو ہمہ جہتی انداز سے سمجھنے میں آسانی ہو۔

گریہ وزاری اور اس کی شرائط سے متعلق
قرآنی آیات

تَضَرُّع: ۴۲:۶، ۴۳، ۶۳ ؛ ۵۵:۷، ۹۴، ۲۰۵ ؛ ۷۶:۲۳

خُشُوُع: ۱۰۸:۲ ؛ ۱۰۹:۱۷ ؛ ۱۶:۵۷ ؛ ۲۱:۵۹ ؛ ۲:۲۳ ؛ ۴۵:۲ ؛ ۹۰:۲۱ ؛ ۳۵:۳۳ ؛ ۴۵:۴۲ ؛ ۷:۵۴ ؛ ۳۹:۴۱ ؛ ۴۳:۶۸ ؛ ۴۴:۷۰ ؛۹:۷۹ ؛ ۲:۸۸

خُضُوع: ۳۲:۳۳ ؛ ۴:۲۶

تَوُبَہ: ۶:۱۹ ؛ ۸۲:۲۰ ؛ ۷۰:۲۵ ؛ ۶۷:۲۸ ؛ ۱۴۶:۴ ؛ ۵۴:۲ ؛ ۵۲:۱۱، ۹۰ ؛ ۸:۶۶ ؛ ۳:۴۰ ؛ ۱۱۲:۹ ؛ ۶۴:۴

رُجُوع:	۲:۲۸، ۲۴۵ ؛ ۲۱:۳۵ ؛ ۲۳:۱۱۵ ؛ ۲۸:۸۸ ؛ ۲:۱۵٦ ؛ ۲۳:٦۰

بُکَاء:	۱۷:۱۰۷-۱۰۹ ؛ ۱۹:۵۸

سُجُوۡد:	۳:۱۱۳ ؛ ۷:۲۰٦ ؛ ۲٦:۷٦ ؛ ۱۹:۹٦ ؛ ۲۲:۷۷ ؛ ۴۱:۳۷ ؛ ۳:۴۳ ؛ ۴۸:۲۹ ؛ ۵۰:۴۰ ؛
۳۹:۹ ؛ ۹:۱۱۲ ؛ ۱۵:۹۸ ؛ ۲۵:٦۴ ؛ ۳۲:۱۵

رُکُوۡع وَ سُجُوۡد: ۲:۱۲۵ ؛ ۲۲:۲٦

ذکرِ جلی:	۷:۲۰۵ ؛ ۷:۱۴۸ ؛ ۲۱:۱۱۰

ذکرِ خفی:	۱۹:۳ ؛ ٦:٦۳ ؛ ۷:۵۵

ذکرِ کثیر:	۳:۴۱ ؛ ۳:۱۹۱ ؛ ۲:۱۵۲ ؛ ۳۳:۴۱ ؛ ۸:۲ ؛ ۵۷:۱٦ ؛ ٦۳:۹ ؛ ۷۲:۱۷ ؛ ۴۳:۳٦ ؛
۳۹:۲۲-۲۳ ؛ ۱۳:۲۸ ؛ ۵۴:۱۷ ؛ ٦۲:۹ ؛ ٦۳:۹ ؛ ۲:۲۰۰ ؛ ۲۰:۱۲۴ ؛ ۳۳:۳۵

مجاهدۂ نفس: ۲:۲۱۸ ؛ ۳:۱۴۲ ؛ ۸:۷۲، ۷۴ ؛ ۹:۸۸-۸۹ ؛ ۲۲:۷۸ ؛ ۴:۹۵ ؛ ۴۷:۳۱

خشیّت:	۵۰:۳۳ ؛ ۹۸:۸ ؛ ۵:۴۴ ؛ ۲۴:۵۲ ؛ ۳۵:۲۸ ؛ ۲:۱۵۰ ؛ ۲۳:۵۷

اِصلاحِ اَحوال وَ اَطوار: ۱۳:۲۰-۲۳ ؛ ۷:۳۵ ؛ ۸:۲۰۱ ؛ ۴۹:۱۰ ؛ ۱٦:۹۷ ؛ ۱۸:۱۱۰ ؛ ۴۰:۴۰ ؛ ۴۱:۳۳
؛ ۴:٦۹ ؛ ۴:٦۹ ؛ ۴:۱۲۴ ؛ ۱۸:۳۰، ۴٦، ۱۰۷ ؛ ۱۹:۷٦، ۹٦ ؛ ۲۰:۷۵ ؛ ۳۰:۱۵

انبیاء و اولیاء کی گریہ وزاری کا ذکر: ۱۹:۵۸ ؛ ۲۱:۹۰

فقیر حقیر

مرکزِ علم و حکمت، لندن

۳، جون ۲۰۱۳ء

سُورۂ منافقون کا مرکزی موضوع

سورۂ منافقون مدنی سورتوں میں سے ایک ہے۔ قرآنِ کریم میں موجودہ ترتیب کے لحاظ سے اس کا نمبر ۶۳ اور مدنی نزولی ترتیب کے لحاظ سے نمبر ۱۸ اور مکی نزولی ترتیب کے ساتھ ملاکر ۱۰۴ نمبر ہے۔ اس سورے کا مرکزی موضوع بھی وہی ہے جو اس کا عنوان ہے۔ لفظ منافقون یا منافقین مسلمون یا مسلمین کے وزن پر منافق کا جمع سالم ہے۔ منافق کے معنی نفاق یا دو روئی رکھنے والا، یعنی ایسا شخص جو دنیوی مطلب برآری کے لئے ظاہر میں مسلمان اور باطن میں کافر ہو۔ جیسا کہ استادِ گرامی فرماتے ہیں:

مومِنن حکمته گنه ظاهری کافر مَنُوای

کافرن مطلبه گنه سر که مسلمان ئیڎم

ایک مؤمن حکمت کے لئے ظاہری طور پر کافر ہوگیا ہے [اور] ایک کافر کو مطلب نکالنے کی خاطر ظاہر میں مَیں نے مسلمان دیکھا۔[۱]

لغوی اعتبار سے لفظِ نِفَاق نَـافِقَاءُ الْیَرْبُوْع سے نکلا ہے۔ یربوع چوہے کی ایک قسم ہے جس کے اگلے پاؤں چھوٹے اور پچھلے لمبے ہوتے ہیں، اور نَـافِـقَـاء اس کا بِل ہے جس کے کئی دروازے ہوتے ہیں۔ جب اسے ایک دروازے سے روکا جاتا ہے تو دوسرے دروازے سے نکل جاتا ہے۔ چونکہ منافق دھوکہ دینے کے لئے کئی ایک حربے استعمال کرتا ہے، اس لئے منافق کی تشبیہ اس سے دی گئی ہے۔[۲] چنانچہ مولانا علیؑ منافقین کے بارے میں فرماتے ہیں: ''یَتَـلَـوَّنُـونَ اَلْـوَانًـا''، یعنی وہ [دھوکہ دینے کے لئے] گونا گون رنگ بدلتے رہتے ہیں۔[۳]

قرآنِ کریم میں منافق کو کافر سے بھی بدتر قرار دیا گیا ہے، کیونکہ کافر کی حالت بُری سہی لیکن ایک ہی حالت ہوتی ہے۔ لیکن منافق کی حالت بدلتی رہتی ہے اس لئے اس کا علم نہیں ہو سکتا، اس لئے وہ کافر سے زیادہ مکّار اور خطرناک ہوتا ہے، اس لئے اس کو جہنم کے سب سے نچلے طبقے میں

ڈالا گیا ہے۔ جیسا کہ خدای تعالیٰ فرماتا ہے: ''اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ فِی الدَّرْکِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ'' (۴:۱۴۵)، یعنی یقیناً منافق جہنم کے سب سے نچلے طبقے میں ہیں۔ منافقین کا یہ بُرا عمل عوام تک محدود نہیں بلکہ انبیاءؑ سے بھی جھوٹ بولتے ہیں اور جھوٹی قسمیں کھاتے ہیں۔ چنانچہ ربّ العزت خود اپنے کلام میں ان کے ان بُرے اعمال کا پردہ چاک کر دیتے ہیں: ''اِذَا جَآءَکَ الْمُنٰفِقُوْنَ قَالُوْا نَشْهَدُ اِنَّکَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ وَاللّٰهُ یَعْلَمُ اِنَّکَ لَرَسُوْلُهٗ ط وَاللّٰهُ یَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ لَکٰذِبُوْنَ – اِتَّخَذُوْٓا اَیْمَانَهُمْ جُنَّةً فَصَدُّوْا عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ط اِنَّهُمْ سَآءَ مَا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ'' (۶۳:۱-۲)، یعنی (اے رسولؐ) جب منافق تیرے پاس آئے تو کہنے لگے: ہم گواہی دیتے ہیں کہ یقیناً تو اللہ تعالیٰ کا رسولؐ ہے، اور اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ یقیناً تُو اس کا رسولؐ ہے، اور اللہ تعالیٰ گواہی دیتا ہے کہ یقیناً منافق جھوٹے ہیں۔ انہوں نے اپنی قسموں کو ڈھال بنا لیا، پھر انہوں نے لوگوں کو خدائے تعالیٰ کے راستے سے روکا، یقیناً جو عمل وہ کیا کرتے تھے بہت بُرا ہے۔ منافقین کے جھوٹ بولنے اور جھوٹی قسمیں کھانے کے سلسلے میں دیکھئے مزید آیات (۲:۸-۱۶ ؛ ۹:۷۴)۔

ان آیات میں اس حکمت کی تلاش کرنے کی ضرورت ہے کہ منافقین کی رسولؐ کے لئے شہادت بظاہر سچی ہونے کے کالعدم کیوں قرار پائی۔ اس سلسلے میں یہ جاننا نہایت ہی ضروری ہے کہ خدا کے دین میں ہر قول و عمل کے دو پہلو ہوتے ہیں: جیسے ظاہر اور باطن، تنزیل اور تأویل، وغیرہ۔ ان میں ایک کو چھوڑ دیا جائے تو دوسرا خودبخود کالعدم قرار پاتا ہے۔ چنانچہ اس بارے میں خدائے تعالیٰ فرماتا ہے: ''وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰی حَرْفٍ فَاِنْ اَصَابَهٗ خَیْرُ اطْمَاَنَّ بِهٖ وَاِنْ اَصَابَتْهُ فِتْنَةُ انْقَلَبَ عَلٰی وَجْهِهٖ خَسِرَ الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةَ ط ذٰلِکَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِیْنُ'' (۲۲:۱۱)، یعنی اور لوگوں میں کچھ ایسے بھی ہیں جو خدا کی عبادت ایک پہلو سے کرتے ہیں، پس اگر اُنہیں کوئی بھلائی پہنچتی ہے تو وہ اس سے مطمئن ہوتے ہیں، اور اگر انہیں کوئی مصیبت آ پہنچتی ہے تو اپنا منہ پھیر کر پلٹ جاتے ہیں، انہوں نے دنیا اور آخرت دونوں گنوا دیں۔

چنانچہ منافقین کی شہادت کالعدم ہونے کا اصل سبب یہ تھا کہ پیغمبر نے جو دین لایا تھا اس کی تنزیل کو بظاہر تسلیم کیا، جس کو پیغمبرؐ نے خود انجام دیا تھا، لیکن تأویل کے منکر ہوگئے، جس کو

انجام دینے کے لئے آپؐ نے خدا کے حکم سے مولانا علیؑ کو اپنے اساس، وصی اور مُؤوِّلِ قرآن کی حیثیت میں اپنا جانشین مقرر کیا تھا۔ تأویل کی انتہائی اہمیت کے پیشِ نظر آنحضرتؐ نے دعوت عشیرۃ الاقربین سے لے کر غدیرِ خم تک کئی ایک موقعوں پر علی الاعلان اور اشارے کنایوں میں مولانا علیؑ کی علوِّ مرتبت کے بارے میں ارشادات فرمائے ہیں۔ مثلاً ''اَنَا دَارُالْحِکْمَةِ وَ عَلِیٌّ بَابُهَا''، یعنی مَیں حکمت کا گھر ہوں اور علیؑ اس کا دروازہ ہے[۴]؛ ''اَنَا مَدِیْنَةُ الْعِلْمِ وَ عَلِیٌّ بَابُهَا، فَمَنْ اَرَادَ الْعِلْمَ فَلْیَأتِ الْبَابُ''، یعنی مَیں علم کا شہر ہوں اور علیؑ اس کا دروازہ ہے، پس جو علم (حاصل کرنے) کا ارادہ رکھتا ہے تو وہ دروازے سے شہر میں آئے[۵]؛ ''عَلِیٌّ مَعَ الْحَقِّ وَ الْحَقُّ مَعَه، اَیْنَمَا دَارَ عَلِیٌّ فَالْحَقُّ دَارَ مَعَه''، یعنی علیؑ حق کے ساتھ ہے اور حق آپؑ کے ساتھ ہے، علیؑ جہاں بھی گھومتا ہے تو حق بھی آپؑ کے ساتھ گھومتا ہے[۶]؛ ''اِنَّ مِنْکُمْ مَنْ یُّقَاتِلُ عَلَی تَاْوِیْلِ الْقُرْاٰن کَمَا قَاتَلْتُ عَلٰی تَنْزِیْلَه''، یعنی یقیناً تم میں وہ شخص بھی ہے جو قرآن کی تأویل پر جنگ کرے گا جس طرح مَیں نے اس کی تنزیل پر جنگ کی۔[۷]

اس کے باوجود جیسا کہ جامع الترمذی سے ظاہر ہے کہ کچھ لوگوں کو امام علیؑ کے ساتھ حسد، بُغض اور دشمنی تھی۔ چنانچہ حضرتِ اُمِّ سلمہ سے روایت ہے کہ حضرتِ رسولؐ نے فرمایا: ''لَایُحِبُّ عَلِیًّا مُنَافِقٌ وَلَا یُبْغِضُهُ مُؤْمِنٌ''، یعنی کوئی منافق علیؑ سے محبت نہیں کرتا اور کوئی مؤمن آپ سے بُغض نہیں رکھتا۔[۸] نیز مولانا علیؑ سے روایت ہے کہ رسولؐ نے آپ سے فرمایا: ''لَایُحِبُّکَ اِلَّا مُؤْمِنٌ وَلَایُبْغِضُکَ اِلَّا مُنَافِقٌ''، یعنی سوائے کسی مؤمن کے کوئی تجھ سے محبت نہیں کرتا اور سوائے کسی منافق کے کوئی تجھ سے بُغض نہیں رکھتا۔[۹] حضرت سلمان [فارسی] سے روایت ہے کہ آپ نے رسولؐ سے سُنا: ''مَنْ اَحَبَّ عَلِیًّا فَقَدْ اَحَبَّنِی وَمَنْ اَبْغَضَ عَلِیًّا فَقَدْ اَبْغَضَنِی''، یعنی جس نے علیؑ سے محبت کی اس نے مجھ سے محبت کی اور جس نے علیؑ سے بغض رکھا اس نے مجھ سے بُغض رکھا۔[۱۰] نیز حضرت سعید خُدری سے روایت ہے: ''اِنَّ کُنَّا لَنَعْرِف الْمُنَافِقِیْنَ نَحْنُ مَعْشَرَ الْاَنْصَارِ بِبُغْضِهِمْ عَلِیَّ ابْنَ اَبِی طَالِب [علیهما السّلام]''، یعنی ہم گروہ انصار منافقین کو ان کے علی بن ابی طالب [علیہما السلام] کے ساتھ بغض رکھنے کی وجہ سے پہچانتے تھے۔[۱۱]

ان احادیث سے منافقین کی پہچان ہوئی اور یہ بھی معلوم ہوا کہ خدائی تعالیٰ نے ان کی شہادت کو کیوں ردّ فرمایا۔ صاف ظاہر ہے کہ اس کا اصل سبب بغض علیؑ تھا۔ چنانچہ انہوں نے اس بنیاد پر آپ کے مرتبے سے انکار کیا اور آپ سے علمِ تأویل حاصل نہ کر سکے، اس کی وجہ سے ان کی ظاہری شہادت بھی کالعدم پا گئی اور اس عظیم گناہ کی وجہ سے ان کا شُمُول منافقین میں ہوا۔ یقیناً یہ دین و دنیا دونوں کا بہت بڑا خسارہ تھا۔

الغرض اس مختصر وضاحت سے اس سورے کا مرکزی موضوع ظاہر ہے کہ اس میں خدائے بزرگ و برتر منافقین کی اس بنیاد پر برملا مذمت کرتا ہے کہ ہر چند انہوں نے رسولؐ کی رسالت کی ظاہری اور زبانی شہادت تو دی لیکن آپؐ کے اساس اور وصی، جن کو خدا کے حکم سے قرآن کی تأویل کے لئے مقرر کیا تھا، کے مرتبے کا بغض و عداوت کی وجہ سے انکار کیا۔ چونکہ علیؑ سے بغض خود رسولؐ سے بغض کے مترادف ہے، اس لئے خدائے علیم و حکیم نے ان کی منافقانہ شہادت کو جھوٹ اور باطل قرار دیا اور وہ خسرانِ مبین اور عذابِ الیم میں گرفتار ہوگئے۔ ربُّ العزت تمام مؤمنین و مؤمنات کو اس دردناک انجام سے بچائے۔ آمین! یاربَّ العالمین!!

فقیر حقیر

مرکزِ علم و حکمت، لندن

یکم جولائی ۲۰۱۳ء

<u>یادداشتہا:</u>

(۱) حضرتِ علامہ نصیرالدین نصیر صاحب، ہونزائی، دیوانِ نصیری (کراچی، ۲۰۰۱ء)، ص ۱۶۶

(۲) سیدنا المؤید فی الدّین شیرازی، المجالس المؤیّدیّہ (بمبئی، ۱۹۷۵)، اول، ۲۷۲

(۳) مولانا علیؑ، نہج البلاغہ (بیروت، ۱۹۸۲ء)، ص ۳۰۷

(۴) ابوعیسیٰ محمد ترمذی، جامع الترمذی (ریاض، ۱۹۹۹ء)، ص ۸۴۷، حدیث ۳۷۲۳

(۵) حاکم نیساپوری، المستدرک (بیروت، ۱۹۹۰ء)، سوم، ۱۳۸، حدیث ۴۶۳۹

(۶) المجالس المؤیدیہ، اول، ۲۴۴

(۷) المستدرک، سوم، ۱۳۲

(۸) جامع الترمذی، ص ۸۴۶، حدیث ۳۷۱۷

(۹) ایضاً، ص ۸۵۰، حدیث ۳۷۳۶

(۱۰) المستدرک، سوم، ۱۴۱، حدیث ۴۶۴۸

(۱۱) جامع الترمذی، ص ۸۴۶، حدیث ۳۷۱۷

حضرتِ سیّدۂ نسآءِ عالمین فاطمۂ زہراء (علینا سلامہا) کی نورانی وراثت

اس عنوان کی بنیاد سورۂ احزاب کی آیت: ''مَا کَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنۡ رِّجَالِکُمۡ وَلٰکِنۡ رَّسُوۡلَ اللّٰہِ وَخَاتَمَ النَّبِیّٖنَ ؕ وَکَانَ اللّٰہُ بِکُلِّ شَیۡءٍ عَلِیۡمًا'' (۳۳:۴۰)، یعنی محمدؐ تمہارے مَردوں میں کسی کا باپ نہیں، مگر وہ رسول اللہ اور خاتم النبین ہے اور اللہ ہر چیز جاننے والا ہے، پر رکھی گئی ہے۔ یہ آیت کرائم القرآن[1] میں سے ہے، اور کرائم القرآن سے وہ آیات مراد ہیں جو برملا اہلِ بیتِ اطہارؑ کی شان میں نازل ہوئی ہیں۔

اس آیت کے شروع کے حصے میں رسولؐ کے مَردوں میں سے کسی کے باپ ہونے کی تردید کی گئی ہے۔ لیکن تاریخی لحاظ سے دیکھا جائے تو اس بیان کے خلافِ واقعہ ہونے میں کسی کو کوئی شک نہیں ہو سکتا۔ اس کے باوجود جب خدای بزرگ و برتر ہی تردید فرماتا ہے تو یقیناً اس میں بڑے بڑے راز ہو سکتے ہیں جن پر پردہ ڈالنے کے لئے یہ طریقہ اختیار کیا جاتا ہے۔ ان کا جاننا حضراتِ رَاسِخُوۡنَ فِی الۡعِلۡمِ کی تأویل کے بغیر ممکن نہیں۔ حکمت سکھانے کے اس قسم کے طریقے کو استادِ گرامی نے ''حکمت کا طریقِ معکوس'' یا ''حکمتہ ابوم گن'' کا نام دیا ہے۔ چنانچہ اپنے ایک حکمت آگین شعر میں فرماتے ہیں:

؎ عقلہ اِشارکُ کہ ڈوم حکمتہ گن خس ابوم
ژُئین کہ ہیئِن عشقہ روم! نورہ مثالکُہ کتاب

ترجمہ: عقل کے اشارے بھی [سمجھنے میں] مشکل ہیں [اور] حکمت کا راستہ تو اُلٹا ہی ہے۔ اے قبیلۂ عشق! آیئے! نور کی مثالوں کی کتاب کو سمجھنے کی [کوشش] کیجئے۔[2]

چنانچہ ہم اس آیت (۳۳:۴۰) میں دیکھتے ہیں کہ عقل کی مثالیں کس طرح مشکل اور حکمت کا راستہ کس طرح اُلٹا ہے۔ مثلاً ظاہری طور پر دیکھا جائے تو آنحضرتؐ کی حضرتِ خدیجۃ الکبریٰ (ع۔س)

اور حضرتِ ماریہ قبطیّہ (ع۔س) دونوں سے نرینہ اولاد تھی۔ حضرتِ خدیجۃ الکبریٰ (ع۔س) سے آپؐ کی پہلی اولاد حضرتِ قاسم تھے، جن کے نام سے آپؐ ابو القاسم کی کنیت سے مشہور ہوئے۔[۳] نیز روحانی لحاظ سے سورۂ احزاب میں آیا ہے: ''اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِہِمْ وَاَزْوَاجُہٗٓ اُمَّھٰتُھُمْ ط'' (۶:۳۳)، یعنی نبی مؤمنوں پر ان کی اپنی جانوں سے زیادہ حق رکھنے والا ہے اور اس کی بیویاں اُن کی مائیں ہیں۔ اس آیت کی تأویل کرتے ہوئے پیر ناصر خسرو (قس) اپنی شہرۂ آفاق کتاب وجہ الدّین میں فرماتے ہیں کہ اگر رسولؐ کی اَزواج مؤمنین کی مائیں ہیں تو رسولؐ خود یقیناً اُن کے باپ ہیں۔[۴] نیز اسی کتاب میں پیر ناصر خسرو (قس) نے اس حدیث کا ذکر بھی فرمایا ہے کہ رسولؐ نے مولانا علی (ع۔س) سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا: ''یَاعَلِیُّ اَنَا وَاَنْتَ اَبَوَا الْمُؤْمِنِیْن''، یعنی اے علی! مَیں اور آپ مؤمنین کے والدین ہیں۔''[۵]

یہاں پر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان شواہد کے باوجود رسولؐ کے رجال کے باپ ہونے کی تردید میں کیا حکمت ہے؟ استادِ گرامی نورانی اور کشفی تأویل کی روشنی میں فرماتے ہیں کہ اس میں عظیم حکمت نورانی وراثت کی ہے کہ رسولؐ کی نبوت و رسالت کا صلبی نور حضرتِ سیدۂ نسآءِ عالمین (ع۔س) میں منتقل ہونے والا تھا۔ جس طرح آپ (ع۔س) سے پہلے حضرتِ مریم (ع۔س) کو نبوت و رسالت کا نور ملا تھا (۵۰:۲۳) جس کی برکت سے حضرتِ عیسیٰ (ع۔س) پیدا ہوئے تھے، اسی طرح آنحضرتؐ کا صلبی نور آپ (ع۔س) میں منتقل ہونے والا تھا۔ اسی نور سے آنے والے دَور کے لئے اشخاصِ امامت کا سلسلہ چلنے والا تھا اور بالخصوص حضرتِ قائم القیامت کا ظہور آپ (ع۔س) کے سلسلۂ اولاد سے ہونے والا تھا۔ حضرتِ قائم وہ ہستی ہیں جن کے لئے بزرگانِ دین نے ''بزرگوارِ دو جہان'' کہا ہے۔ آنجناب ہی کے ذریعے خدائے بزرگ و برتر کی حکومت قائم ہونے والی ہے۔ آنجناب ہی ظلم و ستم کی بیخ کنی اور عدل و انصاف قائم کریں گے۔ آن بزرگوارِ دو جہان کے دَور میں دعوتِ حق برملا ہوگی، کسی تقیہ کی ضرورت باقی نہیں رہے گی۔ تمام حقائق و معارف منکشف ہوں گے، رموز و اَمثال باقی نہیں رہیں گے، اس لئے شریعتِ وضعی کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہے گی اور شریعتِ عقلی کا دَور دَورہ

ہوگا، آنجناب ہی کی طرف ماضی میں تمام انبیائے کرام نے دعوت دی ہے اور مستقبل میں تمام ائمۂ طاہرین دعوت دیں گے۔

پس رجال کے باپ ہونے کی تردید میں حضرتِ سیدۂ نسآءِ عالمین (ع۔س) کی اس نورانی وراثت کی طرف اشارہ تھا۔ چنانچہ آنحضرتؐ کا صلبی نور حضرتِ سیدۂ نسآءِ عالمین (ع۔س) میں منتقل ہوٗا اور امری نور مولانا علیؑ (ع۔س) میں منتقل ہوٗا، جبکہ مولانا علی (ع۔س) میں صلبی نور امامِ مقیم مولانا ابو طالب (ع۔س) سے منتقل ہوٗا تھا۔ چنانچہ آپ دونوں کے مبارک انوار سے آنحضرتؐ کے بعد سلسلۂ نورِ امامت جاری ہوٗا اور اَلْحَمْدُلِلّٰہ! آج تک یہ سلسلہ درخشانی و تابانی کے ساتھ جاری ہے۔ اور یہی نور دورِ امامت سے گزر کر دورِ قیامت میں داخل ہوٗا ہے۔ صلبی نور کی نسبت سے آنحضرتؐ نے حضرتِ سیدۂ نسآءِ عالمین (ع۔س) کی اولاد کو اپنی اولاد قرار دیا اور امامت کا یہ سلسلہ آلِ محمدؐ اور اولادِ علیؑ کے مقدس نام سے مشہور ہوٗا۔

حضرتِ سیّدہ نسآءِ عالمین (ع۔س) کی اولاد رسولؐ کی اولاد ہونے کا عظیم ترین ثبوت خود قرآنِ کریم میں ہے کہ آیۂ مباہلہ میں خود ربُّ العزت نے حضرتِ امام حسن (ع۔س) اور حضرت امام حسین (ع۔س) کو حکایتاً ''اَبْـنَـاءَ نَـا'' (ہمارے بیٹے) فرما کر ثابت کر دیا کہ آپ (ع۔س) کی اولاد رسولؐ کی اولاد ہے۔ نیز رسولؐ حضرتِ قائم القیامت کو اپنی اولاد قرار دیتے ہوئے اور آنجناب کی فوق العادۃ عظمت و جلالت کے بارے میں پیشگوئی کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ''لَوْ لَمْ یَبْقَ مِنَ الدُّنیَا اِلَّا یَوْمٌ وَاحِدٌ لَطَوَّلَ اللّٰہُ ذٰلِکَ الْیَومَ حَتّٰی یَخْرُجَ مِنْ وَلْدی مَنْ یَمْلَأُھَا عَدْلًا کَمَا مُلِئَتْ جَوْرًا''، یعنی دنیا [کی عمر] سے سوائے ایک دن کے کچھ باقی نہ رہے تو خدای تعالیٰ اس دن کو لمبا کر دے گا یہاں تک کہ میری اولاد سے وہ شخص نکلے گا جو اس دنیا کو عدل و انصاف سے بھر دے گا جس طرح یہ [اب] جور و ستم سے بھری ہوئی ہے۔[۶]

حضرتِ سیدۂ نسآءِ عالمین (ع۔س) کی عظمت و جلالت آیۂ مباہلہ کے ساتھ آیۂ تطہیر سے بھی ثابت ہے۔ اور کئی ایک موقعوں پر خود آنحضرتؐ نے بھی اشارہ فرمایا ہے۔ چنانچہ ایک حدیث میں

فرماتے ہیں: ''یَابُنیَّۃُ اَمَا تَرْضَینَ اَنَّکِ سَیِّدَۃُ نَسَآءِ الْعَالَمِیْنَ. قَالَتْ: یَا اَبَتِ فَاَیْنَ مَرْیَمُ بِنْتِ عِمْرٰن؟ قَالَ: تِلْکَ سَیِّدَۃُ نِسَآءِ عَالَمِھَا وَاَنْتِ سَیِّدۃُ نِسَآءِ عَالَمِکِ. اَمَّا وَاللّٰہِ لَقَدْ زَوَّجْتُکِ سَیِّداً فِی الدُّنیا وَالْاٰخِرَۃِ''، یعنی بیٹی! کیا تو اس سے خوش نہیں کہ تو نسآءِ عالمین کی سیدہ (سردار) ہے۔ فاطمہؑ زہراء (ع۔س) نے فرمایا: باوا جان! مریم (ع۔س) کدھر گئیں؟ فرمایا: وہ اپنے زمانے کی عورتوں کی سردار ہیں اور تو اپنے زمانے کی عورتوں کی سردار ہے۔ لیکن خدا کی قسم! مَیں نے تجھے ایک ایسے شخص سے بیاہا ہے جو دنیا و آخرت میں سید (سردار) ہے۔[۷] نیز آنحضرتؐ کا دستور تھا کہ جب حضرتِ فاطمہؑ زہراء (ع۔س) آتیں تو آپؐ کھڑے ہو جاتے اور ہاتھ پکڑ کر جبینِ مبارک پر بوسہ دیتے اور اپنے مقام پر بٹھاتے۔[۸]

اسی طرح جب ائمۂ طاہرینؑ کو ظاہری حکومت بھی کرنے کا موقع ملا تو اس کا نام آپ (ع۔س) کے مبارک نام سے خلافتِ فاطمیہ رکھا گیا اور ائمۂ اطہارِ آلِ محمدؐ اور اولادِ علیؑ کے ساتھ فاطمیّوں یا فاطمیین کے نام سے بھی مشہور ہوئے۔ جیسا پیر ناصر خسرو (قس) کے اس شعر سے ظاہر ہے:

شیعتِ فاطمیان یافته اند آبِ حیات
خضر این دَور شُد ستند که هر گز نمرند[۹]

ترجمہ: بنی فاطمہ (ع۔س) کے پیرووں کو آبِ حیات مل گیا ہے اس لئے وہ سب کے سب اپنے زمانے کے خضر بن گئے ہیں اور کبھی مرنے والے نہیں۔

اس کے ساتھ ساتھ سِرّی کتابوں جیسے اُمُّ الکتاب میں بھی آپ (ع۔س) کے اصل مرتبے کا ذکر آیا ہے۔ لیکن ان کتابوں کے سِرّی ہونے کی وجہ سے آج تک عمومی جماعت کی رسائی نہیں ہوئی تھی۔ لیکن آج دورِ قیامت کی برکتوں سے اُمُّ الکتاب جیسی کتابیں بھی چھپ گئی ہیں اور دوسری طرف استادِ بزرگوار (د۔ف) کی نورانی اور کشفی تاویل سے زمینِ دعوت جس شان سے روشن ہوتی جا رہی ہے اس عظیم سعادت کا کیا کہنا! **سبحان اللہ! سبحان اللہ!** ان تأویلات سے نہ صرف سیدۂ نسآءِ عالمین (ع۔س) کی صحیح معرفت حاصل ہوتی جا رہی ہے بلکہ حورانِ پُرنور کی حقیقی معرفت بھی حاصل ہوتی جا رہی ہے کہ کس طرح مثلِ قائم، زندہ قرآن اور زندہ بہشت ہیں۔

آیت کے دوسرے حصے میں آنحضرتؐ کے بارے میں ارشاد ہے کہ آپؐ نہ صرف رسول اللہ ہیں بلکہ خاتم النبین بھی ہیں۔ لغت کے لحاظ سے **خَـاتَم فَاعَل** کے وزن پر ہے جس کے معنی **مَـایُـفْعَلُ بِه** کے ہوتے ہیں۔ اسی لحاظ سے **خَـاتَم** کے معنی **مَـا یُـخْتَمُ بِـه** کے ہوتے ہیں۔ یعنی وہ شے یا وجود جس پر کوئی شے ختم کر دی جائے۔ یعنی آپؐ کی ذاتِ گرامی پر اللہ تعالیٰ نے سب نبیوں کا خاتمہ کر دیا، آپؐ آخری نبی ہیں، آپؐ کے بعد کوئی نبی آنے والا نہیں۔[۱۰]

آیت کے اس حصے میں جہاں آنحضرتؐ کی منفرد اور بے مثال عظمت و مرتبت کا ذکر ہے وہاں پر حجاب میں حضرتِ سیدۂ نسآءِ عالمین (ع۔س) کی نورانی عظمت و جلالت کا بھی ذکر ہے، اس لئے کہ ختمِ نبوت اور قیامت ایک دوسرے سے وابستہ ہیں۔ جیسا کہ آنحضرتؐ نے فرمایا: "**بُـعِـثْـتُ اَنَـا وَالسَّـاعَةُ كَهَـاتَيْنِ**"، رسولؐ نے ختمِ نبوت اور قیامت کی باہمی وابستگی پر زور دینے کی خاطر اپنی شہادت کی دونوں انگلیوں کو ملا کر فرمایا کہ مجھے اور قیامت کو ان دونوں انگلیوں کی طرح بھیجا گیا۔[۱۱] یعنی رسولؐ کے دَور اور دَورِ قیامت کے درمیان اور کوئی دَور حائل نہیں، اور آپؐ کا دَور گزرنے کے بعد قیامت کا دَور شروع ہوگا جو قائمِ آلِ محمدؐ اور اولادِ علیؑ کی برکتوں سے شروع ہوگا۔ جیسا کہ اوپر ذکر ہوا کہ آنجناب ہی دنیا سے ظلم و ستم کو دُور کرکے عدل و انصاف سے بھر دیں گے۔ آنجناب کے زمانے میں خدا کا نور تمام ہوگا اور ادیانِ عالم پر اسلام غالب آئے گا۔ آیات (۹:۳۲-۳۳ ؛ ۸:۶۱-۹) سے ظاہر ہے کہ یہ سعادت رسولؐ کے زمانے میں نصیب نہیں ہوئی تھی اور مستقبل میں حضرتِ قائم کے ذریعے یہ سعادت و کرامت نصیب ہونے والی تھی، جس کی پیشگوئی رسولؐ نے فرمائی تھی۔

الغرض بیانِ بالا سے ظاہر ہے کہ آیۂ مذکور الصدر میں رسولؐ کے مَردوں میں سے کسی کے باپ نہ ہونے کی نسبت سے ظاہراً اور قیامِ قیامت کی نسبت سے درپردہ حضرتِ سیدۂ نسآءِ عالمین کی نورانی وراثت اور عظمت و جلالت کا ذکر آیا ہے۔ **اَلْحَمْدُللهِ عَلٰی مَنِّهٖ وَاِحْسَانِهٖ**۔

فقیر حقیر

۲۳، جولائی ۲۰۱۳ء

یادداشتہا:

(۱) سید محمد صالح کشفی، مناقبِ مرتضوی، ترجمہ از شریف حسین بنامِ کوکبِ دُرّی (لاہور، ت ن)، صص، ۱۱۸-۱۱۹

(۲) علامہ نصیرالدّین نصیر صاحب ہونزائی، دیوانِ نصیری (کراچی، ۲۰۰۱)، ص ۳۲۷

(۳) قاضی محمد سلیمان منصور پوری، رحمۃً للعالمین (کراچی، ۲۰۰۱)، ص ۳۲۷

(۴) پیر ناصر خسرو (قس)، وجہ الدّین، ترجمۂ اردو از حضرت علامہ ہونزائی (کراچی، ۲۰۰۰)، ص ۳۴۱

(۵) ایضاً

(٦) سیدنا ابو حاتم رازی، کتاب الاصلاح (تہران، ۱۹۹۸)، ص ٦۱

(۷) رحمۃً للعالمین، ص ۳۳۸

(۸) ایضاً

(۹) پیر ناصر خسرو (قس)، دیوانِ اشعار (تہران، ۱۳٦۷ شمسی)، ص ۱۰۱

(۱۰) سید امداد حسین کاظمی، تفسیر المتقین (لاہور، ۱۳۸۱ ہجری)، ص ۵۴۹

(۱۱) وجہ الدّین، ص ۱۱۷

قُرآنی کُلّیات کی روشنی میں اِنسانی وَحدت کا تَصوّر

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡم

کُتبِ سماوی کا مقصدِ اعلیٰ انسان کی ہدایت ہے، اور قرآنِ کریم تمام کُتبِ سماوی کا محافظ و **مُھَیۡمِنٌ** (۵:۴۸) اور **"تِبۡیَانًا لِّکُلِّ شَیۡءٍ** (۱۶:۸۹)" ہے، اس پُرکرامت و حکمت کتاب کی روشنی میں دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان دین و دنیا اور روحانیت و جسمانیت کا خُلاصہ ہے، اس لیے حُکمائے ظاہر اور حُکمائے دین نے جسمانی لحاظ سے اُس کو عالَمِ صغیر اور روحانی لحاظ سے عالَمِ کبیر کہا ہے، اور اسی جامعیّت کے لحاظ سے انسان کی کمال یافتہ روح کی معرفت کو رَبّ کی معرفت کہا گیا ہے، اور اس کو خلافتِ اِلٰہی کے تاج سے سرفراز کیا گیا ہے (۲:۳۰)۔

چونکہ قرآن کی ہدایت انسان کی کُلّی اور جزوی حالتوں پر حاوی ہے، اس لیے ہدایت کی بھی دو قسمیں ہیں، ایک قسم وہ ہے، جو انسان کی کُلی حالت سے متعلق ہے، اس قسم کی ہدایت کو کُلیّات یا اُصول کہا جاتا ہے، دوسری قسم وہ ہے، جس کا تعلق جُزوی حالات سے ہے، اس قسم کی ہدایت کو جزویات یا فروع کہا جاتا ہے، کُلیّات کے لحاظ سے دیکھا جائے، تو تمام انسانوں کی ایک وحدت نظر آتی ہے، اور جزویات کی نظر سے دیکھا جائے، تو انسانوں میں یقیناً اختلافات نظر آتے ہیں، لیکن کوئی بھی دانشمند جزوی علم سے مطمئن نہیں ہوتا، بلکہ اطمینان حاصل کرنے کے لیے جزویات سے کُلّیات کی طرف آگے بڑھتا ہے، اس مختصر مقالے میں انسانی وحدت کو قرآنی کُلّیات کی روشنی میں دیکھنے کی کوشش کی جائے گی۔

اَب جہاں تک قرآنی کُلّیات کی روشنی میں انسانی وحدت کے تصوّر کا تعلق ہے، ان کُلیات میں سے ایک اہم کلیّہ نفسِ واحدہ سے انسانی تخلیق کا ہے، نفسِ واحدہ سے تخلیق کا ذکر کئی آیات میں آیا ہے، جن میں سے دو کا یہاں ذکر کیا جاتا ہے، مثلاً ایک آیت میں رَبُّ العزت فرماتے ہیں: **"یٰۤاَیُّھَا النَّاسُ اتَّقُوۡا رَبَّکُمُ الَّذِیۡ خَلَقَکُمۡ مِّنۡ نَّفۡسٍ وَّاحِدَةٍ وَّ خَلَقَ مِنۡھَا زَوۡجَھَا وَ بَثَّ مِنۡھُمَا رِجَالًا کَثِیۡرًا وَّ نِسَآءً** (۴:۱)" اے لوگو! اپنے پروردگار سے ڈرو، جس نے تم سب کو ایک نفسِ واحدہ سے پیدا کیا، اور اس سے اس کا جوڑا بنایا، پھر ان دونوں سے بہت سے مَردوں اور عورتوں کو پھیلا دیا، دوسری آیت میں انسانوں میں باہمی روابط اور انسان کی اصل بزرگی کے بارے میں فرماتا ہے: **"یٰۤاَیُّھَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقۡنٰکُمۡ مِّنۡ ذَکَرٍ وَّ اُنۡثٰی وَ جَعَلۡنٰکُمۡ شُعُوۡبًا وَّ قَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوۡا اِنَّ اَکۡرَمَکُمۡ عِنۡدَ اللّٰہِ اَتۡقٰکُمۡ** (۴۹:۱۳)" اے لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا، اور تم کو شعوب و قبائل (قومیں اور قبیلے بنایا) تاکہ ایک دوسرے کو شناخت کرو، اور اللہ کے نزدیک سب سے بڑا

بزرگ وہ ہے، جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہے، ان آیتوں سے روشن ہے کہ تمام انسان جس نسل، قوم اور رنگ کے بھی ہوں، ان سب کی ایک ہی اصل اور ایک ہی حقیقت ہے، اور ان کو الگ الگ شعوب اور قبائل بنانے کا مقصد کسی ایک کو دوسرے پر فوقیت دینے کے لیے نہیں، بلکہ ایک دوسرے کی شناخت کے لیے ہے، اس لیے بنیادی طور پر انسانوں کی ایک ہی وحدت اور آپس میں مساوات ہے۔

اَب اس وحدت و مساوات سے جو درجات بنتے ہیں، اس کا سبب انسان کی اپنی اطاعت و معصیت ہے، نہ کہ خدا نے کسی کو کمتر یا بہتر بنایا ہے، چونکہ انسان کو خدا نے اپنی خلافت کے عظیم ترین مرتبے سے نوازا ہے، اور اس مرتبے کے قابل بنانے کے لیے ایک عظیم امتحان سے گزارنے کے لیے عقل کے ساتھ نفسِ امّارہ کو بھی مقرر کر کے اس کے ساتھ جہادِ اکبر کا حکم دیا ہے، اس امتحان کی وجہ سے درجات وجود میں آتے ہیں، اس میں بعض ناکام ہوجاتے ہیں، اور بعض کامیاب ہو کر مختلف درجات میں ربُّ العزت کی طرف رُجوع کرتے ہیں، لیکن اساسی طور پر سب ایک ہیں۔

اب سب سے برترین کُلّیہ یا اُصول توحید یا خدائے واحد و یکتا کا ہے، جو دین میں اصلُ الاصول ہے، ابھی دیکھنا ہے کہ خدا اپنے بندوں یعنی مردوں اور عورتوں کے ساتھ کیا سلوک کرتا ہے، قرآنِ کریم کے سورۂ فاتحہ سے ظاہر ہے کہ اللہ رَبُّ العالمین ہے، یعنی عالَمین کا پروردگار ہے، عالَمین سے مراد امام جعفرِ صادق علیہ السلام کے یہاں انسان ہی ہیں، یعنی خدا کی پرورش سب کے لیے ایک ہی ہے، سب کو عقل دی ہے، اعضاء دیے ہیں، اور حواسِ ظاہر و باطن اور دیگر نعمتوں سے نوازا ہے، یعنی اس پرورش میں بھی کوئی تخصیص نہیں، البتہ یہ اور بات ہے کہ کوئی نعمتوں کو استعمال کرتا ہے، یا نہیں، اس لحاظ سے بھی بنیادی طور پر انسانوں میں مساوات اور وحدت پائی جاتی ہے۔

خُدائے واحد کے کلیہ کے بعد دوسرا کلیہ خلافتِ الٰہی ہے، یعنی معبود و عبد میں واسطہ یا وسیلے کا ہے، جو نبوت و امامت کے ایک سلسلے میں دنیا میں جاری و ساری ہے، خدا اپنے خلیفہ کو جملہ خلائق کے لیے رحمتوں، کرامتوں اور ہدایت کا باعث بناتا ہے، اس کا روشن ترین ثبوت حضرتِ خاتمُ النّبیین محمد مصطفیٰؐ کا وُجودِ مبارک ہے کہ خدا نے فرمایا: "وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ (۲۱:۱۰۷)" اور ہم نے آپ کو عالمین یعنی تمام انسانوں کے لیے رحمت کے طور پر بھیجا ہے، یہاں پر بھی خدا کی رحمت میں کوئی تخصیص نہیں، بلکہ یہ رحمت سب کے لیے عام ہے، اس لیے بنیادی طور پر انسانوں کے درمیان کسی نسل و قوم یا رنگ کے بنیاد پر کسی کو کسی پر کوئی برتری نہیں، سوائے تقویٰ اور پرہیزگاری کے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے، جو لوگ اپنی سستی سے پیچھے رہ گئے ہیں، اور جس کی وجہ سے اختلافات پیدا ہو گئے ہیں، ان کا کیا ہوگا؟ قرآنِ کریم کی کلیاتی تعلیم سے یہ بات روشن ہے کہ خدا نے انسانوں کی سستی کے باوجود اپنی طرف واپس لوٹانے کا ایک دروازہ کُشادہ رکھا ہے، اس کو بابِ توبہ کہتے ہیں، یعنی جو انسان ہوش میں آ کر غلط رستے کو چھوڑ کر صراطِ مستقیم کی طرف آئے، تو خدا اپنی رحمت سے اس کے گناہوں کو بخش دیگا، اور اپنی اصل حالت پر آ جائے گا، جیسا کہ حدیثِ شریف میں آیا ہے: **اَلتَّـائِبُ مِنَ الـذَّنبِ کَـمَنْ لَاذَنبَ لَـه** = جو دل سے توبہ کریگا، تو وہ گناہوں سے اتنا صاف اور پاکیزہ ہوتا ہے کہ گویا اس نے کبھی گناہ ہی نہیں کیا ہے، اور جو اپنی مرضی سے توبہ نہیں کر سکتا ہے، تو اِجباراً یعنی زبردستی توبہ کرانے کے لیے ایک بظاہر عذاب اور بباطن نجات کا ذریعہ پیدا کیا ہے، اور وہ جہنم کی آگ ہے، بزرگانِ دین میں سے مولانا رومی فرماتے ہیں کہ جہنم گناہگاروں کی عبادت گاہ ہے، اسی عذاب سے ان کی تطہیر ہوتی ہے، جیسا کہ ایک سخت بیماری ہے، جو تلخ دوائیوں کے بغیر دور نہیں ہو سکتی ہے، تو اس کو تلخ دوائیاں کھانی ہی پڑتی ہیں، اگر ان سے بھی ٹھیک نہیں ہوتی، تو آپریشن بھی کرانا پڑتا ہے، جو بظاہر تکلیف دہ ہونے کے باوجود بیماری سے نجات کا باعث ہوتا ہے، اس لیے خدا نے بندوں کے لیے جو عذاب کے وسائل مقرر کیے ہیں، وہ اپنی رحمت کی بنا پر کئے ہیں، جیسا کہ حدیثِ قدسی میں آیا ہے: **وَ رَحْـمَتِي سَبقَتْ غَضَبِي**= اور میری رحمت میرے غضب پر سبقت لے گئی ہے'' اس کے ساتھ خدائے تعالیٰ نے ہر زمانے میں اپنی ہدایت لوگوں تک پہنچانے کے لیے اُولوالامر یعنی صاحبانِ امر کو مقرر کیا ہے، جو اس کے امر و فرمان کی روشنی میں لوگوں کی ہدایت کرتے رہتے ہیں (۲۱:۷۳)، کیا عجب ہے کہ جس طرح ہمارے اگلے زمانوں کے آبا و اَجداد دینِ حق پر نہیں تھے، اور بہت بعد کے آبا و اَجداد نے دینِ حق کو قبول کیا، اور ان کے ذریعے ہمیں یہ دین نصیب ہوا، اسی طرح جو آج دینِ حق سے غافل ہیں، وہ آگاہ ہو کر دینِ حق میں داخل ہو جائیں، اور وحدتِ انسانی کا شعور ان میں پیدا ہو۔

اَلغرض مذکورۂ بالا قرآنی کلیات سے ثابت ہے کہ تمام انسانوں کی حقیقت ایک ہی ہے، اور وہ ان کی وحدت ہے، اور ظاہری طور پر رنگ، نسل، زبان اور قومیت سے متعلق جو اختلافات پائے جاتے ہیں، وہ صرف جسمانی عوارض ہیں، جس کا روح سے کوئی تعلق نہیں، ہمارے بزرگوں نے اپنے اپنے زمانوں میں اس حقیقت کی طرف واضح طور پر توجہ دلائی ہے:

جیسا کہ حضرتِ استاد سخن سعدی فرماتے ہیں:

بنی آدم اعضائے یکدیگرند　　که در آفرینش ز یک گوهرند
چو عضوے بدرد آورد روزگار　　دگر عضوها را نماند قرار
تُو کز محنت دیگران بے غمی　　نشاید که نامت نهند آدمی

ترجمہ: آدمؑ کی اولاد ایک دوسرے کے اعضاء ہیں، اس لیے کہ ان کی پیدائش ایک ہی جوہر سے ہوئی ہے۔
جب زمانہ کسی ایک عضو کو درد میں مبتلا کرتا ہے، تو دوسرے اعضاء کو بھی قرار باقی نہیں رہتا۔
اگر تُو دوسروں کی مشقت سے بےغم ہے، تو مناسب نہیں کہ تیرا نام آدمی رکھا جائے۔

قرآنِ کریم نہ فقط انسانوں کو ازلی وحدت سے کثرت کے پیدا کرنے کا ذکر فرماتا ہے، بلکہ کثرت سے وحدت بنانے کا اشارہ بھی فرماتا ہے، کیونکہ سوائے ذاتِ سبحان کے ہر چیز اس کی خدائی میں زوج (جوڑا، جُفت) کی صورت میں ہے، اور خدا اپنی قدرتِ کاملہ سے ضد سے ضد کو پیدا کرتا ہے، جیسا کہ فرمایا گیا ہے کہ وہ رات کو دن اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے، اور مُردہ سے زندہ کو اور زندہ سے مُردہ کو پیدا کرتا ہے(۳:۲۷)، اسی طرح خدا کو وحدت سے کثرت اور کثرت سے وحدت پیدا کرنے میں کیا رکاوٹ ہو سکتی ہے، جبکہ جسمانی عالَم میں دیکھتے ہیں کہ وہ ایک بیج کی وحدت سے ایک درخت کی کثرت کو پیدا کرتا ہے، اور پورے درخت کی کثرت کو پھر سے بیجوں کی وحدت میں سما دیتا ہے۔

چنانچہ قرآنِ کریم اس وحدت کی بُشارت دیتے ہوئے فرماتا ہے: ''**هُوَالَّذِیٓ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَهٗ بِالۡهُدٰی وَ دِیۡنِ الۡحَقِّ لِیُظۡهِرَهٗ عَلَی الدِّیۡنِ کُلِّهٖ** (۹:۳۳)'' وہی تو ہے، جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دینِ حق کے ساتھ بھیجا ہے، تاکہ اسے ہر دین پر غالب کرے۔

ان قرآنی کُلیات کی روشنی میں یہ ثابت ہوتا ہے کہ انسانی وحدت نہ صرف اپنی اصل اور ازل میں ہے، بلکہ یہی وحدت اَبد میں بھی ممکن ہے، اس سلسلے میں ہمارے اپنے زمانے اور اپنے علاقے کے ایک عارف حضرتِ علاّمہ نصیرالدین نصیر ہونزائی اپنے روحانی تجربات کی روشنی میں فرماتے ہیں:

اُیم دِشَن ئیڈ با ایلےٓ سِس اُیون بَبَر بان
اَزَلےٓ بَبَر بَم جُوَن اَبَدےٓ بَبَر بُٹ اُیم

ترجمہ: میں نے ایک اعلیٰ مقام کو دیکھا ہے، سارے لوگ یکسان اور برابر ہیں، جس طرح ازل میں سب برابر اور ایک تھے، اسی طرح اَبد میں تمام انسانوں کا مساواتِ رحمانی کے تحت ایک ہونا زبردست شیرین بات ہے۔

وقت کا تقاضا ہے کہ ہم سب وقتی اختلافات اور فسادات سے نااُمید ہوئے بغیر خدا کی بے پایان رحمت پر بھروسہ کرتے ہوئے اس کام کو جاری رکھیں، جو اس وقت چترال یونیورسٹی انجام دے رہی ہے، رحمتِ ایزدی سے دُور نہیں کہ وہ جوش میں آ جائے، ہماری تقصیرات کو درگزر فرمائے، اور ہم سب کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرے، اور ہم سب جذبۂ اخوت و محبت کے ساتھ باہمی زندگی گزار سکیں۔

آخر میں عاجزانہ اور فقیرانہ دعا ہے کہ چترال یونیورسٹی کے معزز ارکان اور کارکنوں کو اس قابلِ تحسین کام کو جاری رکھنے کے لیے ہمت و قوت اور وسائل و ذرائع سے مالامال کردے، **آمین یا رَبِّ العالمین۔**

فقیر محمد ہونزائی (پی۔ایچ۔ڈی)

نورانی تاویل یا کشفی تاویل

نورانی تاویل یا کشفی تاویل دَورِ قیامت میں حضرت اُستادِ بزرگوار علّامہ نصیرالدّین نصیرؔ ہونزائیؒ کی اصطلاحات ہیں جو آن بزرگوارؒ نے زمینِ دعوت کے اپنے ربّ کے نور سے روشن ہونے کے لحاظ سے وضع فرمائی ہیں (۳۹ : ۶۹)۔ یہاں سب سے پہلے لفظی طور پر نور کی حقیقت سمجھنے کی ضرورت ہے کہ نور وہ چیز ہے جو خود روشن ہے اور دوسری چیزوں کو بھی روشن کرتا ہے۔ اور کشف کے لفظی معنی ہیں اس نور کی حقیقت سے دَورِ ستر میں پڑے ہوئے تمثیلی اور تشبیہی پردوں کو ہٹا کر بالکل آشکار کرنا۔ اصطلاحی معنوں کا خلاصہ ذیل میں پیش کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اور اختصار کی خاطر اس مقالے میں اسکے بعد صرف نورانی تاویل کی اصطلاح استعمال کی جائے گی۔

دعوتِ حق کی کتابوں میں "نورانی تاویل" کو "تاویلِ محض مجرد" یا "تاویلِ مجردِ محض" بھی کہا جاتا ہے[1]۔ "تاویلِ محضِ مجرد" کے بارے میں اُستادِ بزرگوار فرماتے ہیں: "وہ خالص اور آزاد تاویل یا وہ باطنی علم جو کسی کو عالمِ شخصی میں دیا جاتا ہے، جس میں روحانیت و عقلانیت کے اصل ظہورات و معجزات کا تذکرہ جامۂ تمثیل اور حجابِ تشبیہہ کے بغیر ہوتا ہے، یہ علم سب سے پہلے حضرتِ آدم علیہ السّلام کو دیا گیا تھا"[2]۔

قرآنِ کریم اور احادیثِ شریف کی روشنی میں دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ تاویل کے حجابات نہ فقط تنزیل کی جسمانی تمثیلات و تشبیہات ہیں بلکہ خود تاویل

کے بھی ہیں۔ اس لئے کہ قرآن کا ایک ظاہر اور ایک باطن ہے اور ہر باطن کے اندر کئی بواطن ہیں[۳]۔ نیز تنزیل کا تعلق رسول اللہ یا ناطق کے زمانے سے ہے لیکن تاویل کا تعلق ان کے پورے دَور سے ہے، جو کم و بیش ایک ہزار سال کا ہوتا ہے۔ اس پورے دَور میں زمان و مکان کے تقاضوں کی وجہ سے معنوی اور صوری دونوں اعتبارات سے تبدیلیوں کا ایک سلسلہ جاری رہتا ہے۔ یہ حقیقت قرآنِ کریم کی ان آیات (۷: ۵۲-۵۳) سے واضح ہے۔ خاص کر جہاں خدا فرماتا ہے: "يَوْمَ يَأْتِي تَأْوِيلُهُ" یعنی جس دن اس (یعنی قرآن) کی تاویل آتی ہے یا آئے گی۔ لفظ "يَأْتِي" مضارع کا صیغہ ہے جس کے معانی کا اطلاق حال اور مستقبل دونوں پر ہوتا ہے، یعنی یہ کام پورے دَور تک جاری رہتا ہے۔ چنانچہ حضرتِ مولانا امام سلطان محمد شاہ الحسینیؑ فرماتے ہیں:

> **"... while the words of the Koran remain the same, every generation, every century, every period, must have a new and different interpretation to that of the past, otherwise Islam will die ...."**

یعنی جہاں قرآن کے الفاظ وہی رہتے ہیں، ہر نسل، ہر صدی، ہر وقت کیلئے ایک نئی اور ماضی کی تاویل سے الگ ایک [تاویل] کی لازمی ضرورت ہے، نہیں تو اسلام باقی نہیں رہے گا۔[۴]

نیز یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ جس برگزیدہ ہستی کو خدائے تعالیٰ تاویل کیلئے مقرر فرماتا ہے، اس کیلئے تاویل کرنے کیلئے کوئی قاعدہ اور قانون مقرر نہیں ہوتا بلکہ وہ انسان کے دینی اور دنیوی امور کا مختارِ کُل اور روحانی اور جسمانی جملہ بیماریوں کا حکیم مطلق ہے[۵]، اس لئے ہر فرد اور ہر جماعت کیلئے الگ الگ تاویلیں بھی دے سکتا ہے۔ مثلاً کچھ بیماریوں کیلئے زہر کا عنصر شفا کا باعث ہوتا ہے، لیکن دوسری

بیماریوں کیلئے جان لیوا۔ اسی سلسلے میں امامِ عالی مقام فرماتے ہیں کہ جب آپ کے سر میں درد ہوتا ہے تو ڈاکٹر آپ کو سر کی دوا دیتا ہے تو اس سے آپ کو فائدہ ہوتا ہے۔ چھ مہینے کے بعد پاؤں درد کرنے لگے تو یہ سر کی دوا لگائیں تو اس سے کیا فائدہ ہوگا؟ اس وقت آپ ڈاکٹر کے پاس جائیں، وہ پاؤں کی دوا دے گا، اس سے پاؤں کو فائدہ ہوگا (مفہوم)[٦]۔ وقت اور حالت کے مطابق تاویل کے بدلنے کے بارے میں امامِ عالی مقام مزید فرماتے ہیں: "ہم نے اپنی امامت کے ستر برسوں میں ستر مرتبہ تبدیلیاں کی ہیں، یعنی ابتدائی فرامین اور موجودہ فرامین میں بہت تفاوت دیکھو گے"۔[٧]

الغرض تاویل کا یہ عمل دَورِ قیامت کے آغاز پر اپنی انتہا کو پہنچ جاتا ہے اور کسی جسمانی تمثیل و تشبیہہ کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ اس صورت میں تاویل کو "تاویلِ محضِ مجرد" یا "تاویلِ مجردِ محض" کہا جاتا ہے۔ استادِ بزرگوار اس حقیقت کو آسان لفظوں میں سمجھانے کیلئے "نورانی تاویل" یا "کشفی تاویل" کی اصطلاحات بھی استعمال کرتے ہیں۔

قرآنِ کریم سے یہ واضح ہے کہ اس (یعنی قرآن) کی تاویل جاننے والا خود خدائے تعالیٰ ہے اور راسخون فی العلم (۳: ۷) اور راسخون فی العلم سے مراد خود آنحضرتؐ کے ارشاد کے مطابق آپؐ خود اور مولانا علی علیہ السّلام اور پھر آلِ نبیؐ اور اولادِ علیؑ ہیں یعنی آپؐ اور حضرتِ فاطمہ علیہا السّلام کی اولاد سے منصوص ائمۂ طاہرین علیہم السّلام۔ چنانچہ فرماتے ہیں: "اَنَا صَاحِبُ التَّنْزِيْلِ وَعَلِیٌّ صَاحِبُ التَّأْوِيْلِ"[٨]۔ یعنی میں صاحبِ تنزیل ہوں اور علی صاحبِ تاویل ہیں۔ اور پھر آلِ نبیؐ و اولادِ علیؑ کی قرآن کی تاویل اور امت کی ہدایت سے دائمی وابستگی کے بارے میں حدیثِ ثقلین میں فرماتے ہیں: "اِنِّیْ تَارِکٌ فِیْکُمُ الثَّقَلَیْنِ: کِتَابَ اللّٰہِ وَعِتْرَتِیْ، مَا اِنْ تَمَسَّکْتُمْ

بِهِمَا لَنْ تَضِلُّوْا بَعْدِیْ"۔ یعنی میں تمہارے درمیان دو بھاری چیزیں، خدا کی کتاب اور میری عترت، چھوڑ دیتا ہوں، جب تک تم ان دونوں کو مضبوطی سے پکڑو گے، میرے بعد کبھی گمراہ نہیں ہو جاؤ گے۔ اس کی مزید وضاحت حضرت امام باقرؑ کے اس ارشاد سے ہوتی ہے جو آپ سے "اَلرَّاسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ" (۳:۷) کے بارے میں پوچھنے پر فرمایا تھا: "رَسُوْلُ اللهِ اَفْضَلُ الرَّاسِخِیْنَ فِی الْعِلْمِ، قَدْ عَلَّمَهُ اللهُ جَمِیْعَ مَا اَنْزَلَ عَلَیْهِ مِنَ التَّنْزِیْلِ وَالتَّأْوِیْلِ وَمَاکَانَ یَنْزِلُ عَلَیْهِ شَیْءٌ اِلَّا یَعْلَمُ تَأْوِیْلَهُ۔ ثُمَّ الْاَوْصِیَاءُ مِنْ بَعْدِهِ الرَّاسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ یَعْلَمُوْنَ تَأْوِیْلَهُ کُلَّهُ"۔ یعنی رسول اللہ راسخون فی العلم میں افضل تھے اور یقیناً خدا نے انہیں وہ سب کچھ سکھایا تھا جو تنزیل و تاویل میں سے ان پر نازل کیا کرتا تھا، اور ان پر کوئی چیز نازل نہیں ہوتی تھی سوائے اس کے کہ آپ اس کی تاویل جانتے تھے۔ پھر ان کے بعد اوصیاء راسخون فی العلم ہیں جو اس (یعنی قرآن) کی تاویل کو پوری طرح جانتے ہیں۔ الغرض ہر چند کہ آنحضرت تاویل کے جاننے میں سب سے افضل تھے، لیکن عملی طور پر یہ کام اپنے وقت میں مولانا علیؑ کرتے تھے اور پھر ہر زمانے میں اس کا مالک آلِ نبیؐ اور اولادِ علیؑ سے منصوص امام علیہ التحیۃ والسّلام۔

اس کے ساتھ ساتھ قرآنِ کریم سے یہ بھی واضح ہے کہ حضرتِ آدمؑ کے زمانے سے تا ایندم انبیاء و ائمہ علیہم السّلام کا اصل کام نفوسِ خلائق کو سکھانا اور اپنا جیسا بنانا ہے، جیسا کہ حضرتِ ابراہیمؑ کا قول قرآنِ کریم میں حکایتاً آیا ہے: "فَمَنْ تَبِعَنِیْ فَاِنَّهٗ مِنِّیْ" (۱۴:۳۶)، پس جو شخص میری پیروی کرتا ہے، یقیناً وہ مجھ سے ہے۔ اس لئے ہر چند تاویل کا علم اصل میں امامِ زمان علیہ السّلام کے پاس ہے، لیکن امامِ زمان کی مکمل شناخت اور اطاعت کے نتیجے میں امام کا نور مریدوں میں بھی طلوع ہوتا ہے اور ان کو بھی تاویل کرنے کی اجازت مل جاتی ہے اور وہ بھی جسمانی دنیا

میں ہونے کے باوجود عالمِ امر کو چشمِ باطن سے دیکھ سکتے ہیں، جیسا کہ سیدنا ناصر خسروؒ کے ان مشہور اشعار میں اس حقیقت کو بیان کیا گیا ہے :

بر جانِ من چو نورِ امامِ زمان بتافت
لیل السرار بودم و شمس الضحٰی شدم
نامِ بزرگ امامِ زمان است ازین قبل
من از زمین چو زہرہ بدو بر سما شدم[11]

"میری جان پر جب امامِ زمان کا نور طلوع ہوا تو ہر چند کہ میں قبلاً اماوس تھا، خورشیدِ رخشان ہو گیا۔
اسمِ اعظم امامِ زمان ہے، اسی لئے اس [مقدس] اسم کی برکت سے میں زہرہ کی طرح آسمان پر جا پہنچا۔"

چنانچہ سیدنا ناصر خسروؒ نے اسی نور کی روشنی میں اپنے زمانے کے امام کی اجازت سے تاویل پر وجہِ دین جیسی کتاب لکھی۔ سیدنا ناصر خسروؒ کی طرح دوسرے بہت سے بزرگانِ دین میں بھی یہ نور طلوع ہوتا رہا ہے اور ان کو بھی تاویل کرنے کی اجازت ملتی رہی ہے۔ چنانچہ دعوتِ حق کی تاریخ میں ایسی بہت سی مثالیں ملتی ہیں، مثلاً سیدنا جعفر بن منصور الیمنؒ کی تاویل الزّکوٰۃ، سیدنا قاضی نعمانؒ کی تاویل الدّعائم، سیدنا المؤیدؒ کی المجالس، سیدنا پیر صدر الدّینؒ، سیدنا پیر حسن کبیر الدّینؒ کے گنان، وغیرہ۔

ہمارے اپنے عظیم دَورِ قیامت میں اس نورانی روایت کی ایک نہایت درخشان مثال استادِ بزرگوار ہیں۔ آپ کو بھی یقیناً اپنے زمانے کے امامِ برحق کی طرف سے تاویل کرنے کی اجازت کی سعادت نصیب ہوئی تھی۔ آپ نے کمالِ

شکر گزاری کے ساتھ اپنی پُر بہا زندگی کو اس مقدس فرض کیلئے وقف کیا تھا۔ آپ نے نظم و نثر میں ایک سو سے اوپر نورانی تاویل پر کتابیں لکھی ہیں جو اس بابرکت اجازت کا ایک عملی ثبوت بھی ہے، اس لئے کہ ایسی کتابیں کسی مؤیَّد ہستی کے بغیر اور کوئی نہیں لکھ سکتا ہے۔ مولانا حاضر امام نے ان کو شرف قبولیّت سے نوازا ہے اور ارشاد فرمایا ہے کہ آپ میں جو علم و دانش ہے اس کی جماعت تک وسیع پیمانے پر رسائی ہو۔[۱۲]

فقیر حقیر
مرکزِ علم و حکمت، لندن
۵ راگست ۲۰۲۱ء

حواشی

۱۔ سیدنا ناصر خسروؒ، وجہِ دین، تصحیح غلام رضا اعوانی (تہران، ۱۹۷۷ء)، ص ۳۰۶؛ نیز دیکھئے :۔ سیدنا ہبۃ اللہ المؤید فی الدین شیرازیؒ، المجالس المؤیدیہ، تحقیق، حاتم حمید الدین (آکسفورڈ، ۱۴۰۷ھ/۱۹۸۶ء)، II، ۶۱۲؛ ایضاً، (۱۴۲۶ھ/۲۰۰۵ء)، III، ۸-۹

۲۔ علامہ نصیر الدین نصیرؔ ہونزائیؒ، لعل و گوہر (کراچی، ۱۹۹۲ء)، ص ۱۱۱

۳۔ ــــــــ، ہزار حکمت (کراچی، ۲۰۰۵ء)، صص ۱۱۴، ۳۹۶

۴۔ مولانا امام سلطان محمد شاہ الحسینیؑ، Mubarak Talika and Messages (ممباسہ، ۱۹۵۵ء)، ص ۳۲

۵۔ سیدنا ناصر خسروؒ، جامع الحکمتین، تصحیح ہنری کُربین و محمد معین (تہران، پیرس، ۱۹۵۳ء)، صص ۱۴-۱۵

۶۔ مولانا امام سلطان محمد شاہ الحسینیؑ، کلامِ امامِ مبین (گجراتی) (بمبئی، ۱۹۵۰ء)، حصۂ اوّل، ۱۲۵-۱۲۶

۷۔ ایضاً، (بمبئی، ۱۹۵۱ء)، حصۂ دوم، ۴۹۱

۸۔ المجالس المؤیدیہ، II، ۳۹۵

۹۔ ایضاً، ۲۱۸، ۵۵۷

۱۰۔ سیدنا قاضی نعمانؒ، دعائم الاسلام، تحقیق آصف بن علی اصغر فیضی (قاہرہ، ۱۹۶۳ء)، حصۂ اوّل، ۲۲-۲۳

۱۱۔ سیدنا ناصر خسرو، دیوان، تحقیق سید نصر اللہ تقوی (تہران، ۱۳۶۷ شمسی، ۱۹۸۸ء)، ص ۲۷۳

۱۲۔ عظیم علی لاکھانی، علامہ نصیر الدین نصیرؔ ہونزائی کے عظیم علمی کارنامے (کراچی، ۲۰۱۳ء)، ص ۴